پنجاب میں اُردو

مؤلفہ

حافظ محمود خان شیرانی مرحوم

مکتبہ معین الادب اُردو بازار لاہور

طبع سوم　　　　قیمت چھ روپے

(انشا پریس لاہور میں چھپی)

انتساب

آج کل پنجاب میں اردو زبان اور اس کے علم و ادب سے
جو غیر معمولی دلچسپی نظر آتی ہے۔ اس کی تعمیر میں

سب سے زیادہ

میرے دیرینہ مخدوم خان بہادر سر شیخ عبدالقادر بی اے
بیرسٹر ایٹ لاء ممبر لیجسلیٹو کونسل کی

خدمات زبان و ادب کا حصہ ہے اس لئے

میں اس ناچیز تالیف کے انتساب کے لئے جو از اول تا آخر
پنجاب اور اردو کے باہمی تعلقات کے تذکروں سے لبریز ہے۔ آپ
ہی کے نام نامی کو طغرائے عنوان بنانے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔!

محمود شیرانی

عرضِ حال

اس تالیف میں اردو زبان کی قدامت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خصوصاً اُن مسائل پر جن کی رو سے پنجاب، اس زبان کی ابتدا، اور اس کی نشوونما کا گہوارہ مانا جاسکتا ہے۔

اُردو زبان کے آغاز کا سرزمین پنجاب سے منسوب ہونا، کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ نہیں ہے اس سے پیشتر پنڈت کیفی (بعقیدۂ خود مذاق کے طور پر) اور شیر علی خاں صاحب سرخوش اپنے پُرلطف تذکرہ "اعجاز سخن" میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں مگر اس کتاب میں اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے۔ اس تالیف کا نام اسکے آخری باب "پنجاب میں اُردو" کی رعایت سے رکھا گیا ہے، جو تمام و کمال پنجاب کے اُردو گو شعرا کے ذکر و اذکار سے مملو ہے۔ یہاں مجھے اُس شکریہ کے اظہار سے بھی عہدہ برآ ہونا ہے، جو اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں بعض حضرات کی معاونت کی طرف سے مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ اس فہرست میں سب سے پہلا نام میرے مکالج ناش، دوست پروفیسر سراج الدین آذر ایم۔ اے کا ہے، جن کے نفیس کتب خانہ کا دروازہ ہمیشہ میرے لئے کھلا رہا اور جنکی نادر کتابوں سے اس سلسلہ میں میں نے بہت کچھ مفید مطلب سرمایہ اخذ کیا ہے۔ انکے بعد مجھے مولوی مجبوب عالم صاحب مالک و مدیر "پیسہ اخبار"، جناب شیر علی خاں صاحب سرخوش، جناب غلام دستگیر صاحب نامیؔ، میاں حفظ الرحمن صاحب منہاس اور عبد السبحان صاحب بی۔ اے کا ذکر کرنا ہے، جن کی قیمتی امداد کا شکریہ، میری دلی مسرت اور خوش وقتی کا باعث ہے۔

محمود شیرانی

فہرست مطالب

بیرونِ پنجاب کے جن فضلاء و ادبا کے علمی احسانات سے اہلِ پنجاب کی گردنیں ہمیشہ خم رہیں گی۔ ان میں علامہ حافظ محمود شیرانی مرحوم کا نام نہایت ممتاز ہے۔ "پنجاب میں اردو" حضرت علامہ کے آفتابِ تحقیق کی صرف ایک شعاع ہے۔ لیکن اس ایک شعاع سے زبانِ اردو کے ماخذوں کا گوشہ گوشہ منوّر ہو گیا۔ اور جو محققین و طلبہ ایک مدّت سے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مار رہے تھے۔ ان کو ایسی روشنی مل گئی۔ جو ہمیشہ ان کے لیے چراغِ راہ بنی رہے گی۔

"پنجاب میں اردو" پر دیباچہ لکھنا نہ تو میرا منصب ہے۔ اس لیے کہ علمی تحقیق کے میدان کا مرد نہیں ہوں۔ علاوہ بریں اس کی ضرورت بھی نہیں۔ اس لیے کہ اس پر خود مصنف کا لکھا ہوا مقدمہ موجود ہے۔ اس میں مطالبِ کتاب کا تعارف ایسے انداز میں کر دیا گیا ہے جس سے بہتر ممکن نہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ قارئین کتاب کو مصنف کے سوانحِ حیات اور ان کی شخصیت سے روشناس کر دیا جائے۔

قوم اور خاندان

حافظ محمود خاں شیرانی کے والد محمد اسمٰعیل خاں کا اصلی وطن ریاست جودھپور مارواڑ تھا۔ جہاں "شیرانیوں کی ڈھانی" کے نام سے ایک بستی آباد ہے۔ محمد اسمٰعیل خاں حضرت سید احمد شہید کے اہلِ قافلہ سے

تعلق رکھتے تھے ۔ اور ٹونک میں جاگیر کے مالک ہونے کے علاوہ کاروبار تجارت بھی کرتے تھے ۔ شیرانی سرحدی پٹھانوں کا ایک قبیلہ ہے ۔ جو ڈیرہ اسماعیل خاں کے ضلع کے متصل جنوبی وزیرستان کے جنوب میں آباد ہے ۔ اس قبیلے کے بعض خاندان راجپوتانہ میں آباد ہو گئے تھے ۔ انہی میں حافظ محمود خاں شیرانی کے اجداد بھی تھے ۔

ولادت اور تعلیم

حافظ صاحب مرحوم اکتوبر ۱۸۸۰ء میں بمقام ٹونک پیدا ہوئے ۔ چونکہ اس زمانے میں انگریزی تعلیم کا رواج نہ تھا ۔ خصوصاً قدامت پسند خاندان تو اس کے قطعاً روادار نہ تھے ۔ اس لیے شیرانی صاحب نے پہلے قرآن حفظ کیا ۔ اس کے بعد اپنے والد محترم سے فارسی پڑھتے رہے ۔ غالباً ۱۸۹۵ء میں تکمیل تعلیم کے لیے لاہور بھیجے گئے ۔ سنٹرل ماڈل سکول میں داخل ہوئے ۔ لیکن انگریزی اور ریاضی وغیرہ کے مضامین سے ان کی طبیعت کو لگاؤ پیدا نہ ہو سکا ۔ چنانچہ سکول چھوڑ کر اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہو گئے اور مولوی عبدالحکیم کلانوری سے فارسی کی تکمیل کی ۔ ۱۸۹۹ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کر کے اپنے وطن ٹونک واپس چلے گئے ۔

حافظ صاحب انگلستان میں

۱۹۰۴ء میں جب قدامت پرستی کی قوتیں بڑی حد تک مغلوب ہو چکیں تھیں ۔ حافظ صاحب کے والد محترم نے اپنے ہونہار بیٹے کو بیرسٹری کی تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا ۔ حسن اتفاق سے اس زمانے میں سر عبدالقادر اور ڈاکٹر اقبال بھی وہیں

موجود تھے۔ چنانچہ ان حضرات سے حافظ صاحب کی خوب صحبتیں رہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ المامون سہروردی بھی اس زمانے میں انگلستان ہی میں مقیم تھے۔

حافظ صاحب نے انگلستان پہنچتے ہی سب سے پہلے انگریزی پڑھنی شروع کی۔ کیونکہ اس سے قبل وہ اس زبان سے قریب قریب بے بہرہ سے تھے۔ ابھی دو تین ابتدائی امتحان ہی پاس کیے تھے۔ کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور حالات کچھ ایسے ہو گئے۔ کہ بھائیوں نے خرچ بھیجنا بند کر دیا۔ اب تعلیم تو جاری نہ رہ سکتی تھی۔ لیکن حافظ صاحب مزید عرصے تک انگلستان میں رہنے کے بے حد خواہش مند تھے۔ بعض احباب کی سعی سفارش سے سر ٹامس ارنلڈ نے انکی دستگیری کی۔ اور کسی فنڈ سے وظیفہ دلوا کر تحقیق علمی کے کام میں اپنا مددگار مقرر کر لیا۔ یہاں سے حافظ صاحب کو مشرقی علوم والسنہ کی تحقیقات کا ایسا چسکا لگا جو مدۃ العمر شریک حال رہا۔ وظیفے کی رقم قلیل تھی جس میں گزراوقات مشکل تھی۔ چنانچہ لندن کی مشہور تاجر فرم لیوزک کمپنی نے حافظ صاحب کو مشرقی مخطوطات اور دوسری قدیم اشیا کی خرید پر مامور کر دیا۔ اس خرید پر کمیشن بھی ملتا تھا۔ جس سے حافظ صاحب کی مالی پریشانیاں بڑی حد تک رفع ہو گئیں۔

ہندوستان میں واپسی

لیکن ۱۹۱۲ء میں وہ دفعتہً ہندوستان واپس آ گئے۔ واپسی کا مقصد یہ تھا۔ کہ آٹھ

نو سال کے بعد اپنے اعزہ سے بھی مل لیں۔ اور بھائیوں کے ساتھ تقسیم جائیداد کی بات چیت بھی کریں۔ خیال یہ تھا کہ چند ماہ میں ان امور سے فراغت حاصل کرنے کے بعد واپس انگلستان چلے جائیں گے۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی جو چار سال تک جاری رہی اور حافظ صاحب انگلستان نہ جا سکے پھر خاندانی پیچیدگیوں میں کچھ اور عرصہ گزر گیا۔

اسلامیہ کالج لاہور میں ملازمت

آٹھ سال کی خانہ نشینی کے بعد ۱۹۲۱ء میں حافظ صاحب تلاش معاش میں لاہور پہنچے۔ یہاں ڈاکٹر اقبال اور سر عبدالقادر جیسے ذی اثر دوست موجود تھے جن کی کوشش سے حافظ صاحب اسلامیہ کالج میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر اردو اور فارسی کے لکچرر مقرر ہو گئے۔ اگرچہ مشاہرہ بہت کم تھا۔ لیکن درویش طبع محمود خاں نے اس کو قبول کر لیا، اور سات سال اسلامیہ کالج میں گزار دیئے۔ اسی زمانے میں اُن کے متعدد محققانہ مقالے رسالے "اردو" (حیدرآباد دکن) میں شائع ہوئے جن سے علمی حلقوں میں حافظ صاحب کی تحقیق علمی کی دھوم مچ گئی۔ ۱۹۲۸ء ہی میں آپکی یہ کتاب "پنجاب میں اردو" شائع ہوئی۔ چنانچہ اسی کتاب کی وجہ سے پنجاب یونیورسٹی کے ارباب اختیار کی نظر انتخاب حافظ صاحب پر پڑی اور وہ اورنٹیل کالج لاہور میں اردو کے لکچرر مقرر کئے گئے ؛

اورینٹل کالج سے سبکدوشی جب حافظ صاحب کو اورینٹل کالج لاہور میں آٹھ سال گزر گئے۔ تو وہ سال عمر ہو جانے کی وجہ سے ان کی سبکدوشی کا سوال پیدا ہوا۔ لیکن یونیورسٹی نے اُن کی کارکردگی کے باعث ملازمت میں دو سال کی توسیع منظور کر لی۔ اس کے بعد ۱۹۳۸ء میں مزید دو سال کے لئے اسی اسامی پر لیکن کسی قدر کم مشاہرہ پر حافظ صاحب کا تقرر کر دیا گیا۔ آخر ۱۵ نومبر ۱۹۴۰ء کو وہ ساڑھے آٹھ ماہ کی فرلو پر روانہ ہوئے جس کے بعد ان کی ملازمت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

مولوی عبدالحق صاحب نے حافظ صاحب کو تصنیف و تالیف کی غرض سے انجمن ترقی اردو (دہلی) میں بلا لیا تھا۔ لیکن چند ہی مہینے وہاں کام کر پائے تھے۔ کہ خرابی صحت کی وجہ سے اس تعلق کو ترک کر کے وطن جانے پر مجبور ہو گئے۔

وقتِ آخر حافظ صاحب ۱۹۳۹ء سے ضیق النفس میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ہر قسم کے علاج کے باوجود اس مرض میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ خصوصاً آخری چار برس بہت تکلیف میں بسر ہوئے۔ بالآخر وقت آخر آن پہنچا۔ اور ۱۵ فروری ۱۹۴۶ء کو یہ یگانہ روزگار فاضل پینسٹھ برس اور چار مہینے کی عمر پا کر عازم عالم جاودانی ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اختر شیرانی حافظ محمود شیرانی مرحوم و مغفور کے اکلوتے فرزند محمد داؤد خاں اختر شیرانی تھے۔ جو اُردو زبان کے نہایت نغز گو شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ افسوس کہ وہ بھی اپنے والد مرحوم کی وفات سے کوئی ڈھائی سال بعد بمقام لاہور انتقال کر گئے۔ بے نام اللہ کلہ

مخطوطات و نوادر کی جمع آوری حافظ محمود شیرانی نے ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر ملازمت شروع کی اور سبکدوشی کے وقت چار سو روپے پا رہے تھے۔ لیکن آمدنی کی اس قلت کے باوجود انہوں نے اپنے بست سالہ زمانۂ ملازمت میں کم و بیش بیس ہزار روپے کی قلمی اور پرانی کتابیں جمع کیں۔ اور تقریباً اسی مالیت کے پرانے سکے فراہم کئے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ ان نوادر کی جمع آوری کیلئے انہوں نے ہزاروں روپے سفر پر بھی خرچ کئے ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ انھوں نے ہمیشہ نہایت سادہ زندگی بسر کی۔ ایک معمولی سے مکان میں رہتے تھے۔ جس کے زیادہ تر کمرے کتابوں اور سکوں کی الماریوں سے پٹے پڑے تھے اور ایک گوشے میں فرش پر حافظ صاحب مطالعہ و تصنیف میں مصروف رہتے تھے۔ گرمی ہو۔ جاڑا ہو۔ برسات ہو۔ شور و غوغا ہو۔ کوئی چیز ان کی علمی مصروفیتوں میں حائل نہ ہوتی تھی۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے پر انہوں نے پانچ ہزار کتابوں کا نایاب ذخیرہ معمولی رقم کے معاوضے میں پنجاب یونیورسٹی کے سپرد کر دیا

حالانکہ اگر وہ چاہتے۔ تو ان نایاب نوادر کو فروخت کر کے لاکھوں روپے فراہم کر سکتے تھے۔

حُسنِ اخلاق جن لوگوں کو حافظ شیرانی کی دوستی کا شرف حاصل رہا ہے۔ یا جنہیں اُن کی فضیلتِ علمی کے آگے زانوئے تلمذتہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یا جو لوگ اُن سے وقتاً فوقتاً نیاز حاصل کرتے رہے ہیں۔ وہ سب اس امر پر متفق ہیں۔ کہ حافظ صاحب علم و تحقیق کی جلالتِ قدر کے باوجود انتہا درجے کے منکسر مزاج۔ متواضع، نیک دل اور مخلص انسان تھے۔ دوستوں پہ تو جان چھڑکتے تھے۔ اور شاگردوں کے حق میں آیۂ رحمت سے کم نہ تھے۔ عام ملنے والوں سے بھی ان کا سلوک ایسا تھا۔ کہ ہر ملنے والا ان کے حُسنِ اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

علمی کارنامے اس مضمون میں یہ گنجائش کہاں کہ حافظ صاحبِ مرحوم کے تمام علمی کارناموں پر تبصرہ کیا جا سکے۔ وہ صرف مدّرس نہ تھے۔ بلکہ شاعر۔ ادیب۔ محقق۔ نقاد۔ مُورّخ۔ ماہرِ آثارِ عتیقہ۔ عروضی اور خدا جانے کیا کچھ تھے۔ علامہ شبلی کی شعر العجم فارسی شاعری پر تنقید کا ایک لازوال کارنامہ ہے۔ اور خود حافظ صاحب کو اسکا اعتراف تھا۔ لیکن مورخانہ اعتبار سے وہ اس کتاب کے اکثر بیانات کو پایۂ تحقیق سے ساقط جانتے تھے۔ چنانچہ انتہائی جرأت سے جو ہمیشہ علمِ صحیح ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے شعر العجم پر فاضلانہ تنقید کی۔ جس کا کوئی جواب کسی سے بن نہ آیا۔ انہوں نے

سلطان محمود غزنوی اور شاہنامے کے متعلق مشہور حکایت کا بُت اس طرح سے توڑا۔ کہ اس کے پرخچے اُڑ گئے۔ اور سلطان محمود کا دامن ناقدردانی کے دھبے سے پاک صاف ہو گیا۔ حافظ صاحب کے زورِ استدلال اور تحقیق و تنقیع نے فردوسی کی طرف منسوب ہجو کو بالکل مصنوعی والحاقی ثابت کیا۔ انہوں نے پرتھی راج راسا کے متعلق تحقیق پیش کی۔ کہ چندر بروائی سے اسکا کوئی تعلق نہیں۔ اور اس دعوے کے ثبوت میں ایسی داخلی شہادتیں پیش کیں۔ کہ ہندی کے کسی نقاد کو بھی اسکی تردید کی جرأت نہ ہوئی۔ آبِ حیات کی تنقید اگرچہ نامکمل رہی۔ لیکن اس میں بھی حافظ صاحب نے مولانا آزاد کے متعدد بیانات کو پایۂ استناد سے ساقط ثابت کر دیا۔ خالق باری کو لوگ امیر خسرو کی تصنیف بتاتے تھے۔ لیکن حافظ صاحب نے ثابت کر دیا۔ کہ اس کتاب میں اکثر شواہد ایسے ہیں۔ کہ یہ کتاب لسانی اور زبانی اعتبار سے امیر خسرو سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ یہ کسی اور شخص خسرو شاہ کی لکھی ہوئی ہے۔ جو امیر خسرو سے بہت بعد ہوا ہے۔

اس کے علاوہ حافظ صاحب نے بیسیوں تحقیقی مقالات اردو زبان اور اس کے متعلقہ مسائل کے متعلق لکھے۔

پنجاب میں اردو "پنجاب میں اردو" حافظ محمود شیرانی کا ایک لازوال ادبی کارنامہ ہے۔ اس میں آپ نے متعدد داخلی و خارجی شواہد سے ثابت کیا ہے۔ کہ اردو صرف شاہ جہان کے زمانے

سے شروع نہیں ہوئی۔ جیسا کہ عام نقاد لکھتے چلے آئے ہیں۔ اور نہ اس کا اساسی تعلق برج بھاشا سے ہے۔ بلکہ اس زبان کا وجود اس زمانے سے ہے۔ جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہوئے۔" اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے۔ بلکہ وہ مسلمانوں کیساتھ دہلی میں جاتی ہے۔ جس زبان سے اردو ترقی پاتی ہے۔ وہ نہ برج ہے۔ نہ ہریانی نہ قنوجی بلکہ وہ زبان ہے۔ جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اردو زبان اپنی صرف و نحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے۔ پنجابی اور اردو میں ساٹھ فی صدی الفاظ کا اشتراک ہے"۔

حافظ صاحب کے نزدیک اردو اسی وقت بننی شروع ہو گئی تھی۔ جب محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور شمال مغربی سرحد سے مختلف قومیں ہندوستان میں داخل ہونے لگیں انھوں نے اس ملک کی اس زبان میں جو پنجاب میں بولی جاتی تھی۔ اپنی زبانوں کے الفاظ داخل کئے۔ اور وہ چونکہ ملتانی اور لہندا تھی۔ اس لئے اردو زبان بنیادی اعتبار سے پنجابی ہی ہے۔ جس کو دہلی پہنچکر سرکار دربار کے تعلق کی وجہ سے موجودہ شکل نصیب ہوئی حافظ صاحب نے اپنے دعوے کے ثبوت میں جو شہادتیں فراہم کی ہیں۔ انسے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا وجود بہت قدیم ہے۔ پھر پنجابی اور اردو کے سینکڑوں مشترک الفاظ اور اسماء افعال کا ذکر کیا ہے۔ قدیم اردو پر پنجاب کا اثر واضح کرنے کیلئے اردو کے بیشمار پرانے نثاروں اور شاعروں کے تذکرے قلمبند کئے ہیں۔ آخر میں گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری کے متعدد پنجابی شعرا کا ذکر فرمایا ہے۔ جن میں سے اکثر نہایت صاف ستھری اردو میں شعر کہتے تھے۔ اور پنجاب کے

بعض شہروں میں اردو کا ویسا ہی چرچا ثابت کیا ہے۔ جیسا بعد میں دہلی اور لکھنؤ میں ہوا۔ یہاں تک کہ ایک دو نثر نگاروں کی اردو عبارت کے نمونے بھی مہیا کر دیئے ہیں۔ حالانکہ اس وقت اردو میں نثر بہت ہی کمیاب تھی۔

یہ چند سطور میں نے محض برسبیل تذکرہ قلمبند کر دی ہیں۔ ورنہ قارئین کتاب کو کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہو گا، کہ اسمیں فاضل مصنف نے نہ صرف مباحث کی سیر حاصل تفصیل دے دی ہے بلکہ خود اپنے قلم سے ایک مقدمہ بھی تحریر کر دیا ہے، جسکے بعد کسی اور دیباچے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ میرے نزدیک اہل پنجاب پر اور اردو زبان پر حافظ محمود شیرانی کا یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ ہم اس کے شکریہ سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے جب تک اردو زبان باقی ہے۔ اہل پنجاب اس امر پر ناز کرتے رہیں گے کہ یہ ہماری زبان ہے۔ اور اس کا سرچشمہ ہماری ہی سرزمین سے پھوٹا ہے ظاہر ہے۔ کہ ہمیں اس فخر و ناز کا موقع حافظ صاحب ہی کی علمی تحقیق سے حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی روح پر اپنی ہزاروں ہزار رحمتیں نازل کرے۔

لاہور

۱۹ ستمبر ۱۹۴۹ء

عبدالمجید سالک

پنجاب میں اُردو

مقدمہ

جب پرنسپل عبداللہ یوسف علی نے مجھ سے اردو کے آغاز و قدامت کے موضوع پر لکھنے کے لیے ارشاد کیا تو میں نے ان سے عرض کی تھی کہ "مضمون اگرچہ دلچسپ ہے لیکن اس پر ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں قلم اٹھانا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ اور صحیح اطلاعات کی بہم رسانی کے لیے شاید ابھی ایک عرصہ درکار ہوگا ــــــ!"

اُردو کی قدامت

ہم اُردو کے آغاز کو شاہجہان یا اکبر کے دربار اور لشکرگاہ کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں۔ لیکن یہ زبان اس زمانہ سے بہت زیادہ قدیم ہے۔ بلکہ میرے خیال میں اس کا وجود انہی ایام سے ماننا ہوگا، جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں۔ اردو کی قدامت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا۔ کہ گجرات و دکن میں اس زبان میں دسویں صدی ہجری کی ابتدا یعنی

بابر کی آمد کے قبل سے ادبیات کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ اور فارسی لغات کی شہادت سے جو نویں صدی ہجری میں ہندوستان میں لکھی جاتی ہیں، صاف واضح ہوتا ہے کہ اُردو زبان ان ایام میں، تمام اسلامی ہندوستان میں سمجھی جاتی تھی۔ یہ لغات نگار اس کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور ہندی سے ان کا مقصد یہی زبان ہے، جسے ہم اُردو کہتے ہیں ——!

بھاشا کا تعلق اُردو سے

ہم اُردو کو برج بھاشا کی بیٹی سمجھتے رہے ہیں۔! لیکن جب ان دونوں زبانوں کی صرف و نحو، اور دوسرے خط و خال اور خصائص پر غور کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے راستے مختلف ہیں۔ اُردو، جہاں اپنے اسماء و افعال کو **الف** پر ختم کرتی ہے برج واو پر ختم کرتی ہے۔ برج میں جمع کا طریقہ بہت سادہ اور سہل ہے، لیکن اُردو میں بہت پیچیدہ ہے۔ اُردو میں مرکب افعال کا مع توابعات کے بہت رواج ہے۔ بھاشا میں یہ بات موجود نہیں ہے۔ اس لئے اُردو کو بھاشا سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں ہے۔ بلکہ بہنوں بہنوں کا ——!

اُردو کا ارتقا کس زبان سے ہوا؟

کہا جاتا ہے۔ کہ مغربی ہندی، جس کی برج بھاشا، ہریانی، راجستھانی، پنجابی اور اردو شاخیں ہیں، قدیم پراکرت سورسینی کی یادگار ہے!

لیکن جس زبان سے اُردو ارتقا پاتی ہے۔ وہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی

ہے بلکہ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی ہمیں تحقیق معلوم نہیں کہ جب مسلمان دہلی میں آباد ہوئے اس وقت اس علاقہ میں کیا زبان بولی جاتی تھی؟ آج دیکھا جاتا ہے۔ کہ دہلی کے قریب ہی تین زبانوں یعنی ہریانوی، برج اور راجستھانی کا سنگم ہوتا ہے اور گریرسن نے تو صاف دہلی کو ہریانوی زبان کے علاقہ میں شامل کر دیا ہے مگر راقم کی رائے میں ہریانوی کوئی علیحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے بلکہ وہ پرانی اردو ہے یعنی وہی اردو ہے جو گیارھویں صدی ہجری میں خود دہلی میں بھی بولی جاتی تھی۔ اس میں اور اردو میں بہت کم فرق ہے۔ اگر ہم اس کو اردو نہ مانیں تو اردو کی شاخ ماننے میں تو ہمیں عذر نہیں ہونا چاہیئے۔ بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنتی ہے۔

مسلمانوں کی آمد کے وقت دہلی کی زبان

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ دہلی میں مسلمانوں کی آمد کے وقت کونسی زبان بولی جاتی تھی؟ یا وہ راجستھانی ہوگی۔ یا برج! اس میں شک نہیں کہ آج دہلی میرٹھ مظفر نگر، سہارنپور، یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ دوآبہ میں اردو بولی جاتی ہے۔ لیکن اب سے تین صدی پیشتر اس علاقہ کی یہ زبان نہ تھی ...... بلکہ یہاں برج کا طوطی بول رہا تھا! مغلوں کی آمد کے وقت گنگوہ ضلع سہارنپور میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی (متوفی ۹۴۵ھ) باوجودیکہ ایسے علاقہ سے تعلق رکھتے تھے جہاں آج اردو مادری زبان ہے لیکن وہ اپنے ہندی اشعار ایسی زبان میں لکھتے ہیں جو برج کے مماثل ہے۔ علی ہذا مخدوم

بہاء الدین برناوی: برناوہ ضلع میرٹھ کے ہیں۔ لیکن ان کے ہندی اشعار قطعاً برج میں
ہیں! اس سے ظاہر ہے کہ دوآبہ میں برج زبان ہی مستعمل تھی۔ اردو نے ان علاقوں سے
رفتہ رفتہ برج کو خارج کر دیا ہے جس طرح ہریانہ کے علاقہ سے ——!

یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ امیر خسرو دہلی کی زبان کو "دہلوی" لکھتے ہیں۔
ابو الفضل بھی آئین اکبری میں اس کو "دہلوی" کے نام سے یاد کرتا ہے! باپ شیخ باجن
(متوفی ۹۱۲ھ) بھی اس کو "دہلوی" کہتے ہیں۔ اور جو نمونہ اس زبان کا دیتے ہیں وہ قطعاً
اردو ہے ——!

اردو دہلی میں کس طرح پہنچی ہے؟ کیا پنجاب سے؟

اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے۔ اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت
کر کے جاتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر
گئے ہوں:

اس نظریہ کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت یا سند نہیں، لیکن
سیاسی واقعات، اردو زبان کی ساخت نیز دوسرے حالات ہمیں اس عقیدہ کے تسلیم
کرنے پر مجبور کرتے ہیں ——!

شہادت لسانی اور اردو و ملتانی پنجابی کی مماثلت!

اس کے متعلق شہادت لسانی ہی ہے ——! ہم دیکھتے
ہیں کہ اردو اپنی صرف و نحو میں پنجابی و ملتانی زبان کے بہت
قریب ہے۔ دونوں میں اسماء و افعال کے خاتمہ میں الف آتا ہے اور دونوں میں جمع

کا طریقہ مشترک ہے۔ یہاں تک کہ دونوں میں جمع کے جملوں میں نہ صرف جملوں کے اہم اجزا بلکہ ان کے توابعات و ملحقات پر بھی ایک ہی قاعدہ جاری ہے۔ دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد، افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں۔ پنجابی و اردو میں ساٹھ فیصدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں۔

پنجابی اور اردو کا اشتراک

آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی کتب تاریخ و لغات کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ہندوستان لاکھ کو "لکھ"، پاگ کو "پگ"، کھانڈ کو "کھنڈ"، بھانڈ کو "بھنڈ"، مات کو "مٹھ"، انب کو "اب"، مونگ کو "منگ"، گاڑی کو "گڈی"، گرہ یا گو "گڈی"، تالاب کو "تل"، بڑی جھیل کو "دھنڈ"، اور چقندر کو "گنگلو" یا "گانگلو" کہتے تھے۔ اہل پنجاب انہی الفاظ کو آج بھی "لکھ"، پگ، کھنڈ، بھنڈ، مٹھ، نب، منگ، گڈی، گڈی۔ دھنڈ اور گونگلو بولتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کا وہ عنصر جو قدیم سے ان میں مشترک تھا، رفتہ رفتہ اردو زبان سے خارج ہوتا رہا ہے۔

ایسے افعال و الفاظ مثلاً اکھنا۔ بوڑھنا۔ اپڑنا۔ پچھاڑ۔ سٹنا۔ لانا (لگانا) بکھرنا۔ مرڑنا (چلنا) پانا (ڈالنا) لڑنا (ڈسنا)۔ بندھنا (باندھنا) منگنا (مانگنا) نسنا (بھاگنا)۔ کھیر (دودھ)۔ نال۔ اول یائے مخلوط التلفظ "دیں" قسم کا امر "سی" قسم کا مستقبل وغیرہ جو آج صرف پنجابی میں رائج ہیں دکنی اور قدیم اردو میں عام طور پر مستعمل تھے۔

اسی طرح اردو کے محاورات "دن دہاڑے" - "ہلنا جلنا" - "چپ چپاتا" - "مانگنا تانگنا" بال وال وغیرہ میں اردو خواں ان کے جزو ثانی کو تابع مہمل کہنے کے عادی ہیں مگر پنجابی زبان میں یہ الفاظ بامعنے ہیں اور آج بھی استعمال میں آ رہے ہیں -

ادھر اردو کی اضافت کا - کے - کی - اگرچہ فی زمانہ اردو کے ساتھ مخصوص ہے پنجاب کے دیہات و قصبات نیز بعض دیگر اسما کے ساتھ اب بھی موجود ہے - الغرض یہ امور اردو اور پنجابی زبانوں کے اشتراکِ قدیم کے بیّن دلائل ہیں -

پنجاب پر بیرونی و سیاسی اثرات

علاوہ بریں پنجاب ہندوستان کی خوش قسمتی یا بد قسمتی کی کنجی بنا رہا ہے اور شمالی اطراف سے ہندوستان پر ہر عہد، اور ہر زمانے میں حملے ہوتے رہے ہیں چنانچہ مسلمان بھی شمال ہی کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے - انکی ابتدائی بستیاں، سندھ اور ملتان میں قائم ہوتی ہیں - تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں صفاریوں اور سامانیوں کی بنا پر مغربی پنجاب اور سندھ میں ایرانی اثر فروغ پانے لگتا ہے -

ملتان اور اس کے اطراف میں فارسی کا دور!

حتیٰ کہ چوتھی صدی ہجری کے عرب سیاح لکھتے ہیں کہ ملتان و منصورہ میں فارسی بولی جاتی ہے - یہ سیاح یہاں کے بعض شہروں اور دریاؤں کے نام فارسی طرز میں لکھتے ہیں - جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایرانی تمدن کے اثرات ان اطراف میں بہت وسعت اختیار کر چکے تھے چوتھی

پنجاب پر ایرانی تمدن کا اقتدار

صدی کے اواخر سے محمودی حملوں کا آغاز ہوتا ہے اور تمام پنجاب آل ناصر کے

زیر اقتدار آجاتا ہے۔ آل غزنہ کی حکومت تقریباً ایک سو ستر سال تک رہتی ہے۔

غزنوی دور میں مسلمانوں کی نئی زبان!

اگر آل غزنہ سے پیشتر مسلمانوں کو کسی ہندی زبان کے اختیار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تو اس عہد میں جو خاصا دراز ہے وہ پنجاب میں کوئی نہ کوئی زبان سرکاری، تجارتی و معاشرتی اغراض سے اختیار کر لیتے ہیں جس کو غوریوں کے عہد میں۔ جب دارالسلطنت لاہور سے دہلی جاتا ہے اسلامی فوجیں اور دوسرے پیشہ ور اپنے ساتھ دہلی لے جاتے ہیں!

پنجاب کی نئی زبان کا مرکز ثقل دہلی میں منتقل ہوتا ہے

دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اردو کی شکل میں تبدیل ہوتی جاتی ہے!

پنجاب کا اردو کے ساتھ تعلق اسی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ بعد کے زمانہ میں بھی سیاسی اسباب اس تعلق میں تجدید پیدا کرتے رہتے ہیں۔ تغلق آٹھویں صدی میں، سید اور لودھی نویں صدی ہجری میں ایسے خاندان ہیں جو خاص پنجاب سے نکل کر دہلی آتے ہیں۔ ان کے لشکر پنجاب اور پنجابیوں سے تعلق رکھتے تھے اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر ان نو واردوں نے دہلی کی زبان پر اور اثر ڈالا ہو۔

ساتویں صدی ہجری میں اس زبان کی حالت

ساتویں صدی ہجری میں اس میں وہ خصوصیات نظر آتی ہیں جو ایک طرف اس کو پنجابی سے اور دوسری طرف برج سے ممیز کرتی ہیں! شیخ فرید الدین گنجشکرؒ متوفی ۶۶۴ھ اور بادر مو ملتاں کے

درمیان اردو میں جو گفتگو ہوئی اس کے دو فقرے ہم تک پہنچے ہیں مادرِ مومناں نے کہا تھا "خوجا برہان الدین بالا ہے"۔ شیخ نے جواب میں فرمایا پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے"۔ آخری فقرہ میں "کا" اور "ہوتا ہے" ایسے الفاظ ہیں جو اس جملہ کو پنجابی اور برج سے مختلف کر دیتے ہیں۔

آٹھویں صدی ہجری کا ایک اور فقرہ جو فیروز شاہ خلجی ۷۵۵ھ و ۷۶۰ھ کے حملۂ سندھ سے تعلق رکھتا ہے "تاریخ فیروز شاہی" میں شمس سراج عفیف یوں نقل کرتے ہیں "برکت شیخ تھیا اک موا اک تھیا"

دہلی سے اردو ہندوستان کے مختلف حصوں میں پہنچتی ہے

اسلامی سلطنت چونکہ دہلی پہنچکر بہت جلد مرکزی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ اس لئے یہ زبان اسلامی لشکروں، مہاجروں اور نوآبادکاروں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ہر گوشے میں پہنچ جاتی ہے۔ خلجی اس کو گجرات اور دکن پہنچاتے ہیں؛ محمد تغلق جب آٹھویں صدی ہجری میں دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو آباد کرتا ہے تو یہ زبان دکن میں مسلمان نوآبادکاروں کی زبان بن جاتی ہے۔ گجرات و دکن میں دسویں صدی ہجری سے اس میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ گویا دکن و گجرات میں اردو کے علحدہ علحدہ مرکز قائم ہو جاتے ہیں۔ اہل گجرات اس کو نویں صدی ہجری میں "زبان دہلوی" کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن آنے والی صدی میں "گجری" یا "گوجری" کہنے لگتے ہیں؛ اسی طرح دکن میں پہلے پہل یہ زبان "زبانِ ہندوستان" کہلائی، بعد کو "دکنی" کہنے لگے۔ اہل دہلی

بارھویں صدی کے آخر سے اس کو "ریختہ" کہنے لگے جو دراصل موسیقی کی اصطلاح تھی۔ بعد میں کلام مخلوط بہ دو زبان کے معنی دینے لگی اور پھر نظم ہندی پر اسکا اطلاق ہونے لگا۔

اردو کی ہر دلعزیزی | شاہان گجرات اردو میں بات چیت کیا کرتے تھے ۔ چنانچہ محمود شاہ بیگڑہ کا یہ فقرہ تاریخ میں محفوظ ہے "نچی بیری سب کوئی جھوڑے" بابر اس کی ہر دلعزیزی دیکھ کر اس میں ایک مصرعہ لکھتا ہے "مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی" اگر مغلوں کا حملہ ہندوستان میں سد راہ نہ بنتا تو اس میں شک نہیں ۔ کہ اردو بہت جلد فارسی کو ہٹا کر ہندوستان کی درباری زبان بن جاتی ——— !

فیروز شاہ تغلق کے بعد ایک دم سے فارسی پر زوال آتا ہے "اور تغلق، سید اور پٹھان اردو ہی اختیار کر لیتے ہیں، محمد شاہ تغلق، لفظ "کھڑا کھڑی" کے تلفظ کو، اصلی دہلوی اور غیر دہلوی باشندوں کی شناخت کے لئے معیار مقرر کرتا ہے ۔ سورتیوں کو فارسی سے سخت

---

[1] سلطان فیروز شاہ (تغلق) ۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ نے اپنے عہد میں ایک لاکھ سے زیادہ غلام جمع کئے تھے جو زیادہ تر مشرقی ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے ۔ فیروز شاہ کے جانشینوں کے عہد میں یہ لوگ اس قدر طاقتور ہو گئے تھے ۔ کہ سیاسی معاملات میں دخیل ہو کر ملک میں فتنہ و فساد برپا کرنے لگے ۔ ناصر الدین محمد شاہ ۷۹۲ھ تا ۷۹۵ھ نے تنگ آکر دہلی سے انکا اخراج عام کر دیا ۔ اور حکم دیدیا کہ تین دن کے اندر اندر شہر خالی کر دیں ۔ اگر اس کے بعد نظر آئیں تو قتل کر دئے جائیں ۔ اس سخت حکم کے باوجود اس جماعت کے متعدد ارکان دہلی ہی میں مقیم رہے اور جب گرفتار ہوئے تو اپنے آپکو دہلی کا اصلی باشندہ بیان کیا ۔ محمد شاہ نے اصلی دہلوی اور پوربی ۔ بنگالی کی شناخت کیلئے انسے لفظ "کھڑا کھڑی" کہلوایا چونکہ مشرقی ہند کے لوگ ہائے مخلوط التلفظ کے ادا کرنے میں عام ہندوستانیوں سے مختلف ہیں اسلئے یہ غلام دہلویوں سے آسانی کے ساتھ پہچان لئے گئے اور تلوار کے گھاٹ اتار دئے گئے ۔

دشمنی تھی؛ اکبر کے عہد میں برہمنوں کے طفیل اردو میں سنسکرت کے الفاظ روشناس کئے گئے لیکن بعد کو یہ طریقہ متروک ہو گیا عالمگیر کے عہد سے دیکھا جاتا ہے کہ طبایع کا عام رجحان اردو کی طرف ہوتا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے اسباب سے ہم ناواقف ہیں ——!

شمالی ہندوستان میں اردو کا مرکز | شمالی ہندوستان میں دکن سے ایک صدی بعد، تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے مگر ابتدائی منازل میں اس کی رفتار بہت سست ہے ادہلی میں محمد شاہی دور میں اردو کا مرکز قائم ہونے سے پیشتر، یہ زبان دہلی کے مضافات اور اضلاع میں ادبی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ شمالی ہند کے مصنفین میں سب سے پیشتر محمد افضل پانی پتی (یا جھنجھانوی) ہیں جو ۱۰۳۵ھ میں بعہد جہانگیر وفات پاتے ہیں ان کا "بارہ ماسہ" بہت مشہور ہے۔ یہ تصنیف جس میں فارسی اثرات بہت نمایاں ہیں برج کے اثرات سے بھی خالی نہیں ہے ——!

ہریانوی زبان کا مرکز | ادھر ہریانی زبان کے علاقہ میں اردو گیارھویں صدی ہجری میں (بعہد عالمگیر) اپنا قدم جما لیتی ہے۔ جھجر کے محبوب عالم عرف شیخ جیون متعدد تصنیفات اس زبان میں یادگار چھوڑتے ہیں۔ جن میں "دردنامۂ محمد" سب سے اہم ہے۔ ان کی دوسری تصنیفات "محشر نامہ"، "خواب نامۂ پیغمبر"، "دہیر نامۂ بی بی فاطمہ خاتون" کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔ اسی عہد میں عبدالواسع ہانسوی جو فارسی کی مشہور قواعد "دستور العمل فارسی" کے مصنف ہیں، بچوں کے لئے "نصاب سہ زبان" لکھتے ہیں جس میں ذریعۂ تعلیم یہی زبان ہے —— !

عہد عالمگیری کی ایک یادگار تحریک

عالمگیر کے عہد کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد سے کچھ عرصہ پیشتر ایک نئی تحریک وجود میں آتی ہے، جس کے ماتحت بچوں کی تعلیم کا ذریعہ ہندی زبانیں بن جاتی ہیں! عالمگیر کے عہد میں یہ تحریک عام ہو جاتی ہے اور بیشمار کتابیں بچوں کی تعلیم کے لئے لکھی جاتی ہیں جن میں اکثر و بیشتر منظوم ہوتی ہیں۔ یہ سلسلہ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں جاری ہو جاتا ہے۔ مثلاً دہلی، دکن، اور پنجاب۔

ہریانی زبان اور اس کی حالت

ہریانی زبان در اصل ایک قسم کی اردو ہے جو گیارھویں صدی ہجری میں شاید اردو سے اس قدر مختلف نہیں تھی جس قدر کہ آج دیکھی جاتی ہے۔ کیونکہ زمانۂ مابعد میں، جب کہ ہریانی اپنی اصلی حالت پر قائم رہی۔ اردو میں دہلی کے محاورے اور شعرا کے تصرفات کی بنا پر کثیر تغیرات واقع ہوئے۔ اور موجودہ اردو اسی اصلاح شدہ شکل کا نام ہے۔ ہریانی علاقوں میں تصنیفات کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ لیکن اس کے ادبیات کے متعلق ہماری موجودہ معلومات بہت محدود ہے حضرت شاہ غلام جیلانی رہتکی مصنف "چوپا ئیہا" (متوفی ۱۲۴۸ھ) اور مولوی محمد رمضان مصنف "آخر گت" و "بلبل باغ محمدی" (۱۲۳۳ھ) اور انور رہتکی (جو اسی صدی کے منتصف دوم سے علاقہ رکھتے ہیں) کے نام اور تصنیفات سے پتا چلتا ہے کہ محبوب عالم کی تحریک، اس علاقہ میں برابر جاری رہی ہے۔

اگر ہریانی کی قید کو اڑا دیا جائے تو اور مصنفین بھی اس فہرست میں جگہ پا سکتے ہیں مثلاً میر جعفر زٹلی نارنولی، جو عہد عالمگیر و فرخ سیر کے مشہور ہزّال ہیں اور امام بخش تھانیسری

مصنف معجزۂ نبی جو بارھویں صدی کے بزرگ ہیں۔ اور دلبر میواتی جنھوں نے اپنا دیوان بہادر شاہ، بادشاہ دہلی کی خدمت میں بھیجا تھا ـــ!

پنجاب میں اردو کا نیا مرکز | پنجاب میں اردو کا نیا مرکز قائم ہوتا ہے۔ یہاں کے مصنفین میں سب سے مقدم مولانا عبدی ہیں جو ۱۱۰۰ھ میں بعہد عالمگیر فقۂ ہندی تصنیف کرتے ہیں فقۂ ہندی کی اردو بالکل پنجابی نما ہے اور جملوں کی بندش بھی پنجابی طرز کی ہے یہ تصنیف ہریانہ کرنال اور میوات کی زبان سے مختلف ہے۔ بارھویں صدی میں قصبۂ بٹالہ (ضلع گورداسپور) میں اردو کا خاصا چرچا رہا ہے۔ یہاں اردو کی تحریک شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی (متوفی ۱۱۵۱ھ) کے مبارک ہاتھوں سے پروان چڑھتی ہے! ان کے پیر بھائی شیخ نور بھی اس میں حصہ لیتے ہیں۔ شیخ فاضل الدین کے فرزند شاہ غلام قادر (متوفی ۱۱۸۰ھ) اردو مثنوی موسومہ بہ رموز العشق کے مصنف ہیں۔ اور شاہ فقیر اللہ بھی اپنی اردو مثنوی ۱۲۳۰ھ میں اس کے تتبع میں لکھتے ہیں۔ بارھویں صدی کے نصف آخر میں پنجاب میں متعدد بزرگ ایسے نظر آتے ہیں جو اردو میں نظمیں لکھتے ہیں۔ شیخ محمد جان، شیخ نصیر الدین محمد غوث بٹالوی نامدار خان وقت، دلشاد پسروری و پسروری، غلام قادر جلالپوریہ اور رام کشن کے نام اس ذیل میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ بٹالہ کی تحریک کا "اس عہد کی دہلی میں اردو کی تحریک" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگرچہ دونوں مرکز قریب قریب ایک ہی زمانہ میں قائم ہوتے ہیں۔ پنجاب میں اردو نظم کا زیادہ رواج رہا ہے اور نثر نسبتاً کم ملتی ہے۔ تاہم نثر کے نمونے موجود ہیں مثلاً کتاب "ہزار مسائل" اور رسالہ "سلوتری" جن کے

مصنفین کا سراغ تاحال نہیں مل سکا ہے!۔

اردو کا آخری لیکن سب سے زبردست اور شاندار مرکز دہلی ہے جو ولی اورنگ آبادی کے اثرات میں قائم ہوتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے کلکتہ پہنچکر عام ہو جاتا ہے!

ہندی السنہ پر مسلمانوں کے احسانات | یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندی السنہ کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کے بارے میں بھی چند کلمات اضافہ کر دیئے جائیں۔

ایک ایسے زمانہ میں جبکہ مسلمانوں پر، برادرانِ وطن ہر قسم کے الزامات واتہامات عائد کرنے کے عادی ہو رہے ہیں، ان کی تاریخ کو توڑ مروڑ کر مسخ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور ان کے احسانات کو، جو انھوں نے ہندوستان پر کیے۔ گلدستۂ طاقِ نسیان بنایا جارہا ہے! یہ بیان کرنا بالکل بے موسم معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہی ہیں جنھوں نے برادرانِ وطن سے پیشتر ہندی زبانوں کی تہذیب و ترقی پر توجہ دی ہے۔ اس ملک کے شمال و مغرب کی زبانوں، یعنی پشتو، سندھی، کشمیری اور پنجابی کا قریب قریب تمام ادبی سرمایہ مسلمانوں کی کوششوں کا ممنونِ احسان ہے بنگالی زبان اور اس کے ادبیات کو فروغ دینے والے مسلمان ہیں، برج قنوجی اور اودھی کی ترقی میں بھی مسلمانوں نے خاصا حصہ لیا ہے۔ کبیر، قطبن اور محمد جائسی، تلسی داس اور سور داس سے پیشتر میدان میں آتے ہیں — !

اردو املا اور رسم الخط | آخر میں اردو املا کے متعلق چند الفاظ کہنا مناسب معلوم ہوتا

ہے ——— فارسی خط زمانۂ قدیم سے ہندی اصوات اور ہندی السنہ کے لکھنے
کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ابتدا میں خط نسخ، نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی تمام
زبانوں کے لیے مخصوص تھا چنانچہ پشتو، سندھی اور پنجابی آج بھی نسخ میں لکھی جاتی ہیں۔
عالمگیر کے بعد شمالی ہند میں نستعلیق رائج ہو گیا۔ خاص ہندی اصوات کے لیے علیحدہ علیحدہ
علامات مقرر کی گئی ہیں اور مختلف زمانوں میں مختلف طریقوں سے لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً
ٹ ڈ، ڑ پر پہلے تین تین نقاط، بعد میں، چار چار نقاط لگائے جانے لگے ———
گجرات میں بارھویں صدی ہجری کی ابتدا میں ان پر ضرب کی علامت "×" لگائی جاتی
تھی اور الف ممدودہ دو الف کی شکل میں لکھا جاتا تھا ۔ ۔ ۔ نویں صدی ہجری میں
گاف کے نیچے تین نقطے لگائے جاتے تھے۔ بعد میں اوپر لگنے لگے ———
ہائے مخلوط التلفظ کا استعمال بھی دیرینہ ہے ——— اردو کا آخری الف
لاحقۂ تبعیہ، فارسی "ہ" کی شکل میں لکھا جاتا تھا مثلاً لسوڑہ، اچینہ، سہرہ، اسپہنہ، ہیرہ
اسی طرح مالوہ، بنگالہ اور بگلانہ وغیرہ۔

عہدِ عالمگیری میں ایک ترمیم | عالمگیر کے عہد میں فضائل خان کے عرض کرنے پر، کہ
ہندی رسم الخط میں اسم و کلمہ کے آخر میں "ہ" نہیں آیا کرتی بلکہ الف ہوتا ہے جیسے
کانا کہا جاتا ہے اور الف ہی کی طرح تلفظ کیا جاتا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا
ہے کہ ایسے الفاظ کو الف کے ساتھ لکھا جائے۔ عالمگیر نے یہ تجویز پسند کی اور حکم
دے دیا کہ آئندہ ایسے کلمے الف کے ساتھ لکھے جائیں یعنی مالوہ کو مالوا، بنگالہ کو

بنگالا وقس علیٰ ہٰذا ۔ اس فرمان کی تعمیل نہ صرف شاہی دفاتر اور ٹکسالوں میں عام ہوئی بلکہ اردو خوان لوگوں نے بھی یہی املا اختیار کر لیا ۔ اور آئندہ گھوڑا، چونا، سہرا، سپنا اور ہیرا لکھا جانے لگا ــــــ!

الف لاحقہ کے استعمال پر اردو اور پنجابی کا اشتراک

الف لاحقہ اردو میں ایسا الف ہے جو اکثر خاتمہ کی غرض سے بڑھا دیا جاتا ہے اردو اور پنجابی اس الف پر اس قدر مصر ہیں کہ جہاں کہیں یہ حرف موجود نہیں ہے اصل کلمہ میں اضافہ کر دیا جاتا ہے حتیٰ کہ غیر زبانوں کے الفاظ پر بھی یہ عمل جاری ہوتا ہے ۔ مثلاً مرغ سے مرغا، یہی حالت نیول، بھوتر، کوئل اور بھوس کی ہے جو نیولا، بھوترا، کوئلا اور بھوسا بنا لیے گئے ہیں۔!!

اُردو

لفظ اُردو ایران میں مغلی عہد کی یادگار ہے اور منتصف قرن ششم میں فارسی زبان میں رائج ہو جاتا ہے۔ اس کے معنی امرا و سلاطین کی فرودگاہ یا کیمپ ہیں۔ تاریخوں میں سب سے پیشتر یہ لفظ جہانکشائے جوینی میں ملتا ہے جس سے دو اقتباس یہاں درج کیے جاتے ہیں:-

"و ہر سال کہ از قومے شخصے را برق رسد قبیلہ و خانہ اُو را از میان خیلان بیرون کنند تا مدت سہ سال و بار و حرے شہزادگان در نتوانند آمد" (ص ۱۶۲ جلد اوّل)۔

"تمامت پادشاہزادگان در خدمت و بندگی قاآن بیرون اردو سہ نوبت آفتاب را زانو زدند و باز اندرون اردو آمدند و مجلس لہو و طرب آراستند"

(ص ۱۴۸ جلد اوّل)

ہندوستان میں اس لفظ کا استعمال بابر کے عہد سے ہونے لگا ہے۔ تزک بابری سے ذیل کی مثال ملاحظہ ہو:-

"در وقت رسیدن نزد بامیان چادر ہائے اردوی ما را کہ عقب ماندہ بودے ہندوہا را خیال کردہ زود بر می گردند۔ بہ اردوئے خود رسیدہ ہیچ چیز تعین نشدہ کوچ مے کنند" (ص ۱۱۹ طبع ملک الکتاب)

مگر زبان کے معنی میں اس کا استعمال چنداں قدیم نہیں ہے۔ اس کو رواج میں آئے سوا سوا سو سال کا عرصہ کم و بیش گذرتا ہے۔ ادبیات میں سب سے پیشتر میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے یہ نام اختیار کیا۔ چنانچہ نوطرز مرصع تالیف ۱۲۱۳ھ کا یہ فقرہ

"اور جو کوئی چاہے سیکھنے زبان اردوئے معلیٰ کا رکھے گا سو مطالعہ اس گلدستہ نگارین کیسے ہوش اور شعور تجربے کا کام حاصل کرے"۔

میر امن نے بھی تحسین کی تقلید میں یہی نام رکھا۔ چنانچہ باغ و بہار ۱۲۱۷ھ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"حقیقت اردو کی زبان بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے" (ص ۴)

اس کے بعد یہ لفظ عام ہو گیا دریائے لطافت تصنیف ۱۲۲۲ھ میں میر انشاء اللہ خاں اور قتیل اپنے تذکرہ میں اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔ انشاء کہتے ہیں:-

"بالجملہ زبان اردو مشتمل است بر چند زبان یعنی عربی و فارسی و ترکی و برجی و غیراں"

قدرت کہتا ہے[۱]:۔

"کرشما زبان دکنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اُردوے معلی شاہجہان آباد موزوں بکنید"

مولوی اکرم علی اخوان الصفا اردو تالیف ۱۲۲۵ھ میں لکھتے ہیں:۔

"رسالۂ اخوان الصفا کہ انسان و بہائم کے مناظرہ میں ہے تو اس کا زبان اردو میں ترجمہ کر لیکن نہایت سلیس کو الفاظ مغلق اُس میں نہ ہو دیں۔"

غازی الدین حیدر والی اودھ کے دور میں محمد بخش مہجور نورتن کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں:۔

"اگرچہ اس نالائق پر خلایق نے سابق میں انشاء گلشن نوبہار غیرت گلزار اور انشاے چار چمن دل لگن پر از قصص دلفریب و فسانہاے عجیب عبارت رنگین اور مضمون نو آئین زبان اُردو میں تحریر و نسطیر کی ہیں" حاجی نعمت اللہ اپنی تفسیر سورۂ یوسف میں تحریر کرتے ہیں:۔

"غرض اس فاید دل کی امید پر بیچ لکھنے ترجمہ ہندی اردوے کتاب احسن القصص کے مشغول ہوا اور وجہ منزل اس سورت متبرکہ کے اور عجوبات اور لطائفات کہ بیچ سمجھ ناداں کے تئیں اپنی زبان روزمرہ کے بیچ جمع کی اور مقید زبان اُردو کا ہوا۔"

اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق صاحب ظہیر الانشا لکھتے ہیں:۔

"چوں بہ زبان اردو ترکی و فارسی اردو گویند ضرورت استعمال این زبان مرکب وجہ تسمیہ

در بازارہا ضرور نرشد خصوصاً در بازار خاص پادشاہی کہ بہ تعظیم نام بازار خاص اردوے معلّٰی بود۔ لہٰذا نامزد تازہ مرکب نیز اردوے معلّٰی قرار یافت تا ایں کہ بانقراض ازمنہ آں تخصیص آداب شاہی باقی نماند آں التزام لفظ معلّٰی ہم نماند فقط اردو باقی ماند پس وجہ تسمیہ اردو ہمیں است و اسم بامسمّٰی ریختہ است یعنی زبان عربی و فارسی دریں ریختہ اند"۔

(منقول از جلوۂ خضر)

میرامن کی بھی قریب قریب یہی رائے ہے۔ کہتے ہیں :۔

"آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے میں اب تک نام سلطنت کا چلا آتا ہے۔ ہندوستان لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا" . . . . جب حضرت شاہجہان صاحبقران ثانی نے قلعۂ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا . . . اور شہر کو اپنا دارالخلافت بنایا تب شاہجہاں آباد مشہور ہوا اگرچہ دلی جدی ہے وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے۔ اور وہاں کے بازار کو اردوے معلّٰی خطاب دیا"۔ (صہ ۲)

سرسید احمد خاں بھی اپنی تصنیف "آثار الصنادید" میں انہی بزرگوں کے ہم آواز ہیں :۔

"اور جو کہ یہ زبان خاص پادشاہی بازاروں میں مروّج تھی۔ اس واسطے اسکو

زبان اُردو کہا کرتے تھے - اور بادشاہی امیر امرا اسی کو بولا کرتے تھے - گویا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی زبان تھی - ہوتے ہوتے خود اس زبان ہی کا نام اُردو پڑ گیا "

مؤلف فرہنگ آصفیہ کہتے ہیں :-

"چونکہ اوّل اوّل اس کی شاہجہانی لشکر سے ابتدا ہوئی - لہٰذا اس کا نام بھی اُردو پڑ گیا - قلعۂ معلّٰی کے لاہوری دروازہ کے سامنے اردو بازار کے نام سے ایک بازار بھی آباد ہو گیا - جو بلاقی بیگم کے کوچے اور چاندنی چوک کی سڑک کے جنوبی پہلو پہ واقع تھا "

ان بیانات میں قریب قریب اکثر اسناد اس امر پہ متفق ہیں کہ دہلی کے اردو بازار کی بنا پر اس زبان کا نام زبان اردو ٹھہرا - ان کا یہ خیال ممکن ہے کہ صحیح ہو - یہاں اردو بازار کے متعلق چند الفاظ کہنے ضروری ہیں - اس میں شک نہیں کہ دہلی میں ایک بازار کا نام اردو بازار تھا جو قلعہ سے ملحق تھا - لیکن اسکا پہلا نام لاہوری بازار تھا - آثار الصنادید میں سید احمد خاں خونی دروازہ کے ذکر کے بعد کہتے ہیں :-

"اور اس کے آگے بڑا بازار جس میں چاندنی چوک وغیرہ سب بازار شامل ہیں مگر اگلے زمانہ میں یہ بازار لاہوری بازار یا اردو بازار کہلاتا تھا . . . .

یہ بازار قلعہ کے لاہوری دروازہ سے فتحپوری تک ہے - اس بازار کے پہلے حصّہ کو تو اُردو بازار کہتے ہیں اور اس کے آگے جہاں ترپولیہ در کوتوالی

ہے سو وہ اسی نام سے مشہور ہے اور اس کے آگے چاندنی چوک کہلاتا ہے ۔ اور اس کے آگے فتحپوری کا ۔ یہ بازار ہے چالیس گز کے عرض سے بیس گز ادھر اور بیس گز ادھر بیچ میں سر تا سر نہر جاری ہے اور گرد نہر کے دو رستہ درخت لگے ہوئے ہیں "۔

صاحب سیر المتاخرین اسی بازار کے بیان میں فرماتے ہیں :۔

"غرض اس بازار میں دو طرف دوکانیں گچ کی کرسی دار بہت موزوں و خوش قرینہ ہیں اور اس کے سقف بام پر بالاخانے یک منزلہ و دو منزلہ اور بیچ میں اس کے دو سڑکوں کو سنگ ریزہ و بجری سے ایسا پختہ و مصفّا کیا ہے کہ آدمیوں کا منہ اور عمارت کا چہرہ اس میں مثال آئینہ کے دکھائی دیتا ہے ۔ ہر روز اس پر آب پاشی ہوتی ہے ۔ اہل گنبد کی روح تازی ہوتی ہے ۔ اور مابین دونوں سڑکوں کے نہر جاری ہے اور کناروں پر سرو رختی ہے ۔ کہ اس کی ہیئت مجموعی جدول بین السطور کتاب نظر آتی ہے "۔ (صہ ۵۰۲)

لاہوری دروازہ کی رعایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں اس بازار کا نام لاہوری بازار رکھا گیا ۔ بعد میں عسکر کی رعایت سے اردو بازار کہلانے لگا ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ بازار ۱۸۵۷ء میں برباد کر دیا ۔ چنانچہ مرزا غالب اردوئے معلّی میں میر مہدی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"واہ رے حسن اعتقاد ۔ ارے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا اردو کہاں دلی کہاں

واللہ اب شہر نہیں کیمپ ہے چھاؤنی ہے نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر"
(صہ ۱۹۴ اکمل المطابع م)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

"تم اردو کے میرزا قتیل بن گئے ہو اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے
تھے رود نیل بن گئے ہو" (صہ ۱۹۴)

تعجب ہے کہ اردو ایک بازار کا نام ہونے سے زبان کا نام اردو رکھ دیا گیا۔
لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ کوئی قدیم نام نہیں ہے۔ نہ قدما اس کا ذکر کرتے
ہیں نہ شعرا اس سے واقف ہیں نہ تاریخوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔ اس کی قدامت
کی تائید میں البتہ ایک بیان ملتا ہے۔ جو حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے اردوے
قدیم میں دیا ہے، وہو ہذا:۔

"مؤید الفضلا سے (جو فارسی کی ایک مستند لغت ہے اور بابر کی آمد سے ایک
عرصہ پہلے سلطان ابراہیم کے عہد میں لکھی گئی) ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں
ہندوستان میں اسلامی لشکرگاہیں اردو کہلاتی تھیں۔ ورنہ زبان اردو کو اہل اردو
کی زبان کہا کرتے تھے۔ چنانچہ کتاب مذکور میں ایک مقام پر تحریر ہے۔

"در زبان اہل اردو خون خرابا نامند"۔

یہ بیان میں خیال کرتا ہوں حکیم صاحب ممدوح نے نولکشور کی مطبوعہ مؤید الفضلا
سے دیا ہے لیکن یہ نسخہ اگرچہ مالکان مطبع اس کو مصنف کا دستخطی بیان کرتے ہیں مصنف

کے عہد سے بہت بعد کا نوشتہ ہے۔ جب قلمی نسخوں سے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ تو اس میں سینکڑوں الفاظ ایسے ملتے ہیں جو قلمی نسخوں میں موجود نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نولکشور نے کوئی ایسا نسخہ چھاپا ہے جس میں کسی غیر شخص نے بعد میں بہت کچھ اضافہ کر دیا ہے۔ مثلاً لفظ برسم کی تشریح میں وہ کہتا ہے:۔

"فقیر گوید کہ این لغت را از مجوسے کہ در دین خود بغایت فاضل بود و آذر شیر نام داشت و در عہد محمد اکبر شاہ از کرمان بہندوستان آمدہ و تحقیق نمودم" (صد ۱۵۹)

اب یہ بیان صاحب موید الفضلا کا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ اپنی تصنیف ۹۲۵ھ میں ختم کر چکا ہے اور یہ شخص اکبر کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت زندہ نہیں تھا۔ دوسرے یہ جملہ یعنی "در زبان اہل اردو حسن خرابا گویند" مجھ کو موید الفضلا کے قلمی نسخہ میں نہیں ملا۔ اور کوئی تعجب نہیں اگر مطبع نولکشور کے مصحح نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہو۔ اردو سلاطین کے لشکر گاہوں کو کہتے تھے۔ اس معنے میں مغلیہ عہد کے تمام مورخ اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اکبر کے بعض ایسے سکوں پر جو اثنائے سفر میں لگائے جاتے تھے اکثر اوقات "ضرب اردوے ظفر قرین" ہوتا تھا۔ اس کے بعض مسی سکوں پر ایک طرف "اردوے ظفر قرین" اور دوسری طرف "ضرب الف فلوس" ہوتا تھا۔

جب ہم محققین کے پیشروؤں کی تصنیفات دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ بزرگ اُردو اور اُردوے معلی کے نام تک سے روشناس نہیں۔ استعمال میں لانا کجا،

وہ اس کو ہندی کے نام سے پکارتے ہیں یا ریختہ کے نام سے۔ چنانچہ میر جعفر زٹلی جن کا عہد عالمگیر سے لے کر فرخ سیر کے دور تک ہے۔ اس کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ اپنی تصنیف زٹل نامہ کے خاتمہ میں جو شامل کلیات ہے، لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ سبھی کورڑہ و کرکٹ است   بہندی و ہندی زبان لٹ پٹ است"

شاہ حاتم اپنے دیوان زادہ میں جو ۱۱۶۹ھ کی یادگار ہے اپنے متعلق لکھتے ہیں:۔

"در شعر فارسی پیرو صائب است و در ریختہ ولی را استاد می داند"

(از فہرست اسپرنگر ص ۱۱۹)

میر اثر اپنی مثنوی میں جو خواب و خیال کے نام سے مشہور ہے، اور ۱۱۵۰ھ اس کی تاریخ تصنیف ہے، لکھتے ہیں:۔

"ایک تو ریختہ ہے سہل زباں   دوسرے جب کہ ہو بلند بیاں

دیگر ؎

فارسی سو ہیں ہندوی سو ہیں   باقی اشعار مثنوی سو ہیں۔

دیگر ؎

ریختہ نے یہ تب شرف پایا   جب کہ حضرت نے اس کو فرمایا

مرتبہ ریختہ کا اور ہوا   معتبر فارسی کے طور ہوا"

میرزا سودا تنبیہ الغافلین میں حوالۂ قلم کرتے ہیں:۔

"وغدا غالم است این چند بیت ریختہ از قبیل قصیدہ و غزل بچہ سبب

حسنِ قبول یافتہ است"

نثر کے علاوہ نظم میں بھی وہ ریختہ ہی لکھتے ہیں۔ چنانچہ بعض امثال :-

تو نے وہ سوؔدا زبانِ ریختہ ایجاد کی

پڑھ کے اک عالم اُٹھاتا ہے ترے اشعار فیض (ص۲۱)

دیگر ؎

ریختہ اور بھی دنیا میں ہے اے سودا جینے دیوے جو کبھو کاوشِ و درس مجھ کو (ص۲۰۶)

دیگر ؎

کہنے لگے ریختہ جو کوئی سوؔدا کی طرح اس پہ زمیں سے ہوتا لوح و قلم واہ واہ

دیگر ؎

سخن کو ریختہ کے پوچھے تھا کوئی سوؔدا پسند خاطرِ دلہا ہوا یہ فن مجھ سے

دیگر ؎

شعر ناموزوں سے تو بہتر ہے کہنا ریختہ کب کہا میں نقل کر مضموں کسی کا ریختہ

بے حیائی ہے یہ کہنا اُن کے میرا ریختہ خونِ معنی تا رَبیع باد پیما ریختہ

آمدہ ئے ریختہ از جوشِ سوؔدا ریختہ (ص۳۵۶)

دیگر ؎

ریختہ کی جو وہ کہے ہے غزل لفظ و معنی ہیں کم ہے اُس کے خلل (ص۲۸)

یہی حالت میر تقی میرؔ کی ہے۔ میں اُن کے کلیات سے ذیل کی بعض امثال یہاں حوالہ

قلم کرتا ہوں :-

گفتگو ریختہ میں ہم سے نہ کر ۔۔۔ یہ ہماری زبان ہے پیارے (ص۱۲۱)

دیگر

مضبوط کیسے کیسے کہے ریختے والے ۔۔۔ سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں (ص۱۲۵)

دیگر

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے ۔۔۔ بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

قائم فرماتے ہیں :-

قائم میں ریختہ کو دیا خلعت قبول ۔۔۔ ورنہ یہ پیش اہل ہنر کیا کمال تھا

اور جرأت

"کہہ غزل اور اس انداز کی جرأت اب تو ۔۔۔ ریختہ چاہیے کہ اگلی تری مشہور ہوئی"

سید غلام علی عشرت بدماوت اردو مصنفہ ۱۲۱۱ھ کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں :-

"انھوں نے قصہ راجہ رتن سین اور پدماوت کا کہ زبان پوربی میں تصنیف مولانا ملک محمد جائسی کا ہے زبان ریختہ میں تصنیف کرنا شروع کیا۔"

شاہ عبد القادر دہلوی اپنے ترجمہ قرآن پاک ۱۲۰۵ھ میں فرماتے ہیں :-

"اول یہ کہ اس جگہ ترجمہ لفظ بلفظ ضروری نہیں کیونکہ ہندی ترکیب عربی سے بہت بعید ہے۔ اگر بعینہٖ وہی ترکیب رہے تو معنی مفہوم نہ ہوں دوسرے یہ کہ اس میں زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف کو عوام کو بے تکلف

دریافت ہوئے"

یہی نہیں بلکہ ریختہ اور ہندی کا استعمال میرامن کے دَور کے بعد تک ہوتا رہا ہے۔

مولوی خرم علی نصیحت المسلمین" تالیف ۱۲۳۵ھ میں لکھتے ہیں :۔

"بندہ خرم علی کے دل میں آیا کہ اس شرک کی برائی قرآن شریف سے ثابت کیجئے اور ہر آیت کا ترجمہ ہندی زبان میں صاف صاف بیان کر دیجئے تاکہ ہر ایک کوں فائدہ عام ہو"

روسماح میں ایک رسالہ کا ترجمہ ۱۲۴۶ھ ہجری میں کیا گیا تھا۔ اس میں سے فقرۂ ذیل ملاحظہ ہو :۔

"لیکن عام اس کی فہمید سے عاجز تھے اس لئے ریختہ زبان میں اس کے ترجمہ کرنے کا اتفاق ہوا"

غالبؔ فرماتے ہیں :۔

ریختہ کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میرؔ بھی تھا

(دیگر) شیفتہ گلشن بے خار میں لکھتے ہیں :۔

"تذکرۂ ترتیب یافتہ مشتمل بر اشعار موزونان فصاحت گستر و ریختہ گویان بلاغت طراز بغایت مختصر"

ریختہ کی وجہ تسمیہ میں ہمارے تذکرہ نگاروں نے حسب معمول عجیب عجیب خیال آرائیاں کی ہیں۔ منشی درگا پرشاد صاحب نادرؔ خزینۃ العلوم میں کہتے ہیں :۔

"ریختہ بمعنے گرے ہوئے کے ہیں پس جو زبان اپنی اصلیت سے گر جائے۔ اس کو زبان ریختہ بولتے ہیں۔ چنانچہ جیسے فارسی زبان میں عربی کے لغت شامل ہوئے۔ اسے زبان ریختہ فارسی کہتے ہیں۔ اسی طرح حسب تقریر بالا زبان ریختہ ہندی کو زبان اردو سمجھتے ہیں" (خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم صہ۴۹ مفید عام لاہور ۱۸۷۹ء)

حضرت آزاد آب حیات میں فرماتے ہیں:۔

"اس زبان کو ریختہ کہتے ہیں کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے۔ جیسے دیوار کو اینٹ۔ مٹی۔ چونا سفیدی وغیرہ پختہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنے ہیں گری پڑی پریشان چیز۔ چونکہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں۔ اس لئے اسے ریختہ کہتے ہیں۔"

صاحب جلوۂ خضر کا بیان ہے:۔

"اس زبان کا نام ریختہ شاہجہان کے وقت میں رکھا گیا۔ چونکہ ریختہ گچ کو کہتے ہیں۔ پختگی کے لحاظ سے اس کو ریختہ کہنے لگے۔"

ہمارے مخدوم حضرت سرخوش اعجاز سخن میں رقم فرما ہیں:۔

"اگرچہ لفظ ریختہ کے فارسی میں کئی معنی ہیں۔ مگر زبان کے تعلق میں فطرتاً اس سے ٹوٹا پھوٹا یا شکستہ ہی مراد لی جا سکتی ہے۔"

ان بیانات میں ریختہ کے پہلے معنی گرے پڑے اور پریشان کے بتائے ہیں۔

فارسی میں بیشک یہ معنی مستعمل ہیں ۔ مثلاً شکست وریخت یا شکستہ وریختہ لیکن یہاں
یہ معنی قطعاً ناموزوں ہیں ۔ دوسرے معنی چونہ سفیدی وغیرہ کے دیئے ہیں ۔

اس میں شک نہیں کہ ریختہ تعمیرات کی ایک اصطلاح ہے جس کا اطلاق عمارت
پختہ وسنگین برخلاف عمارت گلیں وچوبیں پر ہوتا ہے اس لئے اس کا استعمال چونہ اور
استرکاری پر بھی ہونے لگا جس سے عمارت پختہ ومضبوط ہو جاتی ہے ۔

شمس سراج عفیف اپنی تاریخ فیروزشاہی میں حصار فیروزہ کی آبادی کے
بیان میں اس کی خندق کی تعمیر کے متعلق کہتے ہیں :-

" بعد از مرتب شدن حصار خندق کا وبیند انچنیں کہ بعد ازاں خندق و باہر دو
بازوی خندق ریختہ برآوردند و بالاے بازوہاے خندق کنگرہ بستند
(صـ ۱۲۶)

دوسرے مقام پر یہی مؤرخ بیان کرتا ہے :-

" درین پنج گروہ آبادانی از ہر یک گروہ بگروہ کردہ بود ۔ خلائق بے علائق
خانہا ریختہ ۔ گچ کردہ برآوردہ " (صـ ۱۲۵) .

تیسرے مقام پر یہ لفظ یوں آیا ہے :-

" آں عمارت بصنعت کاریگراں اہل مہارت و بصارت از سنگ گھر سنگ
(یا کھر سل) یا چونہ ریختہ برآوردہ " (صـ ۳۲۰)

چوتھے موقع پر یہ فقرہ ملتا ہے :-

"الغرض در ہر محلے و مقامے کہ عمارت کردہ ہم از ریختہ بر آوردہ و از جنس چوبینہ برائے نام نے مگر ہمیں تختہائے در" (ص ۲۱)

ان چاروں فقروں سے واضح ہوتا ہے کہ ریختہ کے معنی پکی تعمیر کے لئے گئے ہیں۔ برخلاف کچی تعمیر کے جو مٹی یا لکڑی کی ہو۔ یعنے ریختہ ایسی تعمیر ہے جو چونہ پتھر سے طیار ہو۔ سودا ایک مقام پر کہتے ہیں:-

"ہر بیت رکھے ہے یہ غزل ایسی ہی مضبوط سودا کوئی جوں ریختہ کے گھر یہ کرے بگچ"

دوسرے مقام پر کہتے ہیں:-

"مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ	سودا یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا
آگاہ فارسی تو کہیں اُس کا ریختہ	واقف جو ریختہ کے ذرا ہووے ٹھاٹ کا
سُنکر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ	اور ریختہ بھی ہے تو فیروز شاہ کی لاٹ کا

لیکن زبان کے سلسلہ میں ریختہ کے یہ معنی بھی نامناسب ہیں:-

ہمیں یاد رہے کہ ریختن فارسی زبان میں متعدد معنی میں آتا ہے اور ان معنی سے قطع نظر وہ (۱) بنانے، ایجاد کرنے (۲) کسی چیز کو قالب میں ڈھالنے، نئی چیز بنانے اور (۳) موزوں کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

مثال اول نظیری ؎

دانگہ از الماس بہر جان ما	تیغ ابرو رمح مژگاں ریختند

(دیگر) باقر کاشی ؎

شاید از عہدہ شمہائے تو آیم بیروں   تے از دسے بریزم دلے از خارہ کنم

مثال معنی دوم ؎

بنے ریختن توپ تازہ شدہ نبین   بشاہراہ عقیدت ز صدق شد پویاں

(دیگر) نظیری ؎

ہر طرف رنگے بگل بسر رشتہ شد   قالب گرد سلماں ریختہ شد

اسی سے ریختہ گر نکلا ہے جو چیزوں کو ڈھالتا اور بناتا ہے سعید اشرف ؎

"خود بخود بادہ عیش ز قدحم مے ریزد   گوئیا جام مرا ریختہ گر ساختہ است"

مثال معنی سوم ؎

"مصرع زلف بتاں چیں بر زبان شانہ ریخت   موشگافاں را کلید گفتگو دندانہ ریخت"

یہی حالت مصرع ریختہ و معنی ریختہ کی ہے اس کا اطلاق ایسے مصرع یا معنی پر ہوتا ہے جو بے تکلف و تامل ذہن میں آجاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنے کہ مصرع موزوں و معنی موزوں کے معنی دیتا ہے۔ ملا طغرا ؎

"دیدیم چو قسمانہ صبر تارے دہد   چوں مصرع زلف مصرع ریختہ"

یہیں سے وہ محاورہ نکلا ہے "فلاں ریختہ ایں کار است" یعنی اس کام کے لئے موزوں ہے۔ شفق ؎

"دو سے سوزم و می گدازم دے گریم   چوں شمع شفق ریختہ ایں کارم"

آخری معنی کے اثرات ہیں ریختہ نے ساتویں قرن ہجری میں ہندوستان میں

نئے معنی پیدا کر لیے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب امیر خسرو دہلوی نے ایرانی اور ہندی موسیقی کے اتحاد سے ایک نئی چیز طیار کی اس کیلئے انھوں نے بعض نئی اصطلاحات مثلاً قول۔ ترانہ۔ معروفی۔ صوت۔ بسیط۔ دو بحر۔ چہار اصول۔ نقش فارسی۔ اور غزل وغیرہ وضع کیں۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے ریختہ کی اصطلاح بھی وضع کی۔ اس اصطلاح سے موسیقی میں یہ مقصد قرار پایا کہ جو فارسی، خیال ہندوی کے مطابق ہو اور جس میں دونوں زبانوں کے سرود ایک تال اور ایک راگ میں بندھے ہوں۔ اس کو ریختہ کہتے ہیں۔ ریختہ کے لیے کسی پردہ کی قید نہیں ہے۔ وہ ہر پردہ میں باندھی جاتی ہے۔ میری اس اطلاع کا ماخذ کتاب چشتیہ ہے۔ جو مخدوم حضرت علاء الدین ثانی برناوی نے ۱۰۶۵ھ ہجری میں تصنیف کی ہے۔ اس کتاب کا اصل نسخہ بحالت تباہ راقم کو مل گیا ہے۔ مخدوم علاء الدین جانشین ہیں خاتم التارکین حضرت شیخ بہاؤ الدین برناوی متوفی ۱۰۳۸ھ کے جو فن موسیقی میں امیر خسرو کے بعد ہندوستان میں بے نظیر مانے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ راگ درپن میں فقیر اللہ نے موسیقی دانوں میں سب سے پیشتر آپ ہی کا ذکر کیا ہے۔ مخدوم علاء الدین اپنے پیر و مرشد مخدوم بہاء الدین کی سند پر امیر خسرو کی خدمات موسیقی کے ذکر میں ریختہ کے متعلق کہتے ہیں:-

"واصطلاح دیگر آنکہ ہر فارسی کہ با مضمون خیال ہندوی مطابق باشد و الفاظ ہر دو زبان را در یک تال و یک راگ بر بست نمودہ باشند و انضمام و اتصل

دادہ سرایندآں را ریختہ گر بند و ایں ریختہ را در ہر پردہ می بندند و ذوق و لذتے افزوں می بند"

اس عبارت میں خیال کی شرح کا محتاج نہیں کیونکہ اب بھی موسیقی میں اس کا رواج ہے۔ یہی فارسی اس کے لیے مخدوم علاء الدین فرماتے ہیں :-

"در فارسی اصطلاحی آں را نام ہند کہ یک بیت را با تا مالی معروف ساختہ بر بست کنند"

گویا ریختہ کا اطلاق ایسے سرود پر ہوتا تھا جس میں ہندی اور فارسی اشعار یا مصرعے یا فقرے جو مضمون زنال اور راگ کے اعتبار سے متحد ہوتے تھے ترکیب دے دیے جاتے تھے۔ اس کی مثال میں امیر خسرو کی وہ غزل بتائی جا سکتی ہے جس کا مطلع ہے ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
چو تابِ ہجراں ندارم اے جاں نلیہو کاہے لگائے چھتیاں

شیخ بہاء الدین بن حاجی معز الدین متوفی ۹۱۲ھ شیخ رحمت اللہ گجراتی کے مرید تھے۔ باجن تخلص تھا۔ اور فارسی و ہندی میں شعر کہتے تھے۔ انھوں نے اپنی ایک تالیف میں جو مریدوں کی ہدایت اور اپنے مرشد کے حالات میں لکھی ہے۔ فقرات ذیل کو ریختہ کے نام سے یاد کیا ہے :-

" یہ صوفی سرِ الٰہی   ایں مرتبہ دارد شاہی   یہ مظہر عین خدائی
دراں مجلس کہ مظہر عین خدا باشد   آنجا عین شین خدا باشد   آنجا بارو رحمۃ اللہ
آنجا ساقی رسول اللہ   آنجا ہمہ اللہ باشد غیر اللہ "

شیخ باجن اس ممدوح کو ریختہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں انہی کی تصنیف سے ایک اور مثال دیتا ہوں :-

" باجن یہ وہ روپ نہ ہوئے جو کوئی بکھانے بکھانے آپ کو جیوں سب کوئی جانے
آں نمرویست کہ من صف جمالش دانم ایں حدیث از دگراں پرس کہ من حیرانم
باش تا جاں برود در سر آں یار لطیف کہ بکارے بہ ازیں کار نیاید جانم "

شیخ جمالی عہد ہمایوں و شیر شاہ کے شاعر ہیں ان کے نام پر یہ ریختہ مشہور ہے بعض تذکروں اور بیاضوں میں امیر خسرو کی طرف منسوب ہے ۔

.... ہر دو تیر اکتا ہے مو نیاشد بدور تو ستا ہے
خوار شدم زار شدم لٹ گیا در رہ عشق تو کمند تتا ہے
گرچہ بدم گفت رقیب کتن اس کا کہا مت کرو یہ جھتا ہے
گاہ بگفتہ کہ جمالی تو بیشہ ہم کرو کیا اپنا کرم پہنتا ہے

شیخ سعدی دور اکبری کے ایک بزرگ ہیں جن کو غلطی سے عوام شیخ سعدی شیرازی مانتے ہیں۔ ان کا ریختہ اکثر تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے میں صرف مقطع پر قناعت کرتا ہوں ۔

سعدی کہ گفتہ ریختہ در ریختہ در ریختہ شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

گویا اس عہد تک ریختہ کے معنی گیت کے لئے جانتے تھے ہندی موسیقی کی سرپرستی چونکہ اکثر سلاطین و مشائخ نے کی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ متعدد فارسی اصطلاحات

بعض وقت مصرع کے آخری رکن فاعلاتن میں سبب خفیف گرا کر فاعلن رہ جاتے ہیں
راس رتناولی میں ایسی متعدد مثالیں میری نظر سے گذری ہیں۔ قدیم زمانہ میں ریختہ صرف
بحر مضارع ہی میں محدود نہ تھا بلکہ اور بحروں میں بھی لکھا جاتا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد ریختہ نے موسیقی سے نکل کر عمومیت حاصل کر لی۔
اور اس کا اطلاق ایسے کلام منظوم پر ہونے لگا جس میں دو زبانوں کا اتحاد ہو۔ چنانچہ
شیخ باجن شیخ جمالی اور شیخ سعدی کے ہاں ریختہ کا یہی مفہوم ہے۔ دوسرے الفاظ میں
یوں کہا جا سکتا ہے کہ ریختہ ایسی نظم ہوتی تھی جس میں ہندی فارسی کے اشعار یا فقرے متحد
ہوتے تھے۔ یہاں ایک مثال بارھویں قرن ہجری کے ریختہ کی دی جاتی ہے۔ جو خواجہ حافظ
کی مشہور غزل کی تضمین ہے۔ ریختہ:

"سوکھ چین کے منڈل موں ابھ جا کر و پکارا ‎ ‎ ‎ دل می رود ز دستم صاحبدلاں خدا را

اکھیاں نے جھڑ لگایا، رسوا کریں گی آخر ‎ ‎ ‎ دردا کہ راز پنہاں، خواہد شد آشکارا

اے مرگ تک امن دے، دل کی مراد یوں ہے ‎ ‎ ‎ باشد کہ باز بینیم، آں یار آشنا را

دو دن کی زندگانی، مت کر جفا کسی پر ‎ ‎ ‎ نیکی بجائے یاراں، فرصت شمار یارا

تن من کیا ہے تو ہو، تو ہو گیا ہے پانی ‎ ‎ ‎ دلبر کہ در کف او، موم است سنگ خارا

اکثر گناہ کر کے، اب ہو رہے ہیں تائب ‎ ‎ ‎ اے شیخ پاک دامن، معذور دار ما را

اندر سرائے گلشن، بلبل پکارتی ہے ‎ ‎ ‎ ہات الصبوح ہبوا، یا ایہا السکارا

محتاج یک نظر کا، دربار پر کھڑا ہوں ‎ ‎ ‎ روزے تفقدے کن، درویش بے نوا را

دنیا کا فکر مت کر کہتا ہیں خواجہ حافظ   کیں کیمیائے ہستی، قارون کند گدا را"

میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں ریختہ کی چار قسمیں کی ہیں:-

(۱) یہ ہے کہ ایک مصرع ہندی ہو اور ایک مصرع فارسی جیسی کہ تضمین بالا۔

(۲) یہ ہے کہ نصف مصرع ہندی ہو اور نصف فارسی

(۳) یہ ہے کہ اس میں فارسی کا عنصر حرف و فعل کی صورت میں ہو

(۴) وہ ہے جس میں صرف فارسی کی ترکیبیں پائی جائیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم میر صاحب کی اپنی اپج ہے اور عام طور پر رائج نہیں تھی، ریختہ کی غزلوں میں یہ تقسیمیں مخلوط شکل میں عام طور پر ملتی ہیں۔

گیارھویں صدی میں ریختہ کا اطلاق بالعموم اردو نظم پر ہونے لگا، چنانچہ ذیل کی غزل بھی ریختہ ہے:-

"جانانہ رحم فرماؤ تاں، یا مجہ بلایا آؤ تاں   اپنا مجھی کیا نہ ستاؤ تاں، یا مجہ بلایا آؤ تاں

تیرے فراقوں دن رین، اکھو سیں ہیں انجھو نین   کب لگ یہ مینہ برساؤ تاں، یا مجہ بلایا آؤ تاں

کیتا کہوں لے ترس ایک یک گھڑی گودی میں   بگی خبر کہلاؤ تاں، یا مجہ بلایا آؤ تاں

پیارے ستانی کردہ! خون غریباں نہیں روا   مجہ جیو کوں بچاؤ تاں، یا مجہ بلایا آؤ تاں

ہے دل منیں یہ آرزو، ایک روز اپنے روبرو   لے جان من بتلاؤ تاں، یا مجہ بلایا آؤ تاں

یہ حسن ہے دن چار کا، جوں پھول ہے گلزار کا   آخر کو ہے کملاؤ تاں، یا مجہ بلایا آؤ تاں

ساجن کروں کیتا گلہ، اب وصل کا شربت پلا   توڑ جگر یہو نجاؤ تاں، یا مجہ بلایا آؤ تاں

اپنا نہ ہو بلیا کی توں، اثر ہے جثہ نے خاک توں — کچھ حق سیتی ٹک پاؤ ناں، یا مجہ بلا یا آؤ ناں

یہ دانا جلے کا قول ہے، ہر یو سخن بے مول ہے — مطلب حقیقی پاؤ ناں، یا مجہ بلا یا آؤ ناں

کہنا بھول ہے جپنا حرف، حکمت جو کمنی ہے تذکر — تجھے بست بچھاؤ ناں، یا مجہ بلا یا آؤ ناں

یاد رہے کہ اس عہد میں ریختہ نظم کے ساتھ مخصوص ہے اس کو نثر کے ساتھ یا زبان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ استاد ولی کے ہاں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ ذیل میں بعض اشعار حوالہ قلم ہیں:-

(۱) "ولی تجھ حسن کی تعریف میں جب ریختہ بولے — سنے تو اس کوں جان و دل سوں حسان عجم اگر"

(۲) "ذہبا ہے جگ کو یو ہے ولی کیا عجب اگر — یو ریختہ کوں سن کے ہوں معنے نگار ہند"

(۳) "یو ریختہ ولی کا جا کر اسے سنا یو — رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کی مانند"

اور سراج اورنگ آبادی سے

"ور اے مزاج اس منتخب دیوان کے سب ریختے — خامۂ مژگان خوباں سے ہیں لائق صاد کے"

میر تقی میر کے ہاں بھی بعض اوقات اسی مفہوم میں آیا ہے۔ امثال:-

(۱) پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ — مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں (ص [illegible])

(۲) ہر بند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ — ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ (ص ۹)

(۳) کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک — ہے میرے ریختوں کا یہ نادر کلام عام (ص [illegible])

(۴) دو دانا ہو گیا تو میر آخر ریختہ کہہ کہہ — نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ اچھی نہیں باتیں (ص [illegible])

(۵) ترک بچے سے عشق کیا تھا ریختے کیا کیا میں نے کہے — رفتہ رفتہ ہندوستاں سے شعر مرا ایران گیا (ص [illegible])

اشعار بالا میں ریختہ کے معنی شعر و سخن (ہندی) یا کلام منظوم کے لئے گئے ہیں ۔ ریختہ کہنا مرادف ہے سخن گفتن کا۔ جب دہلی میں ولی کے اثرات میں اُردو شاعری کا رواج ہؤا تو ریختہ دکن سے یہی معنی ساتھ لایا ہے ۔

اگرچہ شمال میں اُردو گو شعرا گیارھویں صدی ہجری میں موجود تھے (مثلاً محمد افضل جھنجھانوی متوفی ۱۰۳۵ھ اور جعفر زٹلی) لیکن قدمائے اُردو نے ریختہ گوئی کا سہرا دکن ہی کے سر باندھ دیا ہے ۔ اکثر نے ولی کے تتبع میں شعر گوئی کی ہے۔ چنانچہ شاہ حاتم اپنے لئے کہتے ہیں ۔

"در شعر فارسی پیرو میرزا صائب است و در ریختہ ولی را استاد می داند"

میر تقی میر کہتے ہیں ؎

"خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے کے معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا" (ص ۱۲۳)

قائم کا بیان ہے ؎

"قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی"

میر حسن کا قول ہے :۔ "بدباید دانست کہ ریختہ اول از زبان دکن رواج یافتہ"

کلیات سودا کے دیباچہ میں اُن کے ایک شاگرد کا بیان ہے :۔

"بعد انقضائے دورہ فارسی گویان نوبت پادشاہی ملک سخنوری ریختہ ہندی بولی دکنی زبانی ولی دکنی و آبرو وغیرہ رسید"

شاہ گلشن نے جو مشورہ ولی کو دیا ہے قدرت نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

ر شمانہ بان دکنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوے معلی شاہجہان آباد موزوں بکنید"۔

ریختہ سے مراد اگرچہ ولی اور یہ آج کے ہاں نظم اردو ہے لیکن دہلویوں نے بالآخر اس کو زبان اردو کے معنی دیدیئے اور یہ معنی قدرتاً پیدا ہوگئے اس لیے کہ ان ایام میں اردو زبان کا تمام تر سرمایہ نظم ہی میں تھا۔ جب نثر پیدا ہوگئی تو یہی اصطلاح اس پر ناطق آگئی۔ اس طرح ریختہ قدرتاً اردو زبان کا نام ہوگیا۔

اردو کے نام ریختہ کے علاوہ اور بھی ہیں۔ مثلاً شیخ باجن متوفی ۹۱۲ھ اس کو زبان دہلوی کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ کہتے ہیں "صفت دنیا بزبان دہلوی گفتہ" اس سرخی کے ذیل میں انھوں نے اشعار ذیل لکھے ہیں جو اردو اشعار کا قدیم ترین نمونہ مانے جا سکتے ہیں ؎

دوہرہ،

یہ فتنی کیا کسے بہ ملتی ہے   جب ملتی ہے تب چھلتی ہے (دہن اول)

اول ان چیل بہت چھنلاے   ان جھہری ہنتی کہاے   ان رد کر بہت رلاے

یہ فتنی کیا کسے بہ ملتی ہے   جب ملتی ہے تب چھلتی ہے (دہن دوم)

ان بہت کھیرے بارے   جے اس ملکے دے ان جہارے   جے رہے اس تے ہارے

جے نجانے اس تے باسے   جے اس کارن پٹنہ ترسے   جے چکوے تو اس ستے بلسنا

یہ فتنی انھوں تیاوے   تیکو پاس انھوں وادے   جے اس کد ہیں نہ نوریں

جے چکہ ملے تو بھی اس چھوڑ نہ   جے دیکھہ اس تھے بھاگے   پرنیچ ان سنہ ۱۱ اگے رتخلص)

دیکھہ باجن یہ تو جہو تی   منہ مینتی چت نیتھی   یہ ابے ایسی دیتھی

یہ قلنی کیا کیسے یہ ملتی ہے   جب ملی ہے تب چھلتی ہے

یہ اشعار میں نے ایک ایسے نسخے سے لیے ہیں جو سمت غلط ہے۔ اور بارھویں صدی کے خاتمہ کے قریب لکھا گیا ہو گا۔ باجن پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو کو زبان دہلوی کے نام سے یاد کیا ہے۔

ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ جب اہلِ دکن نے اردو کا نام دکنی رکھا۔ اہلِ گجرات نے اس کا نام گجراتی یا گوجری رکھہ دیا۔ لطف یہ ہے کہ خود ان ممالک کے باشندے اس کو ان ناموں سے پکارتے رہے۔ شیخ محمد خوب نے مثنوی خوب ترنگ ۹۸۶ھ میں لکھی ہے۔ اس تصنیف کی زبان گجراتی کے مقابلہ میں زیادہ تر اردو کے ذیل میں داخل ہے۔ لیکن شیخ اس کو گجراتی بولی کہتے ہیں۔ شعر

جیوں دل عرب عجم کی بات   سن بولی بولی گجرات

اسی طرح شاہ علی محمد جیو گام دہنی کی "جواہر اسرار اللہ" کو اس کا مرتب شیخ حبیب اللہ قریشی الاحمدی گوجری کہتا ہے۔ چنانچہ دیباچہ میں لکھتا ہے:

"در بیان توحید و اسرار بالفاظ گوجری بطریق نظم ز موزنہ۔ دریں مختصر آوردہ و جمع کردہ"

محمد امین نے اپنی مثنوی یوسف زلیخا بعہد عالمگیر ۱۱۰۹ھ ہجری میں نظم کی ہے۔ یہ دہ چونکہ

وہ صاف دکنی اردو میں لکھ رہا ہے مگر وہ اس کو گوجری زبان کے نام سے یاد کرتا ہے ۔ چنانچہ ؎

سنو مطلب ہے اب یوا ہیں کہ   لکھی گوجری منے یوسف زلیخا

ہر یک جاگے ہے قصہ فارسی میں   ایس اس کوں انا ری گوجری میں

کر بوجھے ہر کدام اُس کی حقیقت   بڑی ہے گوجری جگ بیچ نعمت

اہالی دکن دکنی کہتے رہے اس کی متعدد امثال بہم پہنچائی جاسکتی ہیں ۔ لیکن میں صرف ایک مثال پر قناعت کرتا ہوں مثلاً شاہ ملک بیجاپوری رسالۂ احکام الصلوٰۃ" (دکنی) تالیف سنہ ۱۱۱۱ھ کے خاتمہ میں کہتے ہیں ؎

"یو مسلیاں کوں دکہنی کیا اس سبب   فہم کر کے دل میں کریں یاد سب"

پرانے مغربی مصنفین بھی اس کو لینگویج اف اندوستان یا ہندوستان اور بعد میں ہندوستانی کہنے لگے ۔ ہمارے ہاں عام خیال یہ ہے کہ انگریزوں نے یہ نام دیا ہے لیکن امر واقع یہ ہے کہ خود ہمارے اسلاف اس کو زبان ہندوستان یا بولی ہندوستان (زبان ہندوستان) کہتے رہے ۔ مولانا وجہی کتب سبرس ہیں جو بقول مولوی عبدالحق صاحب سنہ ۱۰۴۲ھ کے عنقریب بعد تصنیف ہوئی ہے ۔ اردو کو "زبان ہندوستان" کہتے ہیں :-

"آغاز داستان ۔ زبان ہندوستان ۔ نقل ۔ ایک شہر تھا ۔ اس کا ناؤں سیستان" (رسالہ اردو اورنگ آباد ص ۲۵ حصہ شانزدہم)

اردو کا سب سے قدیم نام ہندی یا ہندوی ہے ۔ اس کی ایک پرانی مثال وہ ہے

جو حضرت شاہ میراں جیؒ شمس العشاق متوفی ۹۰۲ھ کے رسالہ خوش نغز میں ملتی ہے۔ میراں جیؒ فرماتے ہیں :-

" ہیں عربی بول کیرے	در فارسی بہوتیرے	یہ ہندی بولوں سب
اس ارتوں کے سبب	یہ بھاکا بھاسو بولی	پن اس کا بھاوت کھولی
یوں گر لگہ پند پایا	تو ایسے بول چلایا	جے کوئی اچھیں خاصے
اس بیان کیرے پیاسے	دے عربی بول نجانے	تا فہ سی پہچانے
یہ ان کو بچن ہیت	منت بوجھیں بہت	یو دیکھت ہندی بول
یہ معنے ہیں نپٹ تول		

(رسالہ اردو سنہ ۱۸ حصہ بست و ششم)

اُردو کا آغاز

اب سے پیشتر میں وہ آرا نقل کر دیتا ہوں، جو ہمارے مصنفین نے اردو کے آغاز اور قدامت کے متعلق دی ہیں۔ میر امن کا بیان ہے :-

"جب اکبر شاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئیں۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال جواب کرتے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی" (باغ و بہار صہ)

سرسید کہتے ہیں :-

"جبکہ شہاب الدین شاہجہان بادشاہ ہوا۔ اور اس نے انتظام سلطنت کا کیا۔ اور سب ملکوں کے وکلا کے حاضر رہنے کا حکم دیا۔ اور دلی کو نئے سرے آباد کیا۔ اور قلعہ بنایا۔ اور شاہجہان آباد اس کا نام رکھا۔ اس وقت شہر میں تمام ملکوں کے لوگوں کا مجمع ہوا۔ ہر ایک کی گفتار رفتار جدا تھی۔ ہر ایک کا رنگ ڈھنگ نرالا تھا۔ جب آپس میں معاملہ کرتے ناچار ایک لفظ اپنی زبان کا، دو لفظ اس کی زبان کے، تین لفظ دوسرے کی زبان کے ملا کر بولتے۔ اور سودا سلف لیتے۔ رفتہ رفتہ اس زبان نے ایسی ترکیب پائی کہ بخود بخود ایک

نئی زبان ہوگئی ''

ظہیرالانشا کے مصنف کا قول ہے :-

'' ہرگاہ سریر سلطنت از جہانگیر متجاوز شدہ نوبت شاہجہان بادشاہ رسید۔ اینجا
کہ بسبب ... و معاشرت علمائے دین فی الجملہ خود داری و نشر ... بود۔ اہل زبان ریختہ معجون مرکب بسبب آمد و رفت تاجران بر دیار دہ بازار
بضرورت خرید و فروخت و معاملات داد و ستد ضروری الاستعمال شد تا زبان
یکے بفہم دیگرے در آید '' (منقول از جلوۂ خضر)

امام بخش صہبائی رسالہ قواعد اردو میں فرماتے ہیں :-

'' شاہجہان آباد تیموریہ خاندان کے شاہجہان نے آباد کیا۔ اس وقت فارسی کے
بعض الفاظ اور ہندی کے اکثر لفظوں میں کثرت استعمال کے سبب تبدیل و تغیر
واقع ہوا۔ اور اس غلط ملط سے جو بولی مروّج ہوئی۔ اس کا نام اردو ٹھہرا ''
(ماخوذ از خزینۃ العلوم)

شمس العلما محمد حسین آزاد کی رائے ہے :-

'' مسلمان بھی اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے۔ اور اس زبان کو کس
شوق اور محبت سے بولتے تھے۔ شاید بہ نسبت ہندوؤں کے فارسی عربی لفظ اُن
کی زبان پر زیادہ آتے ہونگے۔ اور جتنے یہاں رہا سہا اور استقلال زیادہ
ہوتا گیا، شاہی روز بروز فارسی ترکی نے ضعف۔ اور یہاں کی زبان نے زور

پکڑا ہوگا۔ رفتہ رفتہ شاہجہان کے زمانہ میں کہ اقبال مغلیہ کا آفتاب عین اوج پر
تھا شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلی دار الخلافہ ہوئی۔ بادشاہ اور ارکان دولت
زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہل سیف، اہل قلم، اہل حرفہ اور تجار وغیرہ ملک
ملک اور شہر شہر کے آدمی یک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے
ہیں۔ اردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی
بولی کا نام اردو ہوگیا۔" (آب حیات مصنفہ ۱۸۸۱ء)

یہ بیانات جو ہمارے تذکرہ نگار ایک دوسرے سے نقل کرتے آئے ہیں حقیقت
سے بہت دور ہیں۔ ہمیں ان کو صرف بزرگوں کے تبرک کے طور پر تسلیم کرنا چاہیئے
ورنہ کیا اکبر اور شاہجہان سے پیشتر دلی نہ تھی یا ہندو اور مسلمان نہ تھے۔ یا لوگ سودا سلف
نہیں لیتے تھے۔ یا مختلف قوموں میں ایک محاورہ سے کاروبار نہیں ہوتا تھا؟ پھر اکبر یا
شاہجہان کے عہد کے ساتھ کیا خصوصیت ہے کہ اردو کی بنیاد رکھی جائے۔ شاہجہان نئی
دلی کا قلعہ سنہ ۱۰۵۸ھ میں تیار کرتا ہے۔ محمد افضل پانی پتی متوفی ۱۰۲۵ھ شاہجہان آباد کے
آباد ہونے سے بہت پہلے اپنا دوازدہ ماہیہ یا بارہ ماسہ اردو میں تصنیف کرتا ہے۔ دکن
میں اردو ادبیات کا سلسلہ اکبر بادشاہ کی تخت نشینی سے پچیس سال قبل شروع ہو جاتا ہے
اور یہ بزرگ ہیں کہ شاہجہان آباد کے سنگ بنیاد کے ساتھ اردو کی بنیاد ڈال رہے
ہیں۔ لطف یہ ہے کہ بابر اپنے ترکی دیوان میں ایک شعر ایسا لکھ جاتا ہے جس کا ڈیڑھ
مصرعہ اردو ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

مجھ کا نہ ہوا کچ ہرس مانک و موتی

فقرا ہلیغہ بس بولنے سیدور بانی در و تی (گل رعنا)

اصل یہ ہے کہ اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہو گئی ہے جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر توطن اختیار کر لیا ہے۔ ہمارے مصنفین کا ایک اور مزعومہ خیال یہ ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔ کوئی اسے برج کی بیٹی بتاتا ہے اور کوئی اس کے دودھ سے اس کی پرورش کرتا ہے۔ میں تمثیلاً بعض کے بیانات یہاں حوالۂ قلم کرتا ہوں:

آزاد فرماتے ہیں:۔

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔ اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔ لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردہ پر ہندوستان کے ساتھ ہی آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے، اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے:

حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری رسالہ "تاج اردو" کے قدیم نمبر میں یوں گویا ہیں:۔

مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا۔ جو روز بروز بڑھتا گیا۔ اور ایک عرصہ کے بعد اردو زبان کی صورت اختیار کر لی)

اس موقع پر ہمارے مورخ یہ امر فراموش کر جاتے ہیں کہ مسلمانوں کے تعلقات

ہندوستان اور اہل ہند کے ساتھ پرتھی راج کی شکست اور فتح دہلی کے زمانے سے شروع
نہیں ہوتے۔ بلکہ ان واقعات سے کئی صدی پیشتر سے ابتدا پاتے ہیں۔ ہم عربوں کی
فتح سندھ و ملتان اور غزنوی خاندان کی فتح پنجاب کو مطلق فراموش کر جاتے ہیں۔ سندھ
پہلی صدی سے قابض تھے۔ پنجاب پر ان کا قبضہ معز الدین محمد سام
کی آمد سے ایک سو ستر سال پہلے سے تھا۔ سندھ و پنجاب میں ہندو مسلم اقوام سب سے پہلے
ملتی جلتی ہیں۔ اس لیے انہیں اگر ایک عام زبان کی ضرورت ہوئی تو ان ممالک میں پیش
آئی ہوگی۔ اور اردو کو ان ممالک میں وجود میں آنا چاہیے۔

عربوں نے جب ایران فتح کیا۔ تو سیاسی اور سرکاری اغراض کے لیے ایران کی
مختلف زبانوں سے ایک زبان کو چن لیا۔ یہ زبان مشرقی ایران میں بولی جاتی تھی۔ اگرچہ
ہم غلطی سے اس کو خطۂ فارس کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح جب مسلمان
سندھ و پنجاب پر قابض ہو گئے۔ تو یہاں بھی یہی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ اگر سندھ میں
نہیں تو پنجاب میں یقیناً انھیں کوئی نہ کوئی زبان اختیار کرنی پڑی ہے۔

جب ہم اردو کے ڈول اس کی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں۔ تو صاف
ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ڈھنگ اور ہے اور برج بھاشا کا رنگ اور ہے۔ دونوں کے
قواعد و ضوابط و اصول مختلف ہیں۔ اردو برج بھاشا کے مقابلہ میں پنجابی بالخصوص ملتانی
سے مماثلت قریبہ رکھتی ہے۔ برج سے چند ترکیبیں قبول کر لینا یا الفاظ کا مستعار
لینا دوسری بات ہے۔ لیکن جہاں برج سے اس نے الفاظ مستعار لیے ہیں۔ وہاں

برج پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ اور برج پر کیا موقوف ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اردو کے پرتو سے خالی نہیں ؛

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے اگرچہ اردو زبان بین الاقوامی ضروریات کی بنا پر وجود میں آئی۔ لیکن بہت جلد بعد وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی عام زبان بن گئی۔ اس نے ستلج پار ہو کر مسلمانوں کا دامن پکڑ لیا۔ مسلمان سپاہی، اہل بیہر و عملہ، دستکار و پیشہ ور، مزدور و فقیر، درویش و مسافر کا ساتھ دیا۔ دکن، گجرات، بنگال و بہار، جہاں کہیں وہ گئے۔ یہ ان کے ساتھ رہی اور ساتھ ہی بسی۔ ابتدا میں وہ عوام و غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان تھی۔ آخر میں اس کی ہر دلعزیزی دیکھ کر تعلیم یافتہ طبقہ نے بھی اس کی طرف توجہ کی ؛

پیشتر اس کے کہ ہم اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً مسلمانی عہد کے تاریخی واقعات پر بالخصوص جو دہلی اور پنجاب کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک نظر ڈال لیں ؛

پہلی صدی ہجری کے اواخر میں محمد بن قاسم کی فتوحات، سندھ اور ملتان کو اسلامی قلمرو میں شامل کر دیتی ہیں۔ اور اسلامی تہذیب و تمدن ان ممالک میں شائع ہو جاتے ہیں۔ لیکن تیسری صدی سے صفاریوں کی فتوحات کی بنا پر ایرانی اثرات بھی پھیل جاتے ہیں۔ اس عہد کے سیاحوں کا بیان ہے کہ یہاں کے باشندے ہندو اور مسلمان عراقی لباس پہنتے تھے۔ ہندو بھی شلوار کو استعمال کرتے تھے اور داڑھیاں رکھتے تھے۔ چوتھی صدی کے سیاح اصطخری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ملتان اور منصورہ کے باشندے فارسی اور

سندھی دونوں زبانیں بولتے تھے۔ موجودہ بلوچستان کے ایک حصہ کا نام ایرانیوں نے نوران رکھ دیا تھا۔ اس کے حاکم نشین شہر کا نام قصدار یا قزدار تھا۔ یہی شہر فارسی کی مشہور شاعرہ رابعہ بنت کعب القصداری کا جس نے استاد رودکی متوفی ۳۲۹ھ سے مشاعرات کئے ہیں۔ وطن تھا۔ ایرانیوں نے درۂ قرم کے پاس ایک شہر کا نام کرمان اور گندھارا کا نام قندہار رکھ دیا تھا۔ ملتان کے ریگستان کو دشت قبچاق۔ دریائے سندھ کو جیحوں مہران اور سندرود۔ اور دریائے چناب کو چندرود یا چمدرود کہتے تھے۔ مسعودی منصورہ کے قریب ایک شہر کا نام دوشاب بتاتا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ فارسی الاصل ہے بلکہ انھوں نے اپنے وطن کے پانچ دریاؤں کی یاد میں پانچ دریاؤں کے درمیانی علاقہ کا نام بھی پنجاب رکھ دیا تھا۔

فارسی پر ہندی اثر

اس کے برخلاف خود فارسی زبان میں ہمیں ایسے الفاظ ملتے ہیں۔ جو اسی عہد میں فارسی پر ہندی اثرات کی گواہی دیتے ہیں مثلاً لفظ بت جو بودھ کی بگڑی شکل ہے۔ یا کوتوال جو ٹھیٹ ہندی یعنی کوٹ والا بمعنی مالک قلعہ تھا۔ یہ لفظ شاہنامۂ فردوسی میں بھی موجود ہے چنانچہ

چو آگاہ شد کوتوال حصار برآویخت بارستم نامدار

صاحب شرف نامہ کہتے ہیں:۔

"و از شیخ واحدی محقق است کہ لفظ ہندی است کہ بخراسان و فارس مشہور شدہ"

ہیلاج کی بابت بھی صاحب شرف نامہ کی یہی رائے ہے وہ کہتے ہیں :-

" ایں لفظ ہندی است کہ مستعمل در فارسی شدہ است " ۔

اور لفظ بیالک کی تشریح میں کہتے ہیں :-

" در تیر شکاری دو شاخہ ایں لغت ہندی است کہ مستعمل در پارسی شدہ "

لکھن یعنی لنگھن (روزۂ ہندواں) منوچہری کے ہاں ملتا ہے ۔ شل یعنی سیل ہندی ہے ۔ اور فرخی کے ہاں ملتا ہے

بگوبہ شل افغانیاں دو پرہ و تیبند
چو و سنہ دستہ بہم نیرہائے بے سوفار

چندن فرخی اور منوچہری کے ہاں آتا ہے ۔ جسے آجکل ہم صندل کہتے ہیں ۔ برشکال دورس کال یعنی برسات کا موسم ۔ ہندی لفظ ہے ۔ مسعود سعد سلمان کے ہاں موجود ہے ۔

برشکال اے بہار ہندوستان ۔ اے نجات از بلائے تابستان

ان چند امور سے جو میں نے اوپر درج کئے ہیں ۔ واضح ہوتا ہے کہ ہندی در ایرانی تمدن کا سنگم سندھ و ملتان میں غزنوی عہد سے پیشتر ہو چکا تھا ۔

غزنوی دور میں سلطان محمود غزنوی ۳۸۸ھ ۔ ۴۲۱ھ نے ۴۱۳ھ میں لاہور پر قبضہ کر کے پنجاب کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا ۔ اس شہر کو جس کا جدید نام محمود پور رکھا گیا ۔ اپنے والی کا صدر مقام بنا دیا جس کے ماتحت فوج کی بڑی تعداد رہتی تھی ۔

مفتوحہ علاقہ مختلف ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ مثلاً جالندھر۔ جہلم۔ ملتان۔ سندھ وغیرہ
سپاہ میں زیادہ تر ترک۔ افغان۔ خلج اور ہندی تھے فوج کی تعداد کا اندازہ اس سے
ہو سکتا ہے کہ ابو النجم زریر شیبانی کے پاس جو سلطان ابراہیم غزنوی ۴۵۱ھ و ۴۹۲ھ
کے عہد کا سپہ سالار ہند تھا۔ چالیس ہزار فوج تھی۔ اس کے ماتحتوں کی فوجیں اس کے
علاوہ ہیں۔ الغرض مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد محمود کے وقت ہی سے پنجاب میں آباد ہو گئی
تھی۔ غزنوی سلطنت اگرچہ ایران و خراسان میں سلجوقیوں کے بڑھتے عروج کے سامنے
اپنے مقبوضات یکے بعد دیگرے کھو رہی تھی۔ لیکن ہندوستان میں اُن کی طاقت ترقی پر
تھی۔ ہانسی سلطان مسعود شہید نے فتح کی۔ غزنوی عہد کے والیان ہند کے حالات اور
کارناموں پر اگرچہ پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن ابو الفرج رونی کے بیانات سے معلوم ہوتا
ہے۔ کہ ابو النجم زریر شیبانی کے کارناموں نے سلطان محمود کے دور کا احیا کر دیا تھا۔
وہ ایک طرف بانرسی (بنارس) دوسری طرف سومنات پر چھاپہ مارتا ہے۔ "تانیسر
(تھانیسر) والوں کو مغلوب اور قنوج کو زیر کر چکا ہے۔ میرٹ پر اس کا قبضہ ہے۔
اور چونکہ اتنگی والی دہلی نے میرٹ کو تباہ کر دیا ہے۔ وہ انتقاماً دہلی پر حملہ کی تیاریاں
کر رہا ہے۔ یکایک سلطان ابراہیم غزنوی کی ہندوستان میں آمد نے اس کے ارادہ
کو معرض التوا میں ڈال دیا ہے۔ وہ یہ جس کی تقصیرات کا ہمیں کوئی علم نہیں باغی اور
غدار قرار دیا جاتا ہے۔ اور ایک جنگ کے بعد گرفتار ہو کر قتل کر دیا جاتا ہے۔ ابو النجم کا
جانشین شاہزادہ سیف الدولہ محمود آگرہ فتح کرتا ہے۔ سلطان مسعود ثالث ۴۹۲ھ و

۴۰۵ھ کے زمانہ میں سرستی غزنویوں کے مقبوضات میں داخل ہو جاتا ہے۔ ان امور سے ظاہر ہے کہ آل غزنہ کے مقبوضات ہندوستان میں برابر وسیع ہوتے رہے ؛

مسلمانوں کی یہ کثیر تعداد جو تجارت، فوجی و سرکاری خدمت کی غرض سے پنجاب میں ان ایام میں آباد تھی، پنجاب ہی کو اپنا وطن تصور کرنے لگی تھی۔ لاہور اس عہد کے مسلم ہندوستان کا مرکز بن گیا تھا۔ پنجاب ان کی نگاہ میں ایک فتح کردہ ملک نہیں تھا، بلکہ وہ اُس پر وطن کی حیثیت سے نظر ڈالنے لگے تھے۔ خواجہ سعد سلمان شہزادہ مجدود کے خزانچی بن کر بعہد سلطان مسعود شہید ہندوستان آئے۔ ان کے فرزند خواجہ مسعود شاعر مشہور ہیں۔ یہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ یہیں نشو و نما اور تعلیم و تربیت پائی۔ وہ اپنے حبسیات میں لاہور کو مادر وطن کے نام سے پکارتے ہیں۔ چنانچہ ؎

اے لاہور ویحک بے من چگونہ	بے آفتاب تابان روشن چگونہ
تا این عزیز فرزند از تو جدا شدہ است	با درد او بنوحہ و شیون چگونہ
تو مرغزار بودی و من شیر مرغزار	با من چگونہ بودی بے من چگونہ

دوسرے مقام پر کہتے ہیں ؎

رسید عید و من از روئے حور دلبر دور	چگونہ باشم بے روی آں بہشتی حور
چو یاد شہر اہاور و یار خویش کنم	مباد کس کہ شد از یار و شہر خویش نفور

ایک اور جگہ جب کہ حبس سے رہائی کی امید منقطع ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

کار اطلاق من چو بستہ بماند	کہ ہمیں ایزد ش نیکشاید

مرمرا حاجتے ہمی باشد — وز دلم خار شئے ہمی زاید

محملے باید از خداوندم — کہ ازو بوے لو و ہور آید

کہ ہمی زار زوے لو نادر — جان و دل در تنم ہمی ناید

لاہور کے سب سے پہلے شاعر ابو عبداللہ روزبہ بن عبداللہ النکتی اللاہوری ہیں،
جو مسعود شہید کے مداح ہیں۔ مسعود رازی سلطان محمود اور سلطان مسعود شہید کے عہد
کا شاعر ہے۔ ذوالحجہ ۴۲۲ھ[۱] کے جشن مہرگاں کے موقع پر اس نے سلطان مسعود کی مدح
میں ایک قصیدہ لکھا جس میں سلجوقیوں کے بڑھتے اقتدار کی روک تھام کے
لئے سلطان کو نصیحت کی تھی۔ یہ نصیحت سلطان پر گراں گذری۔ شاعر سے
ناراض ہوا۔ اور سزا دہی کے لئے اسے ہندوستان بھجوا دیا۔ ۱۰ جمادی الآخرہ
۴۳۲ھ کے جشن نوروز مناتے وقت شاعر کے دوستوں نے اس کی شفاعت کی۔
سلطان نے شاعر کا قصور معاف کر دیا۔ اس کے قصیدہ پر تین سو دینار صلہ دیے
اور ہزار دینار مشاہرہ بھی معاملات جہلم پر مقرر کر دیا۔ لیکن حکم دیا کہ ہندوستان ہی

۱؎ مسعود رازی کے اشعار یہ ہیں ؎

مخالفان تو موران بدند مار شدند — برآر زود ز موران مار گشتہ دمار

مدہ زمان شان زین بیش و روزگار مبر — کہ اژدہا شود ار روزگار یابد مار

(بیہقی ص ۲۴۲)

ہیں رہتے۔ استاد ابو الفرج رونی اسی شاعر کا فرزند ہے۔ رونی منسوب ہے۔ رونہ کی طرف جو لاہور کا ایک موضع بیان کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابو الفرج نے اپنی تمام عمر لاہور ہی میں گذاری۔ ضرورتاً ایک آدھ مرتبہ اس نے غزنین کا سفر کیا۔ حتیٰ کہ جو قصائد اس نے سلطان ابراہیم اور اس کے فرزند سلطان مسعود ثالث کی مدح میں لکھے ہیں۔ ایسے موقع پر لکھے ہیں۔ جب یہ سلاطین ہندوستان آئے ہیں:۔

علما میں سب سے مقدم شیخ اسمٰعیل لاہوری متوفی ۴۴۸ھ ہیں۔ جو جامع علوم ظاہری و باطنی تھے۔ آپ سادات بخارا سے ہیں۔ اور لاہور کے پہلے واعظ ۳۹۵ھ میں بخارا سے لاہور تشریف لائے۔ اور یہیں آباد ہو گئے۔ آپ کی مجالس وعظ میں خلوق کثرت سے جمع ہوتی تھی۔ ہندو ہزاروں کی تعداد میں آپ کے وعظ سُن سُن کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے پہلے جمعہ میں دو ہائی سو دوسرے میں پانچ سو پچاس اور تیسرے میں ایک ہزار ہندو مشرف بہ اسلام گئے۔

ا مسعود جس کا تخلص مسعودی ہے۔ ہندوستان میں بزمانہ امارت سیف الدولہ محمود ۴۶۹ھ کے قریب وفات پاتا ہے۔ ابو الفرج اس کا فرزند ایک قصیدہ میں سیف الدولہ محمود سے اپنے باپ کی تنخواہ پر تقرری کا ملتمس ہے ؎

کز وجہے کہ داشت مسعودی کند آنرا ملک بداں تعیین

مشائخ کے سلسلہ میں ابی الحسن بن ابو عثمان الجلابی صاحب کشف المحجوب ہیں۔ جو ۴۶۵ھ میں انتقال فرماتے ہیں۔ اور لاہور ہی میں مدفون ہیں۔ فی زماننا داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں۔ شاہ یوسف ایک بلند پایہ بزرگ ہیں۔ اور ۵۵۰ھ میں وفات پاتے ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ فخرالدین حسین زنجانی لاہوری سید احمد توختہ ترمذی لاہوری۔ سید یعقوب صدر دیوان زنجانی لاہوری کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ بزرگ قرن ششم ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاندان غزنہ کے دو بادشاہ خسرو شاہ متوفی ۵۵۵ھ اور خسرو ملک متوفی ۵۸۲ھ لاہور ہی کو اپنا دارالسلطنت بنا لیتے ہیں۔

باوجودیکہ اس عہد کی تاریخ مفقود ہے۔ ان چند ناموں سے جو اوپر درج ہیں یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ لاہور ان ایام میں ایک بارونق اسلامی شہر اور مرجع علم و فضل و ادب بن گیا تھا۔

آلِ غزنہ کی حکومت ہندوستان میں کم و بیش ایک سو ستر سال تک رہی ہے۔ اس عرصہ میں مسلمان اور ہندو اقوام کی یکجائی سے ایک نئی زبان کا پیدا ہو جانا لازمی بات ہے۔ سرکاری ضروریات کی بنا پر بھی شاہی عہدہ داروں اور ملازمین کے لئے اس ملک کی زبان سے واقف ہونا ضروری تھا۔ آخر غزنویوں کے قبضہ میں تمام پنجاب۔ سندھ اور ملتان تھا۔ ہانسی۔ سرستی اور میرٹھ تک اُن کے قبضہ میں تھے۔ بلکہ یوں کہیئے۔ دہلی کے قریب تک پھیلے ہوئے تھے۔ اتنے بڑے علاقہ کے

ابوریحان البیرونی

مالی و ملکی انتظام کے لئے عمّال کو اس ملک کی زبان سیکھنی ضروری تھی۔ چونکہ لاہور ہند کا
دارالسلطنت تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس خطہ کی زبان کو اس عہد کی حکومت
اور مسلمانوں نے ترجیح دی ہو گی۔ یہ خیال کرنا کہ جب تک مسلمان پنجاب میں آباد
رہے۔ انہوں نے کسی ہندی زبان سے سروکار نہ رکھا۔ اور جب پنجاب سے
دہلی گئے۔ تب برج بھاشا اختیار کی۔ ایک ناقابل قبول خیال ہے جو عقل و روایت
کے منافی ہے۔ اس لئے کہ ان کو نہ صرف سرکاری ضروریات کی بنا پر ایسی زبان کی
ضرورت تھی۔ بلکہ خود مسلمانوں کی اقوام کو بھی ایک دوسرے سے مبادلۂ خیالات
کے لئے اس کی ضرورت تھی تعلیم یافتہ گروہ کے لئے یہ مشکل فارسی نے حل کر
دی تھی لیکن ان کا غیر تعلیم یافتہ طبقہ جو ان کی آبادی کا جزو اعظم تھا۔ فارسی سے قطعاً
نابلد تھا۔ یہ مسلمان چونکہ تازہ ولایت تھے۔ انھوں نے اس کا نام ہندی رکھ دیا۔
خود غزنویوں نے شروع ہی سے ہندی زبان کی طرف توجہ دی تھی۔ ان میں ابو
ریحان محمد بن احمد البیرونی قابل ذکر ہے۔ یہ ابتدا میں ابوالعباس مامون خوارزمشاہ
کے دربار سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن مامون کے قتل کے بعد ۴۰۸ھ میں سلطان
محمود کے ہمراہ غزنین چلا گیا۔ بیرونی محمود کے غزوات میں شریک رہا ہے اور ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ ایک عرصہ تک اس کا قیام لاہور اور ملتان میں رہا ہے۔ اس نے
ہندی اور سنسکرت زبان سیکھی۔ اور ہندوؤں کے مذاہب اور علوم مثلاً ہیئت
نجوم و ریاضی، جغرافیہ و فلکیات پر کماحقہ عبور حاصل کیا۔ عربی سے سنسکرت

ہیں اور سنسکرت سے عربی میں متعدد کتابیں ترجمہ کیں۔ عربی میں جو ترجمہ کیں۔ ان کے نام سنکیا اور پتنجلی ہیں۔ لیکن البیرونی کی سب سے ضروری کتاب تاریخ الہند ہے۔ جو اہل ہند کے اس عہد کے علوم کی قاموس ہے؛

محمود کے زمانہ میں ہندی زبان کے ترجمانوں کی ایک جماعت غزنین میں مقیم تھی۔ ان میں تلک ہندی اور بہرام کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔ تلک دراصل ایک حجام تھا۔ ہندی اور فارسی زبانوں میں بخوبی ماہر تھا۔ کشمیر میں تربیت پائی تھی۔ خط ہندی و فارسی نہایت اعلےٰ لکھتا تھا۔ ترجمانی سے ترقی کر کے ہندو افواج کے سپہ سالار (غزنین میں ہندوؤں کی فوج بھی رہا کرتی تھی) سندر کی وفات پر سلطان مسعود شہید نے اسے سپہ سالار بنا دیا۔ تلک نے بالآخر اس قدر عروج پایا۔ کہ سلطان نے ینال تگین سپہ سالار ہند کی سرکوبی کے لیے جو باغی ہو گیا تھا۔ تلک ہی کو مقرر کیا۔ اور تلک نے ہندوستان آ کر اور کئی شکستیں دے کر ینال تگین کو قتل کر دیا۔

کوئی تعجب نہیں اگر خود سلطان محمود ہندی زبان سے کسی قدر آشنا ہو۔ کیونکہ جب سنہ ۴۱۳ھ کی مہم میں سلطان کالنجر پہنچتا ہے۔ نندا کالنجر کا راجہ سلطان کی مدح میں ہندی شعر لکھ کر بھیجتا ہے۔ سلطان فضلائے ہند و عرب کو یہ اشعار دکھاتا ہے اور سب ان اشعار کی توصیف میں رطب اللسان ہوتے ہیں۔ سلطان ان اشعار سے اس قدر خوش ہوتا ہے کہ صلہ میں نندا کو پندرہ قلعوں کی حکومت کا پٹہ لکھ دیتا ہے۔ جن میں کالنجر بھی شامل تھا؛

بدقسمتی سے اس عہد کی تاریخ پر ایسا پردہ پڑا ہوا ہے۔ کہ ہم ان ایام کے سیاسی حالات سے بھی بخوبی واقف نہیں۔ چہ جائیکہ معاشی۔ اقتصادی اور ادبی پہلو کے حالات ملیں۔ لیکن ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ پنجاب کے میدانوں میں مسلمان حملہ آور بہت جلد سیاسی منافرت کے باوجود ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہنے بسنے اور ان کے ساتھ اختلاط و ارتباط قائم کرنے لگے ہیں۔

حکیم سنائی متوفی ۵۴۵ھ کے متعلق ہم اسی قدر جانتے ہیں کہ وہ صوفی شاعر ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان بھی آئے ہیں اور کسی قدر ہندی زبان سے بھی واقف ہیں۔ ایک شعر میں پانی کے لفظ کو اس طرح استعمال کر گئے ہیں۔ گویا کہ فارسی زبان کا لفظ ہے ؎

نہ در آں معدہ خمدہ و میدہ   نہ در آں دیدہ قطرۂ پانی

عثمان مختاری غزنوی بھی ہندوستان آئے ہیں۔ انھوں نے والی سندھ اور محمود روباہی والی ہند کی مدح میں قصائد لکھے ہیں۔ ایک موقع پر بازار سے ایک غلام خریدتے ہیں۔ اس کے ذکر میں ایک شعر میں دو ہندی لفظ باندھ گئے ہیں۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے ؎

یکے غلامکے ہندی خریدم از بازار   بداں بہا کہ ز گفتار آنم آید عار

دردہ شعر یہ ہے ؎

ز من بدیدے باعسے بجستے گتے چوں مگس ببیدے بر من نشستہ گھتے مار

اس شعر میں چوں اور مار دونوں ہندی لفظ ہیں؛

لیکن یہ خواجہ مسعود سعد سلمان ہیں جن کے متعلق متقدمین و متاخرین متفقاً کہتے ہیں کہ وہ ہندی میں بھی صاحب دیوان تھے۔ مجھ کو ان کی ہندی شعر گوئی کے متعلق شبہ تھا۔ کیونکہ جہاں وہ اپنی فارسی و عربی زبان دانی پر اپنے قصائد میں فخر کرتے ہیں سنسکرت یا ہندی کا ذکر نہیں کرتے۔ مثلاً ؎

خواجہ مسعود سعد سلمان

مرا بداں تو کہ در پارسی و در تازی　　بنظم و نثر ندارد چو من کس استقلال

دوسرے موقع پر کہا ہے ؎

کس از بپارسی و تازی امتحان نزد مے　　مرا ببار زمیدان امتحان شد مے

تیسرے موقع پر کہا ہے ؎

بریں ہر دو زبان اندر ہو میدان　　بگردونم رسیدہ کامرانی

سجود آرد بہ پیش خاطر من　　روان رودکی و ام ہانی

لیکن جہاں محمد عوفی کہتا ہے ؎

"و او را سہ دیوان ست یکے بتازی و یکے بپارسی و یکے بہندوی" (لباب الالباب محمد عوفی صفحہ ۲۴۶ جلد دوم۔)

عوفی کے ساتھ امیر خسرو بھی فرماتے ہیں:-

"پیش ازیں از شاہان سخن کسے را سہ دیوان نبود مگر مرا کہ خسرو ممالک کلامم مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست آما آں سہ دیوان در عبارت عربی و فارسی

وہندوی است ۔ در پارسی مجرد کسے سخن راسہ قسم نکردہ جز من کہ دریں کار

قسام و عادلم ۔ (دیباچہ غرۃ الکمال صـ۲۶)

اس لیئے ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ خواجہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔ مگر بد قسمتی سے ان کا ہندی کلام دستبرد زمانہ کے ہاتھوں شاید ہمیشہ کے لئے برباد ہو گیا۔ خواجہ سعد سلمان برابر ساٹھ سال تک ہندوستان میں رہے۔ خواجہ مسعود یہیں پیدا ہوئے اور یہیں رہے۔ مسعود ثالث کے عہد میں مقطع جالندھر تھے۔ قصدار میں بھی رہے ہیں۔ لاہور ان کا وطن ہے۔ اور جس محبت کے ساتھ وہ اس وطن کا ذکر کرتے ہیں۔ ان اشعار سے ظاہر ہے جو اس سے پیشتر نقل ہو چکے ہیں۔ اس لیئے اگر انھوں نے اپنے وطن کی زبان میں اشعار لکھے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ خواجہ کے دیوان فارسی میں بعض باتیں ایسی موجود ہیں۔ جن کو ہندوستان کا پرتو مانا جا سکتا ہے:۔

(۱) فارسی زبان میں بارہ ماسہ کی صنف کی نظموں کا رواج نہیں ہے۔ اور نہ سنسکرت میں ایسی نظمیں موجود ہیں۔ ادھر اُردو، پنجابی، اور ہندی میں اب سے بیس سال قبل تک بارہ ماسوں کا بکثرت رواج تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے۔ کہ خواجہ نے دوازدہ ماہہ لکھنے میں جسے غزلیات شہوریہ کے نام سے یاد کرتے ہیں پنجابی کی تقلید کی ہے۔ یا بارہ ماسے خود انہی کی ایجاد ہیں۔ ہندی میں سب سے قدیم بارہ ماسہ وہ ہے۔ جو کبیر کی طرف منسوب ہے۔ ہندی کے بارہ ماسوں میں

ایک ہجراں دیدہ عورت کی کہانی بالعموم دی جاتی ہے۔ جو خود اپنے فراق کی داستان الم حسرت ناک الفاظ میں سناتی ہے۔ خواجہ مسعود کے ہاں دوازدہ ماہہ صرف مدحیہ ہے۔ اور مہینے کی خوشگواری کا ذکر کرکے شراب کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس شہود یہ میں ان کا ممدوح شاہ ارسلان بن مسعود متوفی ۵۱۲ھ ہے۔ اور ہر مہینے کی غزل کی بحر مختلف ہے ؛

(۲) دوازدہ ماہہ کے ساتھ غزلیات ایامیہ اور غزلیات اسبوعیہ کا ذکر بھی مناسب ہے۔ غزلیات ایامیہ میں ہر غزل فارسی ماہ کے دنوں کے نام پر لکھی گئی ہے۔ اور بدستور ارسلان بن مسعود کی مدح میں ہے۔ غزلیات اسبوعیہ ہفتہ کے دنوں کے نام پر ہیں۔ اور حسب معمول ارسلان کی مدح میں ہیں ؛

(۳) انھوں نے قطعات شہر آشوب بھی لکھے ہیں۔ جن میں پیشہ وروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ امیر خسرو نے بھی شہر آشوب لکھا ہے۔ سنا جاتا ہے۔ کہ سنسکرت میں بھی اس قسم کی نظمیں ہوتی ہیں ؛

اس قسم کی نظمیں فارسی ادبیات میں موجود نہیں ہیں۔ اور خواجہ مسعود ان امور میں تمام شعرائے ایران سے منفرد ہیں۔ کیا اس کو ہندوستان کا اثر تسلیم کیا جائے یا خواجہ کی ایجاد مانا جائے۔ خواجہ نے ایک شعر میں ایک ہندی محاورہ بھی استعمال کیا ہے ـــ

چو عدو ابر بغرید کوس محمودی   بر آمد از میں دیوار حصن مارا مار

سلطان معزالدین محمد بن سام ۵۸۲ھ میں لاہور فتح کرتا ہے۔ اور آل ناصر کا آخری
تاجدار خسرو ملک قید ہو کر سلطان غیاث الدین کے پاس غور پہنچا دیا جاتا ہے۔
فاتح دہلی کی سمت بغرض تسخیر نگاہ ڈالتا ہے۔ ترائن کی جنگ میں رائے پتھورا
کی شکست کے بعد مسلمانوں کا قبضہ اجمیر پر ہو جاتا ہے۔ قطب الدین ایبک
۵۸۹ھ میں دہلی اور میرٹھ پر قابض ہو جاتا ہے۔ دہلی کے قبضہ کے بعد پایہ تخت
لاہور و کہرام سے تبدیل ہو کر دہلی آ جاتا ہے۔ جس طرح ہماری یادداشت
میں انگریزی حکومت نے اپنا دارالسلطنت کلکتہ سے دہلی تبدیل کر لیا۔ یہی
صورت اس وقت بھی پیش آئی لیکن اس کی اس تبدیلی میں بے حد فرق ہے۔
آج صرف اسی قدر ہوا ہے۔ کہ وائسرائے ہند کلکتہ کے بجائے دہلی رہنے لگے۔
اور نئی عمارات ان کے دفتروں کے لیے بنا دی گئیں۔ لیکن ان ایام میں اس
تبدیلی کا مطلب یہ تھا۔ کہ لاکھوں انسان پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی اور اس کے
نواح میں آباد ہو گئے۔ تمام فوج اور اہل دیوان مع ان کے متعلقین و قبائل کے
ہجرت کر کے چلے آئے۔ ہمیں اس عہد کی معاشرت کا یہ پہلو یاد رکھنا چاہیے۔ کہ
انسان مختلف قبائل میں منقسم تھے۔ حکومت کا تعلق براہ راست قبیلہ سے نہیں
ہوتا تھا۔ بلکہ قبیلہ کے رئیس کے ساتھ۔ رئیس قبیلہ کی عزت و قوت قبیلہ کے
ارکان کی تعداد اور وجاہت پر منحصر ہوتی تھی۔ ایک قبیلہ جس قدر طاقتور ہے اسکے

مطابق اس کے سردار کی عزت ہے۔ حکومت اپنی فوجیں انہی قبیلوں سے بھرتی کرتی تھی۔ اور قبیلہ کا سردار ہی اکثر ان کا افسر ہوا کرتا تھا۔ سلطنت غزنین کی فوجوں میں زیادہ عنصر ترکوں، خلجیوں، افغانوں اور ہندستوں کا تھا۔ ملتان کی وادیوں میں جیپال کی شکست کے بعد خلج اور افغان قومیں جو افغانستان کے پہاڑوں میں آباد تھیں۔ ناصرالدین سبکتگین کی مطیع ہوئیں۔ اور کثیر تعداد میں اس کی فوج میں بھرتی ہو گئیں۔ خلج ان ایام میں افغانوں سے زیادہ طاقتور تھے۔ اور افغانوں کی ہمسائیگی میں آباد تھے۔ ان کی اصل ترک ہے۔ غلاموں کے عہد میں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ قوم ساری کی ساری ہندوستان کی طرف ہجرت کر آتی ہے۔ اور مختلف مقامات میں آباد ہو جاتی ہے۔ پرانے زمانے میں خلجی پور نام کے بیسیوں قصبے اور موضعے نظر آتے ہیں۔ قیاس میں آتا ہے کہ اسی قوم کے آباد کردہ ہونگے۔ یہی لوگ بہار و بنگال فتح کرتے ہیں۔ جہاں ایک علیحدہ سلطنت کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ بنگال میں ان کی سلطنت اگرچہ دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ لیکن سیاسی لحاظ سے وہ اس قدر طاقتور تھے۔ کہ غلاموں کے بعد تخت ہندوستان کے یہی وارث بنتے ہیں۔ اور مالوہ میں علیحدہ سلطنت قائم کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے اصلی وطن افغانستان میں خلجیوں کا نام نہیں سنا جاتا۔ خلجی کس زمانہ میں اسلام لائے تاریخ اس بارہ میں خاموش ہے ؛

افغان ہندوستان کے مغربی پہاڑوں میں دریائے سندھ تک آباد تھے۔

افغان البیرونی ایک مقام پر ان کو افغانوں کے نام سے یاد کرتا ہے۔ دوسرے مقام پر ہندو لکھتا ہے۔ ابوالفرج رونی افغانوں اور جاٹوں کو مشرک کہہ رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے افغان ان ایام میں تابع اسلام نہیں تھے۔ سیاسی اعتبار سے افغان ہر زمانہ میں اہمیت رکھتے تھے۔ سلطان محمود نے دو مرتبہ ان کی گوشمالی کی ہے۔ مسعود شہید نے اُن کے خلاف فوج بھیجی ہے۔ مسعود ثالث نے بھی ان کو سزا دی ہے لیکن ہندوستان میں اگرچہ فوجوں میں ہمیشہ بھرتی ہوتے تھے تغلقوں کے عہد میں وقعت حاصل کرتے ہیں۔ اگرچہ خلجیوں کی طرح افغان بڑی تعداد میں ہندوستان کی طرف ہجرت نہیں کرتے۔ تاہم ایک معتد بہ تعداد ان کی ہر زمانہ میں یہاں موجود رہتی ہے۔ دہلی سے چار کوس کے فاصلہ پر افغان پور ایک قصبہ تھا۔ جو غلاموں کے زمانہ میں آباد ہوا تھا۔ اور اس میں افغان ہی آباد تھے ٭

خطۂ پنجاب کے باشندے اپنے قد و قامت اور طبعی جرأت کی بنا پر فوجی خدمات کے لئے بہت موزون اور مناسب ہیں۔ اس لئے سلطان محمود نے جو فوج ہندوؤں سے انتخاب کی۔ وہ تمام پنجابی تھی۔ اس کے جانشین بھی پنجابی فوجیں رکھتے تھے۔ جب دہلی کی طرف مہاجرت ہوتی ہے۔ تو ایک بڑی تعداد ان پنجابیوں کی بھی تھی۔ انہی ایام میں ملتانی لوگ بھی جوق جوق جاکر دہلی میں آباد ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بعض تجارت کرتے ہیں۔ ممالک غیر سے براہ راست ان کے تعلقات تھے۔ تاریخ میں سب سے پہلے ان ملتانیوں کا ذکر غیاث الدین بلبن کے عہد میں

ملتا ہے ۔ وہ ساہوکارہ کا کام بھی کرتے تھے ۔ امرا اور ٹھاکر کو روپیہ قرض دیا کرتے تھے ۔ اور اپنی دولتمندی کے لئے ضرب المثل تھے ۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں وہ سلطنت کے معاملات میں بھی دخیل ہیں ۔ بعض ان میں سے بڑے بڑے عہدوں کے مالک ہیں ۔ مثلاً ایب خان امیر ملتانی ۔ ملک عین الملک ملتانی اور خواجہ حمید الدین ملک التجار ملتانی جو بعد میں قاضی شہر دہلی بنا دئے گئے ۔ اور ملک فضل اللہ ملتانی ۔ بعض مشاہیر علما اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے ۔ جن کے فضل و شہرت کی بنا پر تاریخ میں ان کے نام مذکور ہیں ۔ مثلاً مولانا محب ملتانی قدیم ۔ اور مولانا شہاب الدین ملتانی ۔ سرائے عدل علاء الدین کے کپڑے کی منڈی تمام تر ملتانی تاجروں کے قبضہ میں تھی سلطنت نے بیس لاکھ روپیہ کپڑے کا نرخ ارزاں کرنے کے لیے یک مشت ان کو دیا گیا تھا ۔

جب معز الدین اور اس کے والی قطب الدین ایبک نے چند سال کے عرصہ میں اجمیر ۔ ہانسی ۔ سرستی ۔ کہرام ۔ میرٹھ ۔ دہلی ۔ بدایوں ۔ قنوج ۔ بنارس ۔ بہروالہ تھنگر ۔ گوالیر ۔ کالنجر ۔ اور رھ اور مالوہ فتح کر لئے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس نئے علاقہ کے انتظام کے لئے ان کو کس قدر آدمی درکار ہوئے ہونگے ۔ کیونکہ ظاہر ہے ۔ کہ ان میں سے ہر شہر میں ان کو اپنی جمعیت رکھنی پڑی ہوگی ۔ چاروں طرف طاقتور ہندو راجہ موجود تھے ۔ جن کو قدرتاً مسلمانوں سے عداوت تھی ۔ اس لئے ہمیں ماننا پڑیگا ۔ کہ ان ایام میں شمال سے لوگ بڑی تعداد میں ہجرت کر کے ہندوستان کی طرف

چلے گئے ہیں - اور ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ لاہور چونکہ پرانا دارالسلطنت تھا۔ اسلئے ضروری ہوا کہ یہاں کے لوگ تبدیل دارالسلطنت کے وقت بتقریب ملازمت و تجارت و دیگر خدمات زیادہ تعداد میں جائیں ؛

قطب الدین ایبک کے ساتھ جو لوگ ہجرت کر کے دہلی آگئے ہیں - اگرچہ یوں تو ان میں مختلف اقوام شامل تھیں مثلاً ترک (جو بڑے عہدوں پر ممتاز تھے) خراسانی جو مناصب دیوانی پر سرفراز تھے - خلج - افغان اور پنجابی - لیکن ان میں زیادہ تعداد مؤخرالذکر کی تھی - جو فوجی اور دیوانی خدمات کے علاوہ زندگی کے اور پیشوں اور شعبوں پر بھی متصرف تھے - اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے اگر کوئی نئی زبان نہیں بنی تھی - تو غزنوی دور میں جو ایک سو ستر سال پر حاوی ہے - ایسی مخلوط بین الاقوامی زبان ظہور پذیر ہو سکتی ہے - اور چونکہ پنجاب میں بنی ہے - اس لئے ضروری ہے کہ وہ یا تو موجودہ پنجابی کے مماثل ہو یا اس کی قریبی رشتہ دار ہو بہرحال قطب الدین کے فوجی اور دیگر متوسلین پنجاب سے کوئی ایسی زبان اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوتے ہیں - جس میں خود مسلمان قومیں ایک دوسرے سے تکلم کر سکیں - اور ساتھ ہی ہندو اقوام بھی اس کو سمجھ سکیں - اور جس کو قیام پنجاب کے زمانہ میں وہ بولتے رہے ہیں ؛

دہلی میں آباد ہونے کے بہت جلد بعد ان نو آبادکاروں میں ہندی زبان کمال پیدا ہونے لگتے ہیں - تاج الدین سنگریزہ جو التمش ۶۳۳ھ اور اس کے اسباط کا مداح ہے - دہلی کا پہلا شاعر نورس ہے - جو ہمیں معلوم ہے - وہ اپنے کمال اور ہندوستان زبانی

کے متعلق ایک شعر میں گویا ہے ؎

مولد و منشاء میں در خاک ہندوستان است ‎ نظم و نثرم ہمیں کہ با آب خراسانی مدہ است

ایک شعر میں دو ہندی لفظ بیرا اور مِن باندھ گیا ہے۔ وھوہٰذا ؎

بیرا زمئے ندیم مرا بیر کن بر طل ‎ بگذر ازیں حدیث کہ یک بیر دیک من است

غلاموں اور ان کے جانشین خلجیوں کے دور میں پنجاب کو اس عہد کی سیاسی وجوہ کی بنا پر زبردست اہمیت حاصل ہو گئی تھی یعنی چنگیزی مغلوں کے حملے بار بار ہند پر ہوتے تھے۔ ان حملوں کی روک تھام کیلئے سلاطین دہلی حکومت ملتان و دیپال پور کے لئے اکثر تجربہ کار و بہادر سپہ سالار یا ولیعہد سلطنت کو نامزد کرتے تھے۔ جو ایک بڑی فوج کے ساتھ ہر وقت ان کے مقابلہ کے لئے طیار رہتا تھا۔ چنانچہ شمس الدین التمش نے اپنے فرزند رکن الدین فیروز شاہ کو ریاست لاہور دی۔ ناصر الدین محمود نے شیر خان کو جو ایک مشہور جنگ آزما تھا۔ پنجاب کا حاکم بنایا۔ غیاث الدین بلبن نے اپنے ولیعہد سلطان محمد شہید کو ایالت ملتان و لاہور دی۔ چنانچہ مغلوں کے ہاتھ سے یہ شہزادہ جنگ میں مارا گیا۔ اس کا فرزند شہزادہ کیخسرو اس کا جانشین بنایا جاتا ہے۔ جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے اپنے ولیعہد ارکلی خان کو حاکم لاہور و ملتان و سندھ مقرر کیا تھا۔ علاء الدین کے عہد میں ملک نصرت الدین ظفر خان اور بعد میں غازی ملک تغلق والئے پنجاب ہوئے۔ اوّل الذکر مغلوں کے ہاتھ سے ہی شہید ہوتا ہے۔ غازی ملک تغلق کے پنجاب کے ساتھ گہرے تعلقات ہیں۔ بقول ابن بطوطہ وہ اتراک قرونہ سے تھا۔

بقول فرشتہ اس کا باپ ملک تغلق غیاث الدین بلبن کا غلام تھا۔ اور پنجاب کے جاٹوں میں اُس نے شادی کی تھی۔ جس سے غازی ملک تغلق پیدا ہوا۔ اس طرح غازی ملک پنجابی ہے۔ ان ایام میں ہندو اپنی بیٹیاں مسلمانوں کو بیاہ دیا کرتے تھے۔ اس خاندان نے اکثر شادیاں ہندوؤں میں کی ہیں۔ فیروز شاہ تغلق کی ماں بھی رانامل بھٹی والی ابوہر کی دختر تھی۔ غازی ملک کا تمام وقت پنجاب میں گذرا۔ اور قطب الدین مبارک شاہ کے آخر عہد تک والی دیپالپور رہا اس عرصہ میں مغل حملہ آوروں سے بیس مرتبہ اس نے جنگیں کیں۔ اور ہر جنگ میں ان کو ہزیمت دی۔ جب خسرو نمک حرام نے غداری کر کے خلجی خاندان کے تمام افراد کو قتل کر دیا۔ اور خود تخت دہلی پر قابض ہو گیا۔ غازی ملک کی رگِ حمیت حرکت میں آئی۔ وہ ایک بڑی فوج کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھا۔ اور خسرو نمک حرام سے اپنے آقاؤں کے خون کا بدلہ لے کر عام خواہش کے مطابق ۷۲۰ھ میں بادشاہ ہندوستان بن گیا۔ اور غیاث الدین تغلق کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوا۔ یہ اُس کے افعال شریفہ کا انعام تھا۔ کہ غازی کو تخت ہندوستان مل گیا۔ لیکن ہمارے لئے سب سے زیادہ دلچسپی کا امر یہ ہے کہ غیاث الدین پنجابیوں کے لشکر کے ساتھ دہلی میں داخل ہوتا ہے۔ جس نے وہاں آباد ہو کر دہلی کی زبان پر بے حد اثر ڈالا ہو گا۔ اور دہلی کے کوچہ و بازار میں ہر طرف پنجابی اور پنجابی بولنے والے نظر آتے ہونگے جب تاتاریوں کی فتح نے انگریزی زبان پر ایک نہ مٹنے والا اثر ڈالا اور ہمیشہ کے لیے اس کی رفتار

کو بدل دیا تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ دہلی پران پنجابیوں نے کس قدر اثر ڈالا ہوگا۔ جو دیپال پور سے اٹھ کر دہلی آباد ہونے کے لئے آ گئے تھے۔ اگرچہ دہلی کے مسلمان اس سے بیشتر بھی کوئی ایسی ہی زبان بول رہے تھے۔ جو ان دیپال پوریوں کی زبان کے بہت قریب تھی ؎۱

تغلقوں کے عہد میں دہلی میں جس قسم کی زبان بولی جاتی تھی۔ اگر ہم کو اس کے نمونے دیکھنا ہیں۔ تو قدیم دکنی اردو کے ادبیات دیکھنے چاہئیں۔ جو اس زبان کے بہت قریب ہیں۔ دکنی زبان میں شعر و شاعری کا آغاز اواخر قرن نہم سے شروع ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ اس عہد تک کی بعض تصنیفات ہم کو مل جاتی ہیں۔ ان میں سب سے قدیم میرانجی شمس العشاق کی تصنیفات ہیں:

خلجیوں نے دکن سب سے پہلے آباد کیا۔ اور اردو مسلمانی فتوحات کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ لیکن یہ غیاث الدین کا فرزند محمد تغلق ۷۲۵ھ ہے۔ جو دہلی کی زبان کر دولت آباد پہنچاتا ہے۔ محمد تغلق کو عالمگیر کی طرح دکن سے بے حد شغف تھا۔ شہزادگی کے زمانہ میں بچشم خود دیکھ آیا تھا۔ ورنگل اس نے دوبارہ فتح کیا ہے۔ دولت آباد کے قدرتی استحکام نے اس کے دل پر بے حد اثر ڈالا۔ یہ شہر اس کے نزدیک دارالسلطنت ہند کے لیے زیادہ مناسب اور مرکزی تھا۔ وہاں سے دہلی۔ گجرات لکھنوتی۔ ستگانو۔ سنارگانوں۔ تلنگانہ معبر۔ دہور سمندر اور کنپلہ وغیرہ ایک ہی مسافت پر آ جاتے تھے۔ اس لیے ۷۲۷ھ میں ایک صبح اس نے یہ اعلان کر دیا۔ کہ رعایا سے

دہلی مع ان قصبات کے لوگوں کے جو دہلی سے چار چار کوس کے اندر واقع تھے۔ تمام کمال امیر و غریب پیر و جوان مع زن و بچہ کنیز و غلام دولت آباد کی طرف کوچ کریں۔ شہر و نواحی کو یہ پر شر با حکم ملا۔ اور حکم کے ملتے ہی اس کی تعمیل شروع ہو گئی۔ شاہی فرمان اس قدر سخت تھا کہ شہر و قصبہ کے انسان تو انسان بلی کتے تک فراموش نہیں ہوئے تھے۔ ان ایام میں دہلی کے گرد و اطراف میں بے حد قریات و قصبات آباد تھے۔ لوگ اپنی زمینیں۔ جائداد اور آباد گھر چھوڑ کر تعمیل فرمان میں روانہ دکن ہوئے۔ سلطنت نے مسافروں کی سہولت کے لئے کسی قدر انتظام بھی کیا۔ اور زر راہ بھی محتاجوں اور بے استطاعتوں کو ملا۔ لیکن دہلی کی آرام طلب اور خانہ دوست رعیت کو یہ سفر راس نہ آیا۔ اور بہت سے راستہ میں تلف ہو گئے۔ چند سال کے بعد سلطان نے فرمان عام جاری کر دیا کہ جس کا جی چاہے دہلی چلا جائے اور جس کا جی چاہے دولت آباد میں رہے۔ اس حکم پر بعض صاحب استطاعت واپس چلے گئے۔ لیکن ایک بڑا حصہ مرہٹواڑی ہی میں رہ پڑا۔ اور آباد ہو گیا۔ اس طرح دہلی کی زبان دکن پہنچ گئی۔ محمد تغلق کے آخر زمانہ سلطنت میں امیران صدہ نے دکن میں بغاوت کر دی۔ موت نے بادشاہ کو اتنی مہلت نہ دی کہ باغیوں کی سرکوبی کرتا۔ ۷۴۸ھ میں حسن گنگوہ علاء الدین شاہ کے نام سے بادشاہ دکن بن گیا۔ اور تقریباً دو سو سال تک بہمنی خاندان دکن میں حکومت کرتا رہا۔ اور ۹۳۳ھ میں ختم ہوا۔ یہ پہلا افغان خاندان ہے جو ممالک ہند میں سریر آرا ہوتا ہے

بہمنیوں کی میراث پانچ سلطنتوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ (۱) عماد شاہی جسے ۹۸۲ھ میں نظام شاہی برباد کرتے ہیں (۲) نظام شاہی جنہیں اکبر کی فوجیں ۱۰۴۲ھ میں فتح کر لیتی ہیں (۳) برید شاہی جو ۱۰۱۸ھ تک حکمرانی کرتا ہے (۴) عادل شاہی ان کو ۱۰۹۷ھ میں عالمگیر فتح کر لیتا ہے (۵) قطب شاہی ۱۰۹۸ھ میں عالمگیر ان کا علاقہ اپنی قلمرو میں شامل کر لیتا ہے۔ جو سلطنتیں ان میں طاقتور اور ممتاز تھیں اور جن کے زمانہ میں اردو ادبیات کو فروغ ہوتا ہے۔ قطب شاہی اور عادل شاہی ہیں۔ تین سو پچاس سال کے بعد ان علاقوں کا دہلی کے ساتھ الحاق ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں دہلی سے دکنیوں کا براہ راست کوئی تعلق نہیں رہا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ دکنی اردو متعدد امور میں جو بعض صرف و نحو سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور بعض محاورہ سے مختلف ہو گئی۔ اسی امتیاز کے ظاہر کرنے کے لئے اہل علم نے ایک کا دکنی اور دوسری کا نام اردو سے معلیٰ رکھ دیا۔ لیکن یہ فرق ان زبانوں میں کیوں آ گیا۔ اس کا جواب یہی ہے۔ کہ دکنی تغلقوں کے عہد کی زبان کی جو دہلی میں بولی جاتی تھی۔ تقلید کر رہے ہیں۔ ادھر اردو زبان دہلی میں آنے والے سیاسی واقعات اور ماحول سے برابر متاثر ہوتی رہی۔ اس لئے ایک یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ تغلقوں کے زمانہ سے پیشتر ہی اردو ایک علحدہ اور مستقل زبان بن چکی تھی۔ اور اس نے اپنی صرف و نحو کے قواعد علحدہ مقرر کر لئے تھے۔ ممالک گجرات اور دکن دوسرے لفظوں میں بمبئی پریسیڈنسی (علاوہ سندھ) اور مدراس پریسیڈنسی کے اہل اسلام میں جو زبان رائج ہے۔ وہ یہی دکنی ہے۔ اور دونوں

پر پسندیدہ نسلوں کی زبان میں بہت کم فرق ہے ورجہ فرق ہے اس قابل نہیں کہ بیان کیا جائے۔ اسکی وجہ بھی تاریخی ہے۔ خلجی گجرات کو دوبارہ فتح کرتے ہیں لیکن محمد تغلق کے جانشین سلطان فیروز شاہ متوفی ۷۹۰ھ کے بعد گجرات نے دکن کی تقلید کرکے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اور تقریباً دو سو سال تک گجرات دہلی سے علیحدہ رہا۔ ۹۸۰ھ میں جلال الدین اکبر نے دوبارہ اس کو فتح کیا۔ جس قسم کی اردو گجراتیوں نے تغلقوں سے سیکھی تھی۔ وہ اسی پر قائم رہے۔ اس کے علاوہ دکن اور گجرات ہمسایہ ممالک ہیں۔ اور ان میں تعلقات بھی قائم تھے۔ قصہ مختصر یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر گجرات اور دکن میں ایک ہی زبان رائج ہے۔ گجراتی اردو میں بھی دسویں صدی سے تصنیفات شروع ہونے لگی تھیں؛

خضر خان

پنجاب ایک مرتبہ اور خضر خاں کی صورت میں دہلی پر حملہ کرتا ہے۔ خضر خان ملک سلیمان کا فرزند ہے جس کو ملک مردان دولت نے اپنا پسر خواندہ بنایا تھا۔ ملک مردان دولت ملتان کا حاکم تھا۔ اس کی وفات پر اس کا فرزند ملک شیخ جانشین ہوا جس کی وفات پر ملک سلیمان حاکم ملتان بن گیا۔ اس کے بعد اس کا فرزند خضر خان فیروز شاہ تغلق کے حکم سے حاکم ملتان بنا دیا گیا۔ جب سارنگ خان نے اس سے ملتان چھین لیا۔ خضر خان تیمور کے حملہ ۸۰۱ھ کے ایام میں امیر سے دہلی میں جا ملا۔ امیر نے اس کی خدمات پسند کر کے ملتان و پنجاب کی حکومت پھر اس کے حوالہ کر دی۔ خضر خان اپنے آخری حملہ میں جو ۸۱۷ھ میں کیا تھا۔ دہلی پر قابض ہو گیا۔ اس حملہ کے تفصیلی حالات معلوم نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے۔ کہ خضر خان کے ساتھ اس وقت ساٹھ ہزار سوار تھے۔

ذوالحجہ سنہ مذکور میں حملہ ہوا اور ربیع الاوّل ۸۱۷ھ میں دولت خان لودھی نے جو دہلی پر قابض تھا ہتھیار ڈال دیئے۔ خضر خان کی تمام فوج پنجاب سے تعلق رکھتی تھی۔ جس طرح کہ وہ خود پنجابی تھا۔ اور جب وہ بادشاہ بن گیا ہے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ دہلی کی زبان پر پنجاب کا اثر مجدد ہو گیا ہو گا۔

بہلول لودی

لودھی پٹھان بسلسلۂ تجارت ہندوستان آتے رہتے تھے۔ ان میں ملک بہرام اپنے بھائی سے ناخوش ہو کر ملتان چلا آیا۔ اور بعہد فیروز شاہ تغلق ملک مردان دولت حاکم ملتان کے ہاں ملازم ہو گیا اس کے پانچ فرزند ہوئے ملک سلطان شاہ۔ ملک کالا۔ ملک فیروز۔ ملک محمد اور ملک خواجہ۔ باپ کی وفات پر پانچوں بھائی ملتان ہی میں آباد رہے۔ جب خضر خان حاکم ملتان بن گیا۔ ملک سلطان شاہ اس کے ہاں ملازم ہو گیا۔ اور کچھ عرصہ میں افغانوں کی ایک جماعت کی افسری حاصل کر لی۔ خضر خان کی ملو اقبال خان کے ساتھ جو جنگ ہوئی۔ اس میں سلطان شاہ نے غیر معمولی بہادری دکھائی۔ وہ دشمن کی صفیں چیرتا ہوا۔ ملو اقبال خان تک پہنچ گیا۔ اور اس کا سر کاٹ لایا۔ اس خدمت کے صلہ میں خضر خان نے اس کی قدردانی کی۔ اور اسلام خاں کا خطاب دے کر سرہند کی حکومت عنایت کر دی۔ اسلام خان کے بھائی اس کے ہمراہ رہے۔ اور ملک کالا جو بہلول کے باپ کا نام ہے۔ پرگنہ دورالہ کا حاکم بن گیا۔ ملک کالا کی بیوی پورے دنوں سے تھی۔ عین اس وقت مکان کی چھت گری جس کے نیچے

دب کر دہ فوت ہو گئی ۔ اس شبہ میں کہ کہیں بچہ زندہ ہو مرحومہ کا پیٹ چاک کیا
گیا ۔ دیکھا تو بچہ زندہ و سلامت ہے ۔ اس کا نام بہلول رکھا ۔ ویسے تو کہا کرتے
تھے ۔ ملک کالا نیازی افغانوں کی جنگ میں مارا گیا ۔ اور یتیم بہلول اس کے چچا
اسلام خاں کے پاس پہنچا دیا گیا ۔ سن رشد کے قریب بہلول نے ایک جنگ میں
اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے اس پر اسلام خاں نے اپنی بیٹی اسے بیاہ دی ۔
اب اسلام خاں اس قدر طاقتور ہو گیا تھا ۔ کہ بارہ ہزار افغان جن میں اکثر اس کے
خویش اور ہم قوم تھے ۔ اس کے ملازم تھے ۔ اپنی وفات پر اسلام خاں نے فرزندان
نرینہ چھوڑنے کے باوجود ملک بہلول کو بروئے وصیت اپنا جانشین بنا دیا ۔
اب اسلام خاں کی فوج کی تین ٹولیاں بن گئیں ۔ ایک ٹولی بہلول کے تابع تھی ۔
دوسری ملک فیروز برادر اسلام خاں کی اور تیسری قطب خلف اسلام خاں کی ۔ لیکن
بہلول اپنے حسن تدبیر سے رفتہ رفتہ دوسری جماعتوں کو توڑ کر طاقتور بن گیا ۔ اور سلطنت دہلی کا کبھی
باغی اور کبھی مطیع رہ کر ۸۵۵ھ میں بادشاہ دہلی بن گیا ۔ اگرچہ اس کے لشکر میں زیادہ تعداد افغانوں کی
تھی ۔ لیکن یہ افغان ایسے تھے ۔ جو زیادہ تر پنجاب میں آباد تھے ؛

ان چند مختصر بیانات سے جو میں نے اوپر عرض کئے ہیں یہ بخوبی واضح
ہوتا ہے کہ سیاسی نقطۂ نظر سے پنجاب کا اثر دہلی پر ہر عہد میں نمایاں رہا ہے ؛
یہ امر اظہر من الشمس ہے ۔ کہ سیاسی واقعات کا اثر زبان پر بہت گہرا
ہوتا ہے ۔ چنانچہ جب ہم اردو اور پنجابی زبانوں کی صرف و نحو ان کے قواعد

اور عام ہئیت کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ اثر قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے۔ اور دونوں زبانوں کی مماثلت کا راز صریح طور پر آشکار ہو جاتا ہے۔ آئندہ باب میں اسی مسئلہ پر تبصرہ کیا جاتا ہے:۔

پنجاب

پنجاب اگرچہ مباندلیب کا ہمسایہ ملک ہے۔ لیکن رسم و رواج اور اوضاع و اطوار میں اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہندو اقتدار کے دور میں میان واہیوں اور پنجابیوں میں چشمک رہی ہے اور مباندلیب جو اپنے سنسکرت کے تمدن پر نازاں تھا۔ پنجاب کو ایک وحشی ملک تصور کرتا رہا ہے۔ مہابھارت اور پانینی کے بعض اشاروں سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے لوگ کسی باقاعدہ نظام کے ماتحت نہ تھے۔ نہ ان کا کوئی بادشاہ تھا۔ وہ ہمیشہ جنگ وفساد میں مبتلا تھے۔ اُن کے ہاں برہمن نہیں تھے۔ تمام پنجاب چھوٹے چھوٹے رئیسوں میں منقسم تھا۔ جو ایک دوسرے سے برسر پیکار تھے۔ باشندے دیدوں کا احترام نہیں کرتے تھے۔ اور نہ دیوتاؤں پہ قربانیاں چڑھاتے تھے۔ وہ بالکل وحشی اور غیر مہذب تھے۔ شراب پیتے تھے۔ اور ہر قسم کا گوشت کھانے کے عادی

تھے ۔ ان کی عورتیں قدو قامت کی بڑی رنگ کی میلی اور اخلاقاً گندی ہوتی تھیں۔ کئی کئی شوہر رکھتی تھیں ۔ ایک شخص کا وارث اس کا فرزند نہیں ہوتا تھا ۔ بلکہ اس کی بہن کا لڑکا ۔ یہ بیانات دشمنوں کے قلم سے ہیں ۔ اور یہ بہت ممکن ہے کہ ان میں صداقت کا عنصر بہت کم ہو ؛

بہرکیف اسلام کی آمد پر پنجاب کی حالت میں ایک انقلاب رونما ہوتا ہے ۔ اور اہل پنجاب حلقہ بگوش اسلام ہو کر دینی و دنیوی ترقی کرتے ہیں ۔ ابھی مسلمانوں کو دہلی میں آباد ہوئے ۔ ایک صدی بھی نہیں گذرنے پائی ہے کہ ہم دہلی کے دربار میں پنجاب کے بعض مشاہیر امرا و فضلا دیکھتے ہیں ۔ اگرچہ اس عہد کی تاریخ کے فقدان نے ہمارے لیے یہ امر ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی مکمل بیان اس عہد کے مشاہیر پنجاب پر دیا جائے ۔ لیکن یہاں میں بعض ایسے اسما درج کرتا ہوں ۔ جو خاک پنجاب سے ہیں ۔ اور اتفاقیہ اس زمانہ کی تاریخ میں ان کے نام مل جاتے ہیں ۔ ساتویں صدی میں اگرچہ پنجاب دارالسلطنت ہند نہیں رہا تھا ۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب کے شہروں میں مقتدر ہستیاں پیدا ہو رہی تھیں ۔ مثلاً ملک عین الدین علیشہ کوہ جودی ۔ یہ بلبن اور کیقباد کے عہد میں امیر تھے ۔ ملک تاج الدین کہرامی اور ملک نصیر الدین کہرامی اسی زمانہ کے امرا میں داخل ہیں ۔ سامانہ سے سید عزیز اور سید معین الدین بہت ممتاز اور زہد و اتقا و علو نسب میں شہرہ آفاق تھے ۔ قاضی رکن الدین بھی سامانہ کے باشندے ہیں ۔ اور چند علمائے

وقت میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا رکن الدین سنامی اور مولانا ضیاءالدین سنامی خلجیوں کے عہد کے علما سے ہیں۔ موخرالذکر محکمۂ احتساب کے افسر تھے اور صوفیہ کے خلاف تھے۔ انھوں نے اپنی تصنیف یادگار چھوڑی ہے ۔ مولانا علاءالدین لاہور کے باشندے اور اپنے زمانہ کے ممتاز علما میں محسوب تھے۔ قصور سے مولانا سراج الدین پیدا ہوتے ہیں جو فضل و کمال سے متصف تھے۔ ملتان میں شیخ بہاءالدین زکریا اور اجودھن میں شیخ فریدالدین مشہور نزانہ آفتاب ہستیاں ہیں۔ ان کا خاندان علم و فضل تصوف و عرفان کے لئے صدیوں مشہور رہا ہے۔ اگرچہ مغلوں کے حملوں نے پنجاب کو عرصہ تک دم نہیں لینے دیا۔ اور اس کی ترقی کی رفتار کو روک دیا۔ لیکن اسی نقصان سے پنجاب کو یہ فائدہ پہنچا کہ اس نے تین خاندان ہندوستان کو ایسے دیئے جنھوں نے تخت دہلی پر بیٹھ کر پورے دو سو برس تک ہندوستان پر حکومت کی۔ اس معاملہ میں ہندوستان کا کوئی صوبہ پنجاب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ملک پنجاب کی زبان آجکل پنجابی کے نام سے موسوم ہے۔ امیر خسرو اس کو لاہوری کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ابوالفضل ملتانی کہتا ہے۔ مغربی مورخین نے شمالاً و جنوباً ایک خط کھینچ کر مشرقی و مغربی پنجابی میں اسے تقسیم کر دیا ہے۔ مشرقی حصہ کی زبان کا نام پنجابی رکھا ہے۔ اور مغربی حصہ کی زبان کا نام لہندا۔ پنجابی کو وہ مغربی ہندی میں شامل کرتے ہیں۔ اور لہندا کو بیرونی دائرہ

میں داخل کر کے سندھی اور کشمیری کا رشتہ دار مانتے ہیں۔ اہل پنجاب یہ فرق تسلیم نہیں کرتے ان کا بیان ہے کہ پنجابی اور لہندا ایک ہی چیز ہے۔ مغربی اور مشرقی زبان میں جو فرق ہے۔ وہ اصولی نہیں ہے بلکہ تدریجی اور ضلع ضلع کی مقامی خصوصیات کی بنا پر پیدا ہوتا چلا گیا ہے۔ اور یہ تقسیم ہر حال میں ناجائز ہے ؛

پنجاب اگرچہ پانچ دریاؤں کا ملک ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے۔ کہ صوبہ کی زبان انہی دریاؤں کے مابین محصور رہی ہے۔ بلکہ وہ ان دریاؤں سے چھلک کر دونوں طرف پھیل گئی ہے۔ ادھر دریائے گھگر تک آگئی ہے۔ ادھر دریائے سندھ پار کر گئی ہے۔ ایک اہم مغربی عقیدہ یہ ہے کہ پنجابی زبان کی ہمسایہ ہندوستانی زبان جو مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے۔ ایک زمانہ میں تمام مشرقی پنجاب پر پھیل گئی ہے اور اس صوبہ کی اصلی زبان لہندا کو ہٹاتی ہوئی یا اس پر چھاتی ہوئی دریائے چناب تک پہنچ گئی۔ بلکہ بعض اوقات اس کا اثر جہلم تک محسوس ہوتا ہے۔ ہند میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سیاسی واقعات کا بہاؤ شمال سے زیادہ تر جنوب کی طرف رہا ہے۔ سیاسی واقعات نیز مغلوں کے دباؤ کے زیر اثر آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں بڑے بڑے گروہ پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی اور اس کے نواح میں آباد ہوتے رہے ہیں۔ بارھویں صدی میں سکھ پنجاب سے نکل کر اردو باگڑ اور بیکانیری علاقوں میں گھس جاتے ہیں۔ ان واقعات کے سامنے ہندوستانی زبان کے شمال کی طرف بڑھنے اور لہندا کو پیچھے دھکیلنے کا کوئی مناسب موقع نظر نہیں آتا ؛

پنجابی میں شعر و ادب ایک معتد بہ مقدار میں موجود ہے۔ جس کا اکثر حصہ مسلمان دماغوں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ خواجہ مسعود سعد سلمان کے بعد پنجابی کے پہلے شاعر شیخ فرید الدین مسعود متوفی ۶۶۴ھ ہیں۔ سکھوں کا بیان ہے کہ وہ فرید الدین ابراہیم ہیں جو گرو نانک کے معاصر ہیں۔ ان کے کلام کا کسی قدر حصہ اتفاق سے سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب میں محفوظ ہے۔ دوسرے شاعر گرو نانک صاحب ہیں۔ جن کا جپ جی سکھوں میں بہت مقبول ہے۔ شاہ حسین متوفی ۱۰۰۸ھ نے ایک کافی اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ پنجاب کے علما نے بیشمار کتابیں اور رسالے اس نظر سے تصنیف کیے ہیں کہ مسلمان جماعت کا غیر تعلیم یافتہ طبقہ احکام دین روزہ نماز اور مسائل شرعیہ سے ضروری واقفیت حاصل کر سکے۔ ایسی کتابیں اکثر اوقات مختصر نظم کی شکل میں ہوتی تھیں۔ تاکہ لوگ آسانی سے یاد کر سکیں۔ جاہل طبقہ کے لئے یہ طریقہ تعلیم مسلمانوں نے ہندوستان کی باقی زبانوں میں بھی اختیار کیا ہے پنجابی میں ایسی تالیفات کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ اگرچہ بتحقیق معلوم نہیں کہ یہ سلسلہ کس زمانہ سے شروع ہوتا ہے لیکن اس کے قدیم ہونے میں کوئی شک نہیں۔ کیونکہ اکبری عہد کی ایسی تالیفات اب بھی موجود ہیں۔ ان میں مولانا عبدی ابن محمد ساکن بٹالہ کا رسالہ نہنجہ ہی سب سے مقدم ہے جو ۹۹۶ھ کی تصنیف ہے

نوے ورہے ستانویں جاں گزرے وچ شمار   پچھے ہجرت مصطفیٰ تدن نہیا طیار

مولوی عبد اللہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ جو جہانگیر کے عہد سے شروع

کرکے شاہجہان کے آخر ایام تک برابر چالیس سال تک تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں۔ شرعیات ان کا میدان ہے۔ اور اسی میں تمام عمر گزار دی۔ انکی پہلی تصنیف تحفہ ۱۰۲۵ھ میں اور آخری کتاب خیر العاشقین ۱۰۶۵ھ میں ختم ہوتی ہے۔ خلاصہ ۱۰۴۳ھ میں۔ انواع العلوم ۱۰۴۴ھ میں۔ خیر العاشقین کلاں ۱۰۵۴ھ میں اور سراجی ۱۰۵۸ھ میں نظم ہوئیں۔ مولانا عبداللہ کے حالات زندگی سے ہم ناواقف ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ انھوں نے علوم دین اور فقہ کی زبردست خدمت کی ہے۔ مولوی عبداللہ کے مقلدین میں علاماں ناجی (غلاماں ناجی کذا) اور درویش محمد ہیں۔ فقہی رسائل دونوں نے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ علاعال بن درویش محمد کے "مسائل فقہ" لکھے۔ مولانا عبدالکریم نے ۱۰۸۶ھ میں نجات المومنین تصنیف کی۔ ۱۰۵۴ھ میں فقیر شاعر نے نور نامہ کو نظم کیا۔

عالمگیر کے عہد سے بچوں کی تعلیم کے لئے متعدد کتب نصاب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جن میں ذریعہ تعلیم پنجابی زبان ہے۔ کہرل رائے سنامی نے ۱۱۰۵ھ میں ایزد باری اور امید نے ۱۱۱۱ھ میں اللہ باری تالیف کیں۔ فارسی نامہ عبدالرحمن بن محمد قاسم قصوری کی یادگار ہے۔ رازق باری اور واحد باری کا ذکر وارث شاہ علیہ الرحمتہ اپنی مثنوی ہیر و رانجھا میں کرتے ہیں۔ نصاب ضروری کے مالک خدا بخش ہیں۔ ۱۲۲۲ھ میں گنیش داس صنعت باری پر قلم اٹھاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ پنجاب نے بچوں اور غیر تعلیم یافتہ گروہ کی تعلیم کا انتظام اور منظمات سے

بہتر کیا تھا ؛

نیم مذہبی تصنیفات میں احوال الآخرت ۔ معراج نامے ۔ نور نامے ۔ وفات نامے ۔ جنگ نامے وغیرہ قسم کی کتابوں کا بہت وسیع سلسلہ موجود ہے ۔ طب میں بھی بعض کتابیں تصنیف اور بعض ترجمہ ہوئی ہیں ۔ مثلاً دار الشفا ۔ ترجمۂ قانونچہ و مجربات اکبری وغیرہ ؛

قصص و افسانہ کے سلسلہ میں ہیر و رانجھا کا قصہ بیحد مشہور رہے ۔ مقبل نے محمد شاہی عہد میں اور وارث شاہ علیہ الرحمۃ نے ۱۱۸۰ھ میں اس افسانہ کو نظم کر کے ایک غیر فانی شہرت حاصل کر لی ہے ۔ ان کے مقلدین میں فضل شاہ نے زیادہ نام پیدا کیا ۔ سوہنی مہینوال کے قصہ پر سید فضل شاہ ۔ مشتاق رضا ۔ اور غمناک نے طبع آزمائی کی ہے یسی و پنوں کو ہاشم ، سید فضل شاہ ، مولوی غلام رسول ، احمد یار اور بوٹا نے علیحدہ علیحدہ نظم کیا ہے ۔ فضل شاہ نے لیلیٰ و مجنوں کی نظم لکھ کر اپنا نام کیا ہے ۔ یوسف زلیخا کا قصہ پنجاب میں بہت مقبول رہا ہے ۔ متعدد شعرا نے اس کو نظم کا جامہ پہنایا ہے ۔ مثلاً پیرانداتا ۔ محمد سعید اور مولوی غلام رسول ۔ لیکن سب سے قدیم عبد الحکیم کی یوسف زلیخا ہے ۔ جو ۱۲۱۸ھ میں حلیۂ نظم پہنتی ہے ۔ اور راقم سطور نے آئندہ اوراق میں اس سے بہت امداد لی ہے ۔ عبد الحکیم اوچہ تحصیل احمد پور کے باشندے ہیں ۔ جو بہاول پور کے علاقہ میں واقع ہے ۔ عبد الحکیم نے یہ مثنوی اپنے علاقہ کی زبان میں جو ملتانی کے نام سے مشہور ہے لکھی ہے ۔ اور

نواب بہاول خاں کے نام پر معنون کی ہے ؛

صوفی شعرا میں حضرت بلھے شاہ متوفی ۱۱۷۱ھ اور علی حیدر متوفی ۱۱۹۱ھ شہرت خاص رکھتے ہیں بلھے شاہ کی کافیاں صوفی حلقوں میں بیحد مقبول ہیں پنجابی میں قصص الانبیا۔ اور شاہنامہ جیسی کتابیں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔ جنگ نامے پنجابی ادبیات کی ایک اور صنف ہیں جن میں شہید کربلا اور ان کی جنگوں کا ذکر ہے۔ ان میں مقبل کا جنگ نامہ سب سے قدیم ہے جو ۲۹ سنہ جلوس محمد شاہی مطابق ۱۱۶۰-۵۵ف سنہ میں لباس نظم پہنتا ہے۔ اس کے علاوہ بارہ ماسے اور سی حرفیاں پنجابی ادب کی خصوصی شاخ ہیں۔ جو اب بالکل متروک ہیں۔ سی حرفی گجراتی اردو میں بھی ملتی ہے۔ اور شاہ علیجیو گام دھنی کے جواہر اسرار اللہ میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظمیں بھی بارہ ماسوں کی طرح قدیم ہیں ؛

پنجابی اور اُردُو

گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ پنجابی اور اردو اپنی صرف و نحو میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ یہاں اس بحث پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے:

(۱) مصدر کا قاعدہ دونوں زبانوں میں ایک ہے۔ یعنی علامت "نا" امر کے آخر میں اضافہ کر دی جاتی ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کا رسم الخط دونوں زبانوں میں "ناں" تھا۔ بارھویں صدی کے اختتام کے قریب ایسے نون غنہ کو ترک کر دیا جاتا ہے اور دیگر الفاظ سے بھی خارج کر دیا جاتا ہے مثلاً سیں۔ کوں۔ سیتیں وغیرہ جو بعد میں سے۔ کو اور سیتی بن جاتے ہیں:

(۲) تذکیر و تانیث کے قواعد دونوں زبانوں میں ایک ہیں۔ یعنی:۔

(۱) اکثر ایسے الفاظ جو "الف" پر ختم ہوتے ہیں۔ تانیث کی حالت میں "ی" پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً بکرا۔ بکری۔ گھوڑا۔ گھوڑی۔ چنگا۔ چنگی۔ کالا۔ کالی بوتا۔ بوتی:

(۱) جب اسم مذکر حروف علت کے سوا حرف صحیح پر ختم ہو تو دونوں زبانوں میں تانیث کے لئے "نی" یا "انی" اضافہ کر دیتے ہیں:

مذکر	مؤنث پنجابی	مؤنث اُردو
مغل	مغلانی	مغلانی
لوہار	لُہارن۔ لوہاری۔ لوہارنی	لوہاری۔ لوہارن
دیور	دیرانی	دیورانی
اونٹ	اونٹنی	اونٹنی
نٹ	نٹنی	نٹنی
فقیر	فقیرنی	فقیرنی
زمیندار	زمیندارنی	زمیندارنی
ڈوم	ڈومنی	ڈومنی
سیّد	سیّدزادی	سیّدانی

(ب) اگر مذکر "ی" پر ختم ہو تو مؤنث میں "ی" "ن" سے بدل جاتی ہے:۔

مذکر	مونث پنجابی	مونث اُردو
میراثی	میراثن	میراثن
تیلی	تیلن	تیلن
قریشی	قریشن	
موچی	موچن۔ موچیانی	موچن
بھائی	بھین	بہن

مذکر	مؤنث پنجابی	مؤنث اردو
قصائی	قصائن	قصائنی
جوگی	جوگن	جوگن
درزی	درزیانی ۔ درزن	درزن
نائی	نائین	نائن
قاضی	قضیانی	قضیانی
دھوبی	دھوبن	دھوبن
کھتری	کھترانی	

"نی" علامت تانیث جو ہم زمیندارنی ۔ فقیرنی ۔ ڈومنی وغیرہ میں دیکھتے ہیں درحقیقت پنجابی میں عام علامت تانیث ہے ۔ جو عورت کو خطاب کے لئے ابتدا میں بھی لائی جا سکتی ہے ۔ مثلاً ۔ "نی کڑیے" (اے لڑکی) "نی شیر محمد دی ماں" (اے شیر محمد کی ماں) ٭

(۳) اعلام و اسما اور اسمائے صفات دونوں زبانوں میں الف پر ختم ہوتے ہیں ۔ جب کہ برج بھاشا میں واو مجہول پر ختم ہوتے ہیں ۔ جیسے :۔

پنجابی	اُردو
منڈا	لڑکا
گھوڑا	گھوڑا

پنجابی	اُردو	
کُتّا	کُتّا	
نیولا	نیولا	خالق باری میں نیول ملتا ہے۔ مصرع
چنگا	اچھا	"کتر دم بچھو راسو نیول" لیکن اُردو
نکّا	چھوٹا	نے اپنا قاعدہ مستمرہ جاری کرکے نیولا
وڈّا	بڑا	بنادیا۔
کھبا	اُلٹا	
سجا	سیدھا	
اُچا	اونچا	

(۴) اسمائے صفات تذکیر و تانیث اور جمع و واحد میں اپنے موصوف کی حالت کے مطابق ہوتے ہیں مثلاً

اُردو (۱) اونچا گھوڑا (۲) میرا لڑکا (۳) چھوٹی لڑکی (۴) بڑے لڑکے (۵) دوڑتے گھوڑے سے (۶) چھوٹی لڑکیاں۔

پنجابی (۱) اُچا گھوڑا (۲) میرا منڈا (۳) نکی کڑی (۴) وڈّے منڈے (۵) دوڑدے گھوڑے توں (۶) نکیاں کڑیاں۔

برج میں اس موقع پر اونچو گھوڑا اور میرو چھورا لائیں گے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو اور پنجابی فقروں میں اسمائے صفات اُن کے موصوفوں کے مطابق

ہیں - یعنی جب موصوف غیر منصرف ہے۔ تو اس کا اسم صفت بھی غیر متصرف رہا۔ جیسے پہلے تین جملوں میں دیکھا جاتا ہے چوتھے اور پانچویں جملہ میں چونکہ موصوف منصرف ہو گئے ہیں - یعنی اپنی اصلی علمی حالت لڑکا اور گھوڑا کو چھوڑ کر لڑکے اور گھوڑے بن گئے ہیں۔ اس لئے اُن کے اسماء صفات بھی منصرف ہو کر اپنے موصوفوں کی حالت قبول کر کے بڑے اور دوڑتے بن گئے - اہل برج اس موقع پر "بڑے لڑکا" اور "دوڑتے گھوڑا سے" لائیں گے - جو اردو اور پنجابی کے خلاف ہے - یہ فرق اگرچہ بظاہر خفیف ہے - لیکن نہایت اہم ہے - چھٹے فقرے میں دیکھا جاتا ہے کہ پنجابی میں جب کہ صفت و موصوف باہم متحد ہیں - اردو میں باہم مطابق نہیں - چھوٹی واحد ہے - اور لڑکیاں جمع ہے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو میں یہ بےضابطگی میر و سودا کے عہد سے شروع ہوئی ہے۔ اردوئے قدیم میں "چھوٹیاں لڑکیاں" ہی بولتے تھے - جو پنجابی کے عین مطابق ہے۔ احمد دکنی سے

"و چادروں سے پالیاں سو بالیاں نکلیں وفا شرم انو تھے سکیاں سب یکیاں

(۵) خبر تذکیر و تانیث، واحد و جمع میں اپنے مبتدا کے موافق آتی ہے:-

اُردو (۱) یہ بات بھلی نہیں (۲) یہ باتیں بھلی نہیں ؛

پنجابی (۱) ایہ گل چنگی نہیں (۲) ایہ گلاں چنگیاں نہیں ؛

اُردو کے دوسرے جملہ میں دیکھا جاتا ہے کہ خبر اپنے مبتدا کے مطابق

نہیں۔ باتیں جمع ہے۔ اور بھلی واحد جب کہ پنجابی میں بھنڈا اور خیر دونوں جمع میں ہیں یہ جدت طرازی اسی زمانۂ اصلاح سے تعلق رکھتی ہے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ پرانی اردو میں یہ جملہ یوں لکھا جاتا "یہ باتیں بھلیاں نہیں" بلکہ یہ باتاں بھلیاں نہیں، جو پنجابی سے بالکل موافق ہے۔ سودا کہتے ہیں ؎

دوانہ ہو گیا سودا تو آخر ریختہ پڑھ پڑھ

نہ میں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

(۶) فعل تذکیر و تانیث و واحد و جمع میں اپنے فاعل کے مطابق ہے۔

اُردو (۱) گھوڑا آیا (۲) گھوڑے آئے (۳) عورت آئی (۴) عورتیں آئیں۔

پنجابی (۱) گھوڑا آیا (۲) گھوڑے آئے (۳) بڈھی آئی (۴) بڈھیاں آئیاں

چوتھے جملہ میں بڈھیاں غیر منصرف ہے۔ جو بالکل درست ہے۔ اُردو کے جملہ میں اسے عورتاں سے منصرف کر کے عورتیں بنا لیا گیا ہے۔ پرانی اردو میں یہی جملہ یوں لکھتے "عورتاں آئیاں"۔ ایک مثال سودا کے کلام میں موجود ہے ؎

نکتی نکلیں ہیں تحت دل سے نالہ اشک کی لڑیاں

یہ انکھیاں کیوں سے جیکے کھلکی ہار ہو پڑیاں

(۷) اضافت اپنے فاعل کی تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کے مطابق ہوتی ہے۔

اُردو۔ اس میں کوٹھڑیاں رنگ برنگی ہیں۔ بعض چاندی کی۔ بعض یاقوت سرخ کی۔ اور بعض زمرد کی۔ اور بعض زبرجد کی۔ اور بعض جواہرات سفید کی،

پنجابی :۔ اودوے وچ کوٹھڑیاں رنگ برنگیاں ہیں۔ بعضیاں چاندی دیاں بعضیاں یاقوت سرخ دیاں نے بعضیاں زمرد دیاں تے بعضیاں زبرجد دیاں تے بعضیاں چٹے جواہرات دیاں نے ،،

یہاں اعتراض وارد ہوتا ہے کہ کوٹھڑیاں جمع میں ہیں۔ اور اضافت ”کی“ واحد میں لیکن یہاں پھر اُردو نے اپنے پرانے قواعد کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ بارھویں صدی ہجری میں بھی یوں لکھا جاتا تھا :۔

”اور اس میں کوٹھڑیاں رنگ برنگی ہیں۔ بعض چاندی کیاں۔ بعض یاقوت سُرخ کیاں۔ اور بعض زمرد کیاں اور بعض زبرجد کیاں اور بعض جواہرات سفید کیاں ،،۔ (منقول از کتاب ہزار مسائل) ؛

مثال دیگر :۔

اُردو :۔ یوں نو و ہزار باتاں اللہ کیاں ہور محمدؐ کیاں ہویاں (از معراج العاشقین حضرت گیسو دراز)

پنجابی :۔ پنج نوے ہزار باتاں اللہ دیاں ہور محمدؐ دیاں ہویاں ۔

مثال دیگر :۔

اُردو :۔ قیامت کی نشانیاں کتنی ہیں اور کیسی ہیں یارسول اللہؐ

پنجابی :۔ قیامت دیاں نشانیاں کتیاں تے کیہیاں نے یارسول اللہؐ۔

قدما کی زبان میں یہ جملہ یوں ہے :۔

قیامت کیاں نشانیاں کتنیاں ہیں اور کیسیاں ہیں یا رسول اللہؐ (از ہزار مسائل)۔

محمد امین دکنی ؎

گگن کی گردشاں ہیں گئیں طرح کیاں

کدہیں غم کیاں ہیں اور کدہیں فرح کیاں (یوسف زلیخا)

(۸) ماضی مطلق دونوں زبانوں میں ایک ہے:-

اُردو:- وہ آیا۔ وہ آئے۔ تو آیا۔ تم آئے۔ میں آیا۔ ہم آئے۔ وہ آئی۔ وہ آئیں۔ تو آئی۔ تم آئیں۔ میں آئی۔ ہم آئیں۔

پنجابی:- اوہ آیا۔ اوہ آئے۔ توں آیا۔ تسی آئے۔ میں آیا۔ اسی آئے۔ اوہ آئی۔ اوہ آئیاں۔ توں آئی۔ تسی آئیاں۔ میں آئی۔ اسی آئیاں۔

جمع مؤنث کے صیغوں میں جو فرق پنجابی اور اردو میں ملاحظہ ہوتا ہے۔ وہ متاخرین کی اصلاحی کوشش کا نتیجہ ہے۔ جس نے قدما کے قاعدوں کو بالکل درہم و برہم کر دیا۔ وہ ان صیغوں کو یوں بولتے تھے:-

وہ آئیاں۔ تم آئیاں۔ ہم آئیاں۔

محمد امین دکنی ؎

مصر میں خوب صورت بیلیاں تھیاں نوں سنیاں زلیخا کی سو باتاں

(۹) ماضی قریب فعل امدادی کی تصریف سے بنتی ہے۔ یہاں پنجابی اور اردو میں کسی قدر اختلاف ہے:-

صیغہ مذکر

اردو:۔ وہ آیا ہے۔ وہ آئے ہیں۔ تو آیا ہے۔ تم آئے ہو۔ میں آیا ہوں۔ ہم آئے ہیں
پنجابی:۔ اوہ آیا اے۔ اوہ آئے نے۔ توں آیا ایں۔ تسی آئے او۔ میں آیا
آں۔ اسی آئے آں ؛

صیغہ مؤنث

اردو:۔ وہ آئی ہے۔ وہ آئی ہیں۔ تو آئی ہے۔ تم آئی ہو۔ میں آئی ہوں۔
ہم آئی ہیں ؛
پنجابی:۔ اوہ آئی اے۔ اوہ آئیاں نے۔ تو آئی ایں۔ تسیں آئیاں او۔
میں آئی آں۔ اسی آئیاں آں ؛

(۱۰) ماضی بعید بھی توابع کی تصریف سے بنتی ہے۔

صیغہ مذکر

اردو:۔ وہ آیا تھا۔ وہ آئے تھے۔ تو آیا تھا۔ تم آئے تھے۔ میں آیا تھا۔ ہم آئے تھے
پنجابی:۔ اوہ آیا سی۔ اوہ آئے سن۔ تو آیا سیں۔ تسی آئے سو۔ میں آیا سال
اسی آئے سال ؛

صیغہ مؤنث

اردو:۔ وہ آئی تھی۔ وہ آئی تھیں۔ تو آئی تھی۔ تم آئی تھیں۔ میں آئی
تھی۔ ہم آئی تھیں ؛
پنجابی:۔ او آئی سی۔ اوہ آئیاں سن۔ تو آئی سیں۔ تسی آئیاں سو۔ میں آئی
سال۔ اسی آئیاں سال ؛

قدیم اردو میں اس ماضی کی تصریف یوں تھی:۔

دے آئیں تھیا یا آئیاں تھیاں ؛

محمد امین دکنی :-

نشانیاں دیکھیاں تھا سو بتایاں   دے سب دائی کے آگے کہہ سنایاں

دیگر محمد امین دکنی :-

بہی جنت کی جلوں کیاں چوٹیاں تھیاں   مثال موتیاں کی اُس میں گوتھیاں تھیاں

(۱۱) ماضی ناتمام میں بڑا فرق یہ ہے کہ پنجابی میں جہاں دال ہے۔ اردو میں تے بن گئی ہے :

مذکر

اُردو :- وہ مارتا تھا۔ وہ مارتے تھے۔ تو مارتا تھا۔ تم مارتے تھے۔ میں مارتا تھا۔ ہم مارتے تھے :

پنجابی :- اوہ ماردا سی۔ اوہ ماردے سن۔ توں ماردا سیں۔ تسی ماردے سو۔ میں ماردا ساں۔ اسی ماردے ساں :

مؤنث

اُردو :- وہ مارتی تھی۔ وہ مارتی تھیں۔ تو مارتی تھی۔ تم مارتی تھیں۔ میں مارتی تھی۔ ہم مارتی تھیں :

پنجابی :- اوہ ماردی سی۔ اوہ ماردیاں سن۔ تو ماردی سیں۔ تسی ماردیاں ساں۔ میں ماردی ساں۔ اسی ماردیاں ساں :

(۱۲) ماضی احتمالی دونوں زبانوں میں بالکل ایک ہے۔

اُردو :- وہ کھاتا ہو۔ وہ کھاتے ہوں۔ تو کھاتا ہو۔ تم کھاتے ہوؤ۔ میں کھاتا ہوؤں۔ ہم کھاتے ہوں :

مذکر
پنجابی :- وہ کھاندا ہووے - اوہ کھاندے ہون - تو کھاندا ہوویں - تسی کھاندے ہوؤ - میں کھاندا ہوواں - اسی کھاندے ہوییے ؛

مؤنث
اردو :- وہ کھاتی ہو - وہ کھاتی ہوں - تو کھاتی ہو - تم کھاتی ہوؤ - میں کھاتی ہوؤں - ہم کھاتی ہوں ؛
پنجابی :- اوہ کھاندی ہووے - اوہ کھاندیاں ہوون - تو کھاندی ہوویں - تسی کھاندیاں ہوؤ - میں کھاندی ہوواں - اسی کھاندیاں ہوییے ؛

(۱۳) مضارع دونوں زبانوں میں ایک ہے -

مذکر
اردو :- وہ آئے - وہ آئیں - تو آئے - تم آؤ - میں آؤں - ہم آئیں ؛
پنجابی :- اوہ آوے - اوہ آون - تو آویں - تسی آؤ - میں آواں - اسی آییے -
اردو :- وہ آئے - وہ آئیں - تو آئے - تم آؤ - میں آؤں - ہم آئیں ؛

پرانی اردو میں بھی آوے - اور آویں ہی مستعمل تھا - آنا دراصل آونا تھا - اس سے مضارع آوے اور آویں تھا -

(۱۴) فعل حال کی تصریف دونوں زبانوں میں ایک ہی اصول پہ ہے - ماضی ناتمام کی طرح یہاں بھی دال اور تے آپس میں بدلتی ہیں ؛

مذکر
اردو :- وہ کرتا ہے - وہ کرتے ہیں - تو کرتا ہے - تم کرتے ہو - میں کرتا ہوں - ہم کرتے ہیں
پنجابی :- اوہ کردا اے - اوہ کردے نے - تو کردا ایں - تسی کردے او - میں کردا آں - اسی کردے آں ؛

اُردو:۔ وہ کرتی ہے۔ وہ کرتی ہیں۔ تو کرتی ہے۔ تم کرتی ہو۔ میں کرتی ہوں۔ ہم کرتی ہیں:

پنجابی:۔ اوہ کردی اے۔ اوہ کردیاں نے۔ تو کردی ایں۔ تسی کردیاں او
میں کردی آں۔

پرانی اُردو میں مؤنث کی گردان زیادہ قریب تھی:

اُردو قدیم:۔
وہ کرتی ہے۔ وہ کرتیاں ہیں۔ تو کرتی ہے۔ تم کرتیاں ہو۔ میں کرتی ہوں۔ ہم کرتیاں ہیں:

مثال:۔
"واسطے مردوں کے ہے حصہ اُس چیز سے کہ کماتے ہیں اور واسطے عورتوں کے حصہ ہے اُس چیز سے کہ کماتیاں ہیں۔" (ترجمۂ قرآن از شاہ رفیع الدین صاحب)

مثال:۔
ایسی ایسی اوجھڑیں باہم چلتیاں ہیں کہ دیکھنے والوں کی مارے ہیبت کے جانیں نکلتیاں ہیں (آرائش محفل نایسفہ ۱۸۰۳ء صد ۲۶)

(۱۵) مستقبل کا اصول دونوں زبانوں میں ایک ہے۔ یعنی واحد و جمع میں گا اور گے کے اضافہ سے بنتا ہے:

اُردو:۔ وہ آئیگا۔ وہ آئینگے۔ تو آئیگا۔ تم آؤ گے۔ میں آؤنگا۔ ہم آئینگے:

پنجابی :- اوہ آویگا - اوہ آونگے - تو آونیگا - تسی آؤگے - میں آوانگا - اسی آوانگے

قدیم اردو میں آویگا اور آوینگے ہی بولتے تھے - لیکن فصحائے متاخرین جن کی اصلاحات کا کسی قدر تماشا ہم گزشتہ سطور میں دیکھ چکے ہیں - آئیگا اور آئینگے کہنا پسند کرتے ہیں - جمع مخاطب کی واؤ شاید انھیں نظر نہیں آئی - ورنہ وہ بھی اصلاح کی قربانگاہ پہ چڑھا دی جاتی - اور ہم آج "تم آئینگے" بولتے ہوتے - کم از کم اس صورت میں یکسانیت تو ہاتھ سے نہ جاتی :

اردو :- وہ آئیگی - وہ آئینگی - تو آئیگی - تم آؤگی - میں آؤنگی - ہم آئینگی :

پنجابی :- اوہ آویگی - اوہ آونگیاں - توں آوینگی - تسی آؤگیاں - میں آوانگی - اسی آواں گیاں :

قدیم اردو میں یوں گردان ہوتی تھی :-

وہ آویگی - وہ آوینگیاں - تو آئیگی - تم آؤگیاں - میں آونگی - ہم آوینگیاں -

مثال :-

اور جنت والے لوگ جس چیز پہ نظر کریں گے - پیالیں اس چیز کیاں بھر کر اوپر منہ اوس نیک بخت بندے کے لگیں گیاں - اور آپ سے ہٹ جائیں گیاں ؛

دیگر :-

بعد اس سے حوریں بہشت کیاں اپنے ہاتھ سیں مالش کر کر اتحاد نیگیاں و بجز و انکسار سے دعا مانگینگیاں - (ہزارہ مسائل) :

محمد امین دکنی: ؎

نہیں معلوم تقدیر اُس کے تئیں ماں   کہ کیا کیا مشکلیں آگل پڑیگیاں

(۱۶) امر کا قاعدہ اردو و پنجابی میں بالکل ایک ہے۔

اُردو:۔ دیکھ۔ کھا۔ لا۔ دے۔ پی۔ نکل۔ جا۔

پنجابی:۔ دیکھ۔ کھا۔ لا۔ دیہہ۔ پی۔ نکل۔ جا۔

جمع مخاطب میں تعظیماً دونوں زبانوں میں ایک واو اضافہ کر دیا جاتا ہے

اُردو:۔ جاؤ۔ کھاؤ۔ آؤ۔ اٹھو۔ چلو۔

پنجابی:۔ جاؤ۔ کھاؤ۔ آؤ۔ اٹھو۔ چلو۔

(و) مصدر بمعنی امر دونوں زبانوں میں مستعمل ہے۔

اُردو:۔ پڑھنا۔ سر کرنا۔ آنا۔ جانا۔ یاد رکھنا۔ بھول نہ جانا۔ سلام کہنا وغیرہ۔

پنجابی:۔ پڑھناں۔ سر کرناں۔ آؤناں۔ جاوناں۔ یاد رکھناں۔

عبد الحکیم:۔ ؎

نگہ یک طور میں تھوں یاد رکھناں   کینے تے اصلاں نوں پڑھناں

(ب) اردو میں امر کے بجائے "بڑھا کر مصدر" اور امر کا مفہوم ادا کرتے ہیں

یہ دستور پنجابی میں بھی موجود ہے:

اردو۔ مصرع ؎

سنتا ہی نہیں میری دیوانہ کو کیا کہئے

غالب ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار — اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

میر صاحب ؎

داد و فریاد جا بجا کریے — شاید اُس کے بھی واں میں جا کریے

پنجابی - وارث شاہ ؎

جدوں عشق دے کم نوں ہتھ لائیے پہلاں بنّا نام دھیائیے جی

پھر نبی رسول پیغمبراں نوں اُم دم درود پہنچائیے جی

(ج) اس صورت میں بعض اوقات "ی" ، جیم سے بدل بھی جاتی ہے۔ اور "جے" بنا لیا جاتا ہے۔ یہ شکل بھی دونوں زبانوں میں موجود ہے :۔

اُردو - میر تقی میر ؎

ملا یا رب کہیں اس صید افگن سر بسر کیں کو — کر افشاں کیجے خوں اپنے سے اسکے دامن و کو

پنجابی - عبد الحکیم ؎

اکھن یار دکانی تدبیر کیجے — کدی باہر مینجے یار دیجے (یوسف زلیخا صفحہ ۳۴)

دکنی اُردو میں بھی "جے" نون غنہ کے ساتھ بھی ملتی ہے :۔

محمد امین ؎

اپن گر من اوپر تا خون کیجیں — جے یہ مطلب پدر سوں دور کیجیں

ایضاً

پھیں سونگا ہن اس کر کر بیجیں   سمجھ کر دل بہتر یہ کام کیجیں

مغربی مصنفین کہتے ہیں کہ "ہے" پنجابی میں اردو سے آئی ہے۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ پنجابی کی مضارع اور ماضی احتمالی میں یہ شکل پہلے سے موجود ہے اور صیغۂ جمع متکلم میں ملتی ہے۔ پھر اسے اردو سے لینے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ ابتدا میں یہ صرف جمع متکلم کا صیغہ تھا۔ بعد میں اس کا استعمال جمع مخاطب اور واحد مخاطب پر بھی تعظیماً ہونے لگا۔

(۱۷) "گا" پنجابی میں حال کے معنی بھی دیتا ہے۔ اردو میں اگرچہ اب تحریر میں متروک ہے۔ لیکن عوام بولتے ہیں۔ پُرانے کلام میں موجود ہے۔

اُردو:۔ وہ ہیگا۔ وہ ہیںگے۔ تو ہیگا۔ تم ہوگے۔ میں ہونگا۔ ہم ہیںگے۔

پنجابی:۔ اوہ ہیگا۔ اوہ ہینگے۔ (ہنگے) توں ہینگا۔ تسی ہوگے۔ میں ہانگا۔ ہم ہینگے۔ (ہانگے)

اُردو:۔ وہ ہیگی۔ ہینگی۔ تو ہیگی۔ تم ہوگی۔ میں ہونگی۔ ہم ہینگی۔

پنجابی:۔ اوہ ہیگی۔ اوہ ہینگیاں۔ تو ہینگی۔ تم ہوگیاں۔ میں ہانگی۔ ہم ہانگیاں

میرتقی میر

ابر اٹھا تھا کعبہ سے اور جھوم پڑا مےخانہ پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہیگا شیشہ اور پیمانہ پر

(۱۸) دعائیہ اردو اور پنجابی میں ایک ہی طریق پر ہے۔

اُردو:۔ تجھے سانپ ڈسے۔

پنجابی:۔ تینوں سپ لڑے۔

(۱۹) لازمی و متعدی کا دونوں زبانوں میں وہی اصول ہے۔ اور متعدی بالواسطہ کا بھی وہی قاعدہ ہے۔

اُردو:۔ سیکھنا۔ سکھانا۔ سکھلانا۔ اٹھنا۔ اٹھانا۔ اٹھوانا۔ جگنا۔ جگانا۔ جگوانا۔ گلنا۔ گلانا۔ گلوانا۔

پنجابی:۔ سکھنا۔ سکھاونا۔ سکھلاونا (سکھالنا) اٹھنا۔ اٹھاونا۔ اٹھواونا۔ جگنا۔ جگاونا۔ جگواونا۔ گلنا۔ گالنا۔ گلواونا۔

اُردو:۔ ٹوٹنا۔ توڑنا۔ توڑوانا۔ جلنا۔ جلانا۔ جلوانا۔ پگھلنا۔ پگھلانا۔ پگھلوانا۔

پنجابی:۔ ٹٹنا۔ توڑنا۔ تڑواونا۔ جلنا۔ جالنا۔ جلانا۔ پگھلنا۔ پگھالنا۔ پگھلواونا۔

اردو میں بھی "جالنا، بالنا" وغیرہ کا رواج تھا۔ جواب متروک ہے۔ احمد دکنی

کتیا توں جلے ہور جاسے منجے   تیا کیا گلے ہور گا ے منجے

(۲۰) معروف و مجہول کا وہی طریقہ ہے۔ پنجابی میں بھی "جانے" کی تصریف سے مجہول بنایا جاتا ہے۔

اُردو:۔ لڑکی ماری گئی ۔ لڑکا مارا گیا۔

پنجابی:۔ کڑی ماری گئی ۔ منڈا مارا گیا۔

(۲۱) ندائیہ میں دونوں زبانیں متفق ہیں۔

اُردو:۔ اے لڑکو ۔ او لڑکیو ۔ اے لڑکے ۔ اے بھائیو ۔ او بیرحم ۔ او گدھے۔

پنجابی:۔ اے یا او منڈیو ۔ اے یا کڑیو ۔ او منڈیا ۔ اے بھراؤ ۔ او بیرحم او کھوتیا۔

(۲۲) نفی کے دیسی معمولی کلمے ۔ مثلاً نہ ۔ نا ۔ ناں ۔ نہیں ۔ نیں ۔ ناہی ۔ ناہیں۔ پنجابی میں بھی آتے ہیں ۔ جو ایک زمانہ میں اُردو میں بھی مستعمل تھے۔

جس موقعہ پر اردو میں نہ کرو ۔ اور نہ جاؤ کہیں گے ۔ ایسی جگہ اہل پنجاب نا کرو اور نہ جاؤ کہیں گے ۔ مثلاً حبیب الحکیم کہتے ہیں ؎

ولیکن ایہ خیانت نہ کریساں ایہو رکا مٹھے اپنے نہ لیساں

دیگر ؎

اسی گل تے مرادل نا کرو سی جو جیتیوں دیہ سخن مولی نہ ہوسی

گویا "نا" زیادہ تر تاکید کے لئے آتا ہے ۔ دکنی میں بھی "نا" موجود ہے۔ احمد دکنی قطب شاہی ؎

جو بندیاں تھے نا ہوئے گنہ کا ظہور تو کس داہ ہوئے نام تیرا غفور

دیگر ؎

رہا یوں سکی ساتھ موحیط ہوے   جو ناد ودھ پیوے خوشی سوں نسو ہے

پنجابی میں اس کی ایک شکل "ناں" بھی ہے۔ جو دکنی اردو میں بھی ملتی ہے۔

محمد امین دکنی ؎

یوسف کی جگہ میں کیوں ہوا ناں   اے قاتل اگر میرا کیوں ہوا ناں

دیگر ؎

اکیلی ایک ساعت چھوڑتی ناں   شفقت دل ستی دے توڑتی ناں

(۶۳) امدادی افعال کے ذریعہ سے مختلف مقاصد کے اظہار کے لیے افعال مرکب بنا لینے کا طریقہ دونوں زبانوں میں رائج ہے۔ اردو میں اس کے لئے افعال آنا۔ ہونا۔ چکنا۔ رہنا۔ لگنا۔ سکنا۔ بیٹھنا۔ پڑنا۔ دینا۔ لینا۔ ڈالنا۔ جانا۔ کرنا۔ چلنا۔ کھانا۔ وغیرہ زیادہ مستعمل ہیں۔ ان میں سے اکثر افعال پنجابی میں بھی یہی مطلب دیتے ہیں۔ میں بعض کی مثالیں دیتا ہوں :۔

(۱) سکنا۔ وارث شاہ ؎

کی صفت ہزارے دی کر سکاں گویا بہشت زمین تے آیا ہے

(۲) عبد الحکیم ؎

بہشتاں نوں بنا بیٹھے نکانہ

(۳) بھیج جانا۔ (۴) میں کم کر چکیا ہاں۔ (۵) بانگ دین لگیا۔ (۶) اوہ ہسدا رہندا اے۔ (۷) مننا چلا گیا :۔

عربی و فارسی الفاظ کی ترکیب سے جس طرح اُردو میں بے شمار مصادر بنائے گئے ہیں۔ پنجابی میں بھی اسی طرح بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً۔ روشن کرنا۔ قربان کرنا۔ خاموش کرنا۔ ہوش آنا۔ مقصود پانا۔ داغ پانا۔ گرفتار ہونا۔ حیران ہونا۔ سیر کرنا۔ آرام پانا شور کرنا۔ فرمان دینا وغیرہ ؛

گذشتہ سطور کے مطالعہ سے ہم پر یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ اُردو اور پنجابی کی صرف کا قوام تمام تر ایک ہی منصوبہ کے زیر اثر طیار ہوا ہے۔ ان کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تصریف کا اتحاد اسی ایک نتیجہ کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے۔ اور جب سیانی ہو گئی ہیں۔ تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔ ان زبانوں میں جو اختلاف دیکھا جاتا ہے۔ وہ اکثر اس وقت واقع ہوا ہے۔ جب اردو کی پرورش شعرا اور تعلیم یافتہ طبقہ نے دہلی اور لکھنؤ میں شروع کی ہے۔ انہوں نے اپنی دانست میں اردو کی اصلاح کی۔ مگر اکثر موقعوں پر دیکھا جاتا ہے۔ کہ ان کی اصلاح اور ترمیم کے اصول نے ایک صرفی کے نقطۂ نظر سے زبان کے قواعد میں ابتری اور برہمی پیدا کر دی ہے۔ قدیم اصول جن پر زبان کی تعمیر ہوئی تھی۔ جامع۔ مفید اور کارآمد تھے۔ پرانی جمع کے قاعدہ کو انہوں نے بالکل بیکار اور باطل کر دیا۔ اقلیم زبان سے حروف ثقلت و نون غنہ

کے اخراج میں ہم اُن سے متفق ہو سکتے ہیں لیکن افعال و اسما سے جمع مونث کے ترک کرنے میں ہرگز ہرگز حق بجانب نہیں۔ اس نے زبان سے موسیقیت اور خوش آہنگی کے ایک بڑے عنصر کو برباد کر دیا ہے۔ کیا کوئی شخص میرزا سودا کے ان اشعار کی خوشنوائی سے انکار کر سکتا ہے۔ جو پرانی طرز میں لکھے گئے ہیں:۔

خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں — اے فلک بازی تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں
وہ رہا دستِ تاسف کے تئیں ملتا ہوا — جن نے وہ انکھیاں خمار آلودہ ملیاں دیکھیاں

اردو میں قدیم زمانہ میں مرفوعی۔ منصوبی اور مجروری حالتوں کے لحاظ سے تین شکلیں رائج ہوئیں۔ یعنی غماں۔ غموں۔ غمیں۔ پاساں۔ پاسوں۔ پاسیں۔ فکراں۔ فکروں۔ فکریں؛ پیچھاں۔ پیچھوں۔ پیچھیں؛ راتاں۔ راتوں۔ راتیں؛ کدہاں۔ کدہوں۔ کدہیں؛ جدہاں۔ جدہوں۔ جدہیں؛ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن بعد میں ان کے استعمال میں بیقاعدگی ہونے لگی۔ اور حالت نصبی و مرفوعی و جاری میں لوگ خلط ملط کرنے لگے یہاں تک کہ قاعدہ بالکل ٹوٹ گیا۔ آج مونث کے علاوہ مذکر اسما کے ساتھ کبھی یہ تینوں حالتیں نہیں ملتیں۔ جیسے لڑکیاں لڑکیوں۔ لڑکیں۔ اسی طرح ہم کی شکل ہماں۔ ہموں اور ہمیں ہونی چاہیے۔ لیکن ہماں نہ آج ملتا ہے۔ نہ پرانے شعرا میں۔ ہموں متاخرین نے ترک کر دیا۔ لیکن پرانے شعرا میں ملتا ہے۔ محمد امین کہتے ہیں:۔

توہم اک باگ کو ماریں گے دس مل — ہموں کو کیا تمہیں بوجھے جو کابل

دیگر ؎

ہموں نے دیکھ اس کو گھاؤ کھائی ۔ بدن اوپر چھریاں ہاتھوں لگائی

ہمیں خدا کے فضل سے آج بھی زندہ سلامت ہے۔ علیٰ ہٰذا غماں، غموں اور غمیں ہیں متاخرین نے غماں اور غمیں دونوں کو مہجور الاستعمال کر دیا۔ غموں آج تک چلتا ہے۔ غماں گذشتہ صدی میں ترک ہوا جس کی مثال کی کوئی ضرورت نہیں رہا غمیں اس کی مثال سنیئے محمد امین ؎

تیں اول پی پکھوں تے تے امین کو ۔ امیں پی کر بھلادے سب غمیں کو

غمیں جاوے نکل کر خرمی آنے ۔ تری امداد سیتی مرتبہ پاسے

راتاں کچھ عرصہ قبل ترک ہوا ہے۔ راتوں اور راتیں آج بھی قائم ہیں مگر یاساں، یاسوں، یاسیں آج بالکل متروک ہیں۔ ان کی یادگار یاس باقی رہ گیا ہے۔ اسی طرح گدہاں۔ گدہوں گدہیں، جدہاں، جدہوں۔ جدہیں اردو سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ ان امور سے یہ امر منکشف ہوتا ہے۔ کہ زبان کا دائرہ روز بروز تنگ اور محدود ہوتا جا رہا ہے۔

آمدم بر سر مطلب۔ ابھی تک ہم نے صرفیانہ طریق پر دونوں زبانوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ذیل میں ہم ایسے مواد پر نظر ڈالیں گے جو دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اردو اور پنجابی میں عام ہے۔ ہم نے اس غرض سے مروجہ اردو سے اعراض کر کے ایسے نمونوں کو لیا ہے جو قدیم اردو سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جن کا اکثر حصہ آج

متروک الاستعمال قرار دیا گیا ہے۔ دوسری طرف وہی مواد پنجابی زبان میں بجنسہٖ یا کسی قدر تغیر کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ اس مطلب کیلئے میں نے دکنی اردو کو لیا ہے۔ جس کے ادبیات کی قدامت اردو میں مسلم ہے ؛

(۱) سب سے پیشتر ان زبانوں کی وحدت و جمعیت کے قواعد کے متعلق کچھ کسی قدر اور جاننے کی ضرورت ہے۔ ان زبانوں کی جمع کا اثر تمام جملہ پر محیط ہے۔ وہ نہ صرف جملہ کے فاعل بلکہ اس کے متعلقات یعنی اسمائے صفات۔ اضافات حالیہ ضمائر۔ افعال اور ان کے توابعات تک پر آ پڑتا ہے۔ اس کی طاقت کے اندازہ کے لیے ہم ذیل کا جملہ ناظرین کو پیش کرتے ہیں ؛

مرنے والی لڑکیوں کی مائیں روتی روتی کہتی تھیں ؛

پنجابی میں یہی فقرہ آج یوں لکھا جائیگا ؛

مرن والیاں کڑیاں دیاں ماواں روندیاں روندیاں کہندیاں سن ؛

اردوئے قدیم میں اس طرح لکھا جاتا :۔

مرنے والیاں لڑکیاں کیاں مائیاں روتیاں روتیاں کہتیاں تھیاں ؛

گویا پورا جملہ جمع کا گلدستہ بن گیا ہے۔ میں بعض مثالیں اور یہاں درج کرتا ہوں :۔

عبد الحکیم پنجابی ؎

کیتو سو تیار نے زخمی ہزاراں ترے قیدیاں زخمیاں لایاں قطاراں

دیگر ؎

بی بی سریاں غلاماں سی ہزاراں　　جو کھڑیاں ہر طرف لیاں قطاراں

احمد دکنی قطب شاہی ؎

جو موڈاں کو نلی سو کو ناں نہال　　سو کونلیاں کلیاں لک کھلیاں نت نکال

محمد امین دکنی ؎

گیاں نعیاں آسماں اوپر مدے قُدلیاں　　انوں پھرتے فرشتے مثل چڑیاں

ایضاً ؎

تری اور بوت جہانجھاں باجتیاں تھیاں　　نغزاں کی آوازاں گم جتیاں ننھیاں

اس قاعدہ کی دکن اور پنجاب کے ساتھ خصوصیت نہ تھی۔ بلکہ دہلی کے فصحا بھی اسی رنگ میں لکھتے تھے۔ میں یہاں سودا کا ایک اور شعر نقل کرتا ہوں ؎

جب ہوں پہ یار کے مسی کی دھڑیاں دیکھیاں
جوں زحل کی ساعتیں اس دل پہ کڑیاں دیکھیاں

(۲) پنجابی میں آ۔ جا۔ کھا وغیرہ امر کے علاوہ ایک اور امر ہے۔ جو معمولی امر کے آخر میں "ئیں" یا "ویں" کے لانے سے بنتا ہے۔ جیسے آویں جاویں، لاویں، کھاویں، ڈالیں وغیرہ پنجابی شاعر عبدالحکیم کہتے ہیں ؎

الٰہی معرفت اپنی دسائیں　　شفیع ساڈا رسول اللہ کرائیں

دیگر ؎

جدوں کنعان شہر اندر سدھاویں　　پھر اک رات ڈیرے ناہیں کرجاویں

جہاں تک معلوم ہے۔ امر کی یہ شکل خاص پنجاب کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسری زبانوں میں نہیں ملتی۔ لیکن بہت کم لوگ اس امر سے واقف ہیں کہ قدیم اردو میں بھی یہ شکل موجود تھی۔ چنانچہ محمد امین دکنی ؎

امیں مل میں خدا کا عشق راکہیں   مجازی عشق کوں سب کار مناکہیں

دیگر ؎

مرے محبوب کو عزت سوں لٹھیں   براق جلتی اوپر بٹھائیں   (یوسف زلیخا)

محمد خوب اپنی مثنوی خوب ترنگ تالیف ۹۸۶ھ میں لکھتے ہیں:۔

جس مجنوں تھا بہلی شاں   دوں مجنوں مت کریں گماں

دیگر ؎

یہ لیلیٰ کا پہلا چال لو   خوبیں سمجھیں نہیں اتال

شاہ میرانجی شمس العشاق متوفی ۹۰۲ھ:۔

ایسا کبرا کرب نرا کہیں جے توں ہوسی سورا

ان راکھ مرشد ملاوے جس ہے گیان سپورا   (اردو حصہ بست و ششم ص ۱۸۱)

(۲) "گا" قسم کے مستقبل کے علاوہ جو پنجابی اور اردو میں عام ہے پنجابی میں ایک اور مستقبل ہے۔ جو "سی" کی تصریف سے بنتا ہے۔ اسکا تعلق زیادہ تر لہندا یا ملتانی سے ہے۔ اس مستقبل کا صیغۂ واحد غائب دکنی میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ احمد دکنی قطب شاہی ؎

کدیں پیچ شک سنگ ملسی نہ منجھ   کدیں من کمل پھول کھل سی نہ منجھ (لیلیٰ مجنوں)

دلی دکنی سے

کہا ہے زہر کا تاثیر اس میں

نہ چل سی کچھ مرا تدبیر اس میں   (روضۃ الشہدا صفحہ ۴۹)

بقول مولوی عبدالحق صاحب کتاب سبرس مولانا وجہی نے ۱۰۴۵ھ کے لگ بھگ طیار کی ہے۔ اس میں فقرۂ ذیل ملتا ہے:۔

جس میں عشق کا کچھ درد اس کتاب کو پڑھنے پڑنے ہلاسی نا۔ اس کتاب بغیر اپنا وقت بہلاسی نا۔

مولوی عبدالحق صاحب نے رسالۂ اردو حصہ بست و ششم میں میرانجی شمس العشاق کی تصنیفات پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں شعر ذیل ملتا ہے:۔

نون جس کو بہا دسے چھوڑ   ناجا سی یہ گن چھوڑ   (صفحہ ۱۹۶)

"سی" کی جس قدر مثالیں ملتی ہیں۔ سب صیغۂ واحد غائب میں ہیں۔ یہ مستقبل ہندوستان کی کئی زبانوں میں ملتا ہے۔ مثلاً گجراتی۔ مارواڑی جیسلمیری۔ نیماڑی۔ اور ملتانی جن کی تصریف حسب ذیل ہے:۔

گجراتی:۔

ہوں مارس۔ تو مارسے۔ تے مارسے۔ ہم ماری سوں سنے مارسو۔ تیو مارسے

مارواڑی جیسلمیری:۔

ہوں مارس - تو مارس - او مارسے - مُھتے مارساں - تُمے مارسو - او مارسے -

چے پوری :-

ہوں مارشوں - تو مارشی - او مارشی - مہے مارشاں - تُمے مارشو - او مارشی -

(بعض علاقوں میں سینِ مہملہ کے ساتھ بولا جاتا ہے)

نیماڑی :-

ہوں مارس - تو مارس - وہ مارسے - ہم مارساں - تم مارسو - وہ مارسے -

ملتانی :-

مَیں مرسیاں - تو مریسیں - او مریسی - اساں مریسوں - توساں مریسو - او مریسن

مریسیں -

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہی قسم کا مستقبل دکنی زبان میں کہاں سے لیا گیا ہے - ہماری نظریں قدرتاً گجراتی زبان پر پڑتی ہیں - جو ہمسایہ زبان ہے - لیکن گجراتی میں یہ صیغہ بایائے مجہول ہے (یا "شے" بایائے مجہول جیسا کہ سورت میں بولتے ہیں) اور دکنی میں بایائے معروف ہے - اس لئے گجراتی سے ماخوذ نہیں - بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجپوتانہ سے آیا ہو - کیونکہ مولوی عبدالحق صاحب نے اس کی جو اور شکلیں دی ہیں یہ ہیں :-

ہمیں ناکرسیں - نادیکھسوں - کرسوں - کہسوں (صفحہ ۵۴۳ - رسالہ اردو - حصہ بست و یکم) -

اور جواہر اسرار اللہ علیجیو گام دہنی ہیں یہ شکلیں ہیں :

واحد غائب :-

کریسو۔ کریگا الھوے گھونگٹ گل لاوے تھند را کریسو پیتاں سیتاں اکریسو

باتاں۔ باتیں کریگا۔ جاسی : جائیگا۔ ملاسی : ملائیگا :

واحد حاضر :-

دیکھسی توں : تو دیکھیگا۔ توکرسی : تو کریگا :

واحد متکلم :-

جاں دیسوں۔ جانے : دونگا۔ دہرسوں۔ دہرونگا۔ ملے سوں : ملونگا۔

ملوں سو۔ ملونگا۔ کروں سو : کرونگا۔ ہُوں سو : مَیں ہوں۔

احمد دکنی :-

تجھے نت من مت سوں ستاوی نُرتّ برہ کی خماری سے ہیں سو خراب

(۴) "کھرا" اُردو میں عام طور پر آتا ہے۔ اس سے کھرا ہونا اور کھرا

رہنا وغیرہ مصادر بنا لیے گئے ہیں۔ اور محاورے بھی بنائے ہیں۔ اہل لغات

اس کا ماخذ پراکرت کا "کھڈ وا" بتاتے ہیں۔ اس توجیہ کے بجائے میں یہ

مناسب سمجھتا ہوں کہ پنجابی مصدر "کھڑنا" کی ماضی یا اسم مفعول مان لیا

جائے۔ کھڑنا کے معنے پنجابی میں چلنا اور ٹھہرنا ہیں۔ پچھلے معنے کے اشعار

ملاحظہ ہوں :

عبدالحکیم : ؎

کہیا یک سُن اساڈی گال کھڑکے ۔۔۔ کہیا کوئی نہیں ہیں نال کھڑکے

دیگر ؎

بی بی سدیاں غلاماں سی ہزاراں ۔۔۔ جو کھڑیاں ہر طرف ملیاں قطاراں

دکنی میں اکبری عہد کے شعرا میں یہ مصدر موجود ہے ۔ احمد دکنی ؎

کہاں قیس سوں تجھ نسبت کھڑے ۔۔۔ جو استھی ہماری کا شرم بہیں پڑے

دیگر ؎

اگر اپنی جد سے پر کرٹ پڑے ۔۔۔ پچھانے جدہاں کام اگر کھڑے

افسوس ہے کہ ایسا مفید اور کار آمد مصدر ہماری زبان سے متروک ہو گیا ؛

(۵) "تھا" اس غریب کو لغات نگاروں نے مصدر "ہونا" کا پسر خواندہ بنا دیا ہے ۔ ان کا بیان ہے کہ یہ "ہونا" کی ماضی ہے ۔ جب یہ کہا جائے کہ ہونا کی ماضی "ہوا" ہے ۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ہاں وہ بھی ہے ۔ اور یہ بھی ۔ سنسکرت اور پراکرت کی ٹٹی کی آڑ میں خدا جانے ہم سے کیا کیا قبول کرایا جا رہا ہے ۔ لیکن ایک موٹی سی بات یہ ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر لفظ سنسکرت کے ماخذ سے نکالا جائے اب میں بجائے اس کے کہ "تھا" کو "ہونا" کے گلے باندھوں اور پھر ہونا کو سنسکرت کے "بھو" سے استخراج کروں ، یہ زیادہ موزوں سمجھتا ہوں کہ اسکو ملتانی زبان کے مصدر "تھیونا" (بمعنی ہونا) کی ماضی مان لوں ۔ تھیونا کی ماضی تھیا

آئی ہے۔ اُردو والوں نے اسے پائے اہتمام سمجھ کر اڑا دیا۔ اور تھا بنا لیا تھیا اس قدر قدیم ہے کہ ہندی کا سب سے قدیم جملہ جو ہمیں تاریخ میں ملتا ہے۔ اس میں موجود ہے وہ جملہ یہ ہے:۔

"برکت شیخ تھیا اک موا اک نہا" (تاریخ فیروز شاہی من شمس سراج عفیف صـ۲۲۱)

اس جملہ میں ایک خوبی یہ ہے کہ اسے سندھی بھی کہا جا سکتا ہے۔ پنجابی بھی اور اُردو بھی۔ سندھ پر محمد تغلق ۷۵۲ھ ابھی حملہ کر رہی رہا تھا کہ فوت ہو گیا۔ فیروز شاہ نے اپنی تخت نشینی کے بعد پھر سندھ پر حملہ کیا۔ لیکن فوج میں قحط اور جانوروں میں وبا پھیل گئی۔ اس بنا پر وہ سندھ کا محاصرہ چھوڑ کر براہ ریگستان گجرات روانہ ہو گیا۔ اس وقت ہمارا مؤرخ لکھتا ہے کہ سندھیوں نے یہ جملہ کہا۔ اس جملہ کا مطلب ہے کہ شیخ کی برکت سے ہمارا ایک دشمن مر گیا۔ اور ایک بھاگ گیا۔

پنجابی سے دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

مولوی عبداللہ ؎

اوّل صفت ثنا ربینوں رب تھیں بعد رسول
پڑھو صلواتاں حضرت بہجو دائم تھیو قبول (نص فرائض صـ۵)

دیگر ؎

حضرت سایہ زمیں نہ پوندا حکمت نت بجھ کیا
مت سایہ تے کو پیر دھرے سایہ منع تھیا (نص فرائض صـ۶)

(۶) پنجابی میں بعض مصادر کی ماضی خلاف قاعدہ آیا کرتی ہے ۔ مثلاً کرنے لینے دینے اور ہونے کی ماضی کیتا، دتا، لیتا اور ہویا بھی آتی ہے ۔ جو واحد جمع اور تانیث کی صورت میں ملتی ہے ۔ برج بھاشا، راجستانی اور اودھی میں بالکل غیر مستعمل ہے لیکن قدیم اردو میں کثرت کے ساتھ ملتی ہے ۔ پنجابی کی مثالیں دینا فضول ہے ۔ اس لئے کہ آج بھی اس ماضی کا رواج عام ہے ۔ لیکن میں اردو کی مثالیں دیتا ہوں :-

احمد دکنی ؎

اگیانی دے گیان سیتیں جواب　　　دیتا ہور کیتا اوب سوں خطاب

دیگر :- ؎

فرشتے جو آدم کوں سجدہ کیتے　　　سو بہ مان اوّم ہجن تھے لیتے (لیلیٰ مجنوں)

محمد امین ؎

بنی جا گئے انہوں نے عرض کیتی　　　بڑائی رب نے تم کوں آج دیتی

دیگر ؎

جو کچھ تم نے لیا سو ہم نے لیتا　　　جو کچھ تم نے کیا سو ہم نے کیتا (یوسف زلیخا)

برج بھاشا و دیگر زبانوں میں اس کے مقابلہ میں کینا ۔ دینا اور کینو ۔ دینو وغیرہ ملتا ہے ۔ مثلاً سور داس ؎

و صنیلنی ہوئر گرت آپس میں شیام کھلونا کینو ری

سور داس پربھو برہم ستاتن ست بنکاری دودلینو ری

اور محمد جائیسی سے

سو بنیکے راج رجائیں دیہماں ۔ نیں درسن کارن تپ کینہماں

لطف یہ ہے کہ یہ شکل بھی اردو میں رائج ہے ۔ اگرچہ دکنی میں نہیں ملتی محمد افضل جھنجانوی سے

بہت مدت ہوئی آون نکینا ۔ نہ کاگت ہی کسی کوں لکھ دینا (۱ لکھٹ کہانی)

(۷) پنجابی میں قاعدہ ہے۔ کہ غیر زبان کے الفاظ کے آخر میں اکثر ایک یائے زائدہ اضافہ کر دیا کرتے ہیں جس کے بظاہر کوئی معنے نہیں ہوتے ۔ جیسے نظر سے نظری اور حیات سے حیاتی ۔ چنانچہ عبدالحکیم سے

میں تیرے دامن اندر دست پایا ۔ تیرے جیہا کوئی نظری نہ آیا

• دیگر سے

اپی یک رات خوش دنگموں لگائی ۔ پیاو ہے چ زندگی عالم سمائی

دکنی میں بھی یہ دستور موجود ہے ۔ محمد قلی قطب شاہ متوفی ۱۰۲۰ھ

کہو رات کن سات کیتی ہیں باتاں ۔ کہ چوتا ہے تم میں تھے رنگ خماری

احمد دکنی قطب شاہی شاعر دربار محمد قلی قطب شاہ سے

تجھے نت من مت ہوا شادی قمر بد ۔ وہ کی خماری تجھے میں ہے سو خراب (دیلی مجنوںا)

محمد امین سے

غمی دے کر خوشی کوں مار کاڑے ۔ زمانہ یوں بہت عالم کوں پاڑے

ایضاً ۔ ہماری موت اور ان کی حیاتی ۔ اگر ہوتی تو مجھ کوں یہ خوش آتی

ایضاً غوری کا پیالہ جن پیسا ہے لئے اپنے سر اوپر دکھ دیا ہے
اگر یہ موت مجھ دیتا الٰہی لئے یوسف کے تئیں دیتا پناہی (یوسف زلیخا)

ولی دکنی ؎

یہ خاک کربلا کی ہے نشانی نوں مہر رخ ہوئیگا جس میں نہانی (روضۃ الشہداتیں)

یہ قاعدہ اردو میں بہت دیر تک رہا ہے حتیٰ کہ خواجہ آتش کے ہاں بھی ملتا ہے۔ چنانچہ ؎

بہار گلستاں کی ہے آمد آمد خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

اور اب بالکل متروک ہے مجھے معلوم نہیں کہ اہل اردو اس "ی" کی کیا توجیہ بیان کرتے ہیں :

(۸) مانگا تانگا اور مانگے تانگے ایک محاورہ ہے۔ اور اردو میں بالعموم مستعمل ہے اس کے لئے اہل لغات کہتے ہیں کہ :۔

" مانگا تانگا = ہ = صفت : اوّل بمعنی مانگا ہوا ۔ دوم تابع مہمل ۔ قرض لیا ہوا۔ اُدھار لیا ہوا ۔ مستعار لیا ہوا ۔ عاریتاً لیا ہوا " (فرہنگ آصفیہ)

اور مانگے تانگے کے لئے کہا ہے :۔

" مانگے تانگے : ۔ ہ ۔ تابع فعل ۔ مانگے مونگے ۔ مانگ تانگ کر ۔ مستعار لے کر اُدھار لے کر ۔ جیسے مانگے تانگے کام چلے تو بیاہ کرتے بلا ۔ یعنی کام جب ہی چلتا ہے ۔ جب اپنی گرہ سے صرف کیا جائے " (فرہنگ آصفیہ)

ہمارے لغت نگار تانگا اور تانگے کو تابع مہمل کہتے ہیں ۔ اور مجھے نہیں معلوم

ان کے پاس اس کے کیا وجوہ ہیں۔ میں نے کئی دوستوں سے جن کا پایہ اردو میں بلند ہے دریافت کیا۔ بعض نے کہا کہ تانگا مہمل ہے۔ اور بعض نے کہا کہ عبارت میں موسیقیت پیدا کرنے کے لئے ایک ہموزن مصنوعی لفظ گھڑ لیا گیا ہے۔ قصہ مختصر اُردو میں ایسے بیسیوں الفاظ ہیں جن کو ہمارے اہل لغات نے بے معنے سمجھ کر تابع مہمل کی ذیل میں داخل کر دیا ہے؛

جب ہم پنجابی زبان پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ بامعنی ہے اور مصدر تانگنا سے مشتق ہے۔ اور مانگنا کا مرادف ہے۔ عبدالحکیم ؎

نہیں لکن کسے وی تانگ دسنوں عزیز مصر لائی سانگ اوسنوں

دیگر ؎ سائیں عشق تیری بانگ اوسنوں رہے ہردم تساڈی تانگ اوسنوں

اور فعل کی مثال میں یہ شعر:-

زلیخا جے زلف دی تار تانگے کہے یوسف پھیری لے کال لنگے (یوسف زلیخا)

(۹) اسی طرح چُپ چپاتے اور چپ چپاتا ہے جس میں چپاتے کو اہل اُردو تابع مہمل مانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ چپاتا محض حسن کلام کے لئے بڑھا دیا گیا ہے۔ اور بے معنی ہے لیکن جب پنجابی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ بامعنی لفظ ہے۔ کیونکہ اس زبان میں برخلاف اُردو کے وہ علیحدہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ عبدالحکیم ؎

جدوں یعقوب اس گل نوں پچھاتا عذرا کہن کنوں ہو یا چپاتا

چپانا، چپ کا مترادف ہے :۔

(۱۰) درن دہاڑے ایک اور محاورہ ہے ۔ اہل اردو دہاڑے کو بھی تابع مہمل مانتے ہیں اور حسب معمول غلطی پر ہیں ۔ دہاڑا درحقیقت پنجابی لفظ ہے اور دن کے معنے دیتا ہے ۔ اور اُردو کے برخلاف تنہا مستعمل ہوتا ہے ۔ عبدالحکیم ؎

آیا جو نیہے دہاڑے قافلہ گھیرنا ۔۔۔ شہر مدین کنوں اس کھو دے پھیر

(۱۱) اسی طرح ہلنا چلنا اور ہل چل وغیرہ ہیں ۔ اس میں اُردو خوان چلنے کو ہلنے کا تابع مانتے ہیں جس کے کوئی معنے نہیں بتاتے ۔ حالانکہ پنجابی میں چلنا چلنے کے معنے میں آتا ہے ۔ اور آج بھی مستعمل ہے ۔ قدمائے اردو اس لفظ سے واقف تھے ۔ امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

من کہ بہ سر می نہادم گلی ۔۔۔ بارہ برسر نہادہ و گفتا چل

یہ محاورے ہمیں ان ایام کی یاد دلاتے ہیں جب کہ مسلمان لاہور سے کوچ کر کے دہلی جا کر آباد ہو گئے ہیں ۔ اور اپنی زبان میں دہلی کی زبان کا پیوند لگا رہے ہیں ۔ کیونکہ یہ محاورے ہماری الفاظ اور ان کے مرادف پنجابی الفاظ سے مل کر بنتے ہیں ۔ اسی قسم کے اور محاورے بھی ہیں ۔ جیسے برتن بھانڈا یا باسن بھانڈا ۔ گرد چیا ۔ بھلا چنگا موٹا جھوٹا ۔ سنڈا مسٹنڈا :۔

(۱۲) یا ہے مخلوط قدیم زبانوں میں اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں ملتی ہے چنانچہ اُردو میں متروک ہے ۔ اور پنجابی میں اب بھی بدستور موجود ہے ۔ اُردو

میں اب وہ صرف دو چار الفاظ میں ملتی ہے۔ جیسے کیا اور کیوں وغیرہ۔ یائے مخلوط افعال و الفاظ میں اکثر آتی تھی۔ اور حرف ماقبل کے ساتھ مخلوط ہو کر تلفظ میں آتی تھی۔ مثلاً لکیا۔ منگیا۔ ہوبیا۔ پڑیا۔ رہیا۔ جلیا۔ چڑیا یا (چڑھا) کہیا۔ سلیائی۔ چھلیا۔ بڑیاں کا (بڑوں کا) جانیا۔ چھوٹیا۔ لکھیا۔ مانیا۔ سنگیار یا (سنگھار) دیکھیا وغیرہ۔

اس قاعدہ کا دونوں زبانوں میں اس قدر زور رہا کہ غیر زبانوں کے الفاظ پر بھی اس کا اجرا ہونے لگا۔ مثلاً دینا۔ دریا۔ اور خیال کی "ی" حرف سابق کے ساتھ ضم ہو کر بولی جاتی تھی۔ عبدالحکیم پنجابی ؎

دنے راتیں گذاریں اس طرح نال نہ ہووس دُور دلسوں یار دا خیال

احمد دکنی ؎

جو پتلی دیکھی مائی نے یو غضب وو بھی وکر دریا آگ کی موج تب

دیگر ؎

یہی ہے میرا حال اب سر و کال میرے حال کا خیال مت دیوانال

اور محمد امین دکنی ؎

دینے دیتے جب اس کا مال نکوٹا خلق سیتی تب اس کا خیال چھوٹا

بلکہ خیال کا لفظ خود میر نے اسی تلفظ کے ساتھ استعمال کیا ہے ؎

عشق برے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

میر صاحب نے حسب روایت مولانا آزاد خیال کی "ی" کے متعلق یہ عذر پیش کیا ہے:۔

"آپ بموجب اپنی کتابوں کے کہیں گے کہ خیال کی "ی" کو ظاہر کرو۔ پھر کہیں گے "کہ "ی" تقطیع میں گرتی ہے۔ مگر یہاں اس کے سوا جواب نہیں کہ محاورہ یہی ہے" (آب حیات)

(۱۳) پنجابی زبان کی ایک عالمگیر خصوصیت یہ ہے کہ تمام ایسے الفاظ کو جن میں ثانی حرف علّت ہو۔ بہ تخفیف حرف علّت تلفظ کیا جاتا ہے۔ مثلاً کان۔ ناک۔ ہاتھ اور لات پنجابی لہجہ میں کن۔ نک۔ ہتھ اور لت بن جاتے ہیں۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ ایسے الفاظ میں برج بھاشہ میں پہلے حرف کے بعد حرف علت اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً پگ پنجابی، بھاشہ میں جا کر پاگ بن گئی۔ اردو میں جو پنجابی اور بھاشہ کے بین بین ہے اس قاعدہ کا اثر بہت نمایاں ہے۔ اور دونوں زبانوں کی مقلد ہے کبھی برج کی تقلید کرتی ہے۔ اور کبھی پنجابی کی۔ اور کبھی دونوں کی۔ مثلاً اردو میں جگنا بھی بولتے ہیں۔ اور جاگنا بھی۔ لیکن اکثر موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ اردو کا میلان زیادہ تر پنجابی قاعدہ کی طرف ہے۔

اُردو	پنجابی	بھاشہ	اُردو	پنجابی	بھاشہ
کھیل	کھید۔ کھیل	کھیال	بکل	بکل	بیاکل
ہنسی	ہاسا	ہاسا۔ ہانسی	چچا	چچا۔ چاچا	چاچا
چکھنا	چکھنا	چاکھنا	کپوت	کپوتر	کاپوت
مکھی	مکھی	ماکھی	رہٹ	رہٹ	راہٹ

بھاشہ	پنجابی	اُردو	بھاشہ	پنجابی	اُردو
باندر	باندر	بندر	سانپ، سرپ	سپ	سانپ
باجنا	بجنا	بجنا	دہاتورہ	دھتورا	دہتورہ
پاٹی	پٹی		کاچا	کچا	کچا
بھانگ	بھنگ	بھنگ	ناہر	نہر	متروک ہے
ماچھر	مچھر	مچھر	پاتھر	پتھر	پتھر
پاکا	پکا	پکا	کاندھا	کندھا	کندھا
جھاڑو	جھنڈو	چھوڑو	اگ	اگ	آگ
کھاٹا	کھٹا	کھٹا	جھوٹ	جھوٹھ	جھوٹ
سانچ، سلچ	سچ	سچ	ناکڑی	ٹکڑی	ٹکڑی
گاندھی	گندھی	گندھی	پاگ	پگ	پگڑی
گھانٹی	گھنٹی	گھنٹی	کانچلی	”	کینچلی
بادل	بدل	بادل، بدل	بلائی	بلی	بلی
ہاڈی	ہڈی	ہڈی	آگے	اگے	آگے
پاچھے	پچھے	پیچھے	ماٹی	مٹی	مٹی
لادنا	لدنا	لادنا، لدنا	کھٹ	×	کھٹ، کھاٹ
کھانڈ	کھنڈ	کھانڈ	بھانڈ	بھنڈ	بھانڈ

بھاشہ	پنجابی	اُردو	بھاشہ	پنجابی	اُردو
مانگنا	منگنا	مانگنا	مونگ	منگ	مونگ
توڑنا	ٹٹنا	توڑنا	پاکنا	پکنا	پکنا
جانواسہ	جنواسہ	جوانسہ	لاکڑی	لکڑی	لکڑی
ساجی	سجّی	سجّی	اچھا	اچھا	اچھا
کھیچڑی	کھچڑی	کھچڑی	کانگہ	کنگہ	کنگہ
آنڈا	آنڈا	انڈا	چاول	چول	چاول
ماٹ	مٹ	ماٹ	چالنی	×	چھلنی
چاکی	چکّی	چکّی	کال	کل	کل
پانسلی	پسلی	پسلی	پوتلی	پتلی	پتلی
چھاچ	چھچھ	چھاچ	انب سانم	انب	آم
جاموں	جمّوں	جامن	ٹھیکری	ٹھکری	ٹھکری
پھول	پھُل	پھول	ٹیکا	ٹکّا	ٹیکا
تاتا	تتّا	تتّا	ڈھانکنی	ڈھکنی	ڈھکنی
چولھا	چلھا	چولھا	تال	تل، تلا	تال، تالاب
گانڈی	گڈی	گاڑی	جاٹ	جٹ	جاٹ
ماسہ	متسا	متسا	موکی	مکّی	مکّی

بھاشہ	پنجابی	اُردو	بھاشہ	پنجابی	اُردو
ہاٹ	ہٹ	ہاٹ	مول	مُل	مول
اوکھلی	اکھلی	اوکھلی	جھاگ	جھگ	جھاگ
ریچھ	رچھ	ریچھ	کانگھی	کنگھی	کنگھی
اون	اُن	اون	آنگن	×	آنگن
بوڑھا	بڈھا	بڈھا	کام	کم	کام

(۱۷) اُسے - ایہ اور اوہ اسمائے اشارہ قریب و بعید کے لئے پنجابی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور آج بھی رات دن بولے جاتے ہیں۔ دکنی اردو میں دونوں موجود ہیں اور وہی مقصد ادا کرتے ہیں۔ پنجابی کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ دکنی کی ذیل میں عرض ہیں۔

محمد امین سے

کدھیں روتی کدھیں ہستی رتی اوہا — کدھیں چپ اور کدھیں باتاں کہتی اوہا

دیگر ے

کدھیں ہستے کے تئیں غمگیں کرے او — کدھیں غمگیں کے دل شادی بھرے او

دیگر ے

نہیں پھرتے ایسے کچھ لاگتی بار ہا — کدھوں لے بار ہے کدھوں لے انبار

دیگر ے کچھ اک گال میرے دیکھ تازہ — نہیں اسے گال کچھ محتاج غازہ

(۱۵) حالت مجروری میں پنجابی میں کسی لفظ کے آخر "ون" بڑھا دیتے ہیں مثلاً پچھوں۔ ہاتھوں یعنی پیچھے سے اور ہاتھ سے۔ عبدالحکیم ؎

پچھوں اس تھیں کری بیہوش ہو کے ۔۔۔ سوتی نا ذرہ توڑے روئے دھو کے

دکنی میں بھی یہ قاعدہ موجود ہے۔ مثلاً محمد امین ؎

بیٹی کا حال دیکھا آ کے نظروں تو ۔۔۔ کمر گئی ٹوٹ اس دہشت کی فکروں

حالت ظرفیہ میں "ین" لفظ کے آخر میں پنجابی میں لگا دیا جاتا ہے۔ مثلاً عبدالحکیم ؎

رہا ہر فرد پیغمبر دا جایا ۔۔۔ دے یوسف رہا بختیں سوایا

دکنی اردو میں بھی یہی دستور تھا۔ محمد امین ؎

بہت آرام تھا ساری خلق کوں ۔۔۔ نماری کوئی اس راتیں پلک کوں

(۱۶) بعض خلاف قیاس جمع دکنی میں ملتی ہے۔ جو پنجابی کے بہت مطابق ہے مثلاً سات کی جمع ستیں۔ دو کی جمع دوہوں۔ اور برس کی جمع براں پنجابی میں یہ جمع یوں آتی ہے۔ سیتے۔ دوہوں اور وریاں۔ احمد دکنی جو محمد قلی قطب شاہ کے دربار کے شاعر ہیں لکھتے ہیں ؎

جو احمد کرے اس دھرن سنگار ۔۔۔ سو اب شہ تھے پائے ستیں سنگار

دیگر ؎

رتن شعر کے ہیں دوہوں جگ امول ۔۔۔ دوہوں جگ چھپاؤں متن لعل رول

اور محمد امین دکنی ؎

وہ دوزخ کی اگن کوں رب نے دھوئی　　گیئں لاکھوں براں جل میں ڈبوئی

(۱۶) جب ہم مصدر کو منصرف کرنا چاہتے ہیں تو اردو میں قاعدہ ہے کہ مصدر کے آخری حرف الف کو "ی" سے بدل دیتے ہیں۔ مثلاً نکلنا سے نکلنے۔ جانا سے جانے وغیرہ بنا لیتے ہیں۔ یہ قاعدہ پنجابی میں بھی موجود ہے۔ مثلاً عبدالحکیم ؎

لبانوں دے تبسم خوں کھاونے توں　　کرے لب خندہ دل درچاونے توں

لیکن پنجابی میں زیادہ رائج طریقہ یہ ہے کہ مصدر کے آخری الف کو اسی مطلب سے گرا دیا جاتا ہے۔ مثلاً کہن لگیا۔ کہنے لگا۔ رون لگیا۔ رونے لگا۔ مارن لگیا۔ مارنے لگا وغیرہ۔ عبدالحکیم ؎

پچھے اس دے لگے گوہر وساون　　تصدق سر زلیخا دے کراون

دیگر ؎ ہویا کنعان دے وچہ کال ظاہر　　گئی نکلن خلق دی جان باہر

اب قدیم اردو اس قاعدہ میں بالکل پنجاب کی ہمنوا ہے۔ محمد افضل جھنجھانوی متوفی ۱۰۲۵ھ

اگر غم ہے تجے میری اگن کے　　کرو کچھ فکر پیارے کے ملن کا　　(بکٹ کہانی)

ولی دکنی ؎

کروں کیا وقت نیں ہے اب ملن کا　　نہ کچھ فرصت ہے اب باتاں کہن کا

دیگر ؎ لگا دل جوں لولا جل میں کا پن　　لگا جب نرگس نادی منہ کو ڈھاپن　　(دیوان ولی)

محمد امین ؎

رہی اس بات سوں عاجز ہو دائی　　زلیخا کے اگل بولن نہ پائی

(۸) اکثر ایسے مصادر ہیں۔ جو پنجابی اور اردو میں مشترک ہیں۔ لیکن یہاں بعض ایسے مصادر کا ذکر کیا جائے گا۔ جو فی زمانہ اردو میں متروک ہیں اور پنجابی میں رائج ہیں

(الف) آکھنا و کہنا اور بیان کرنا اور دریافت کرنا۔ پنجابی میں رائج ہے۔ لیکن پرانی اردو میں یہ مثال۔ محمد امین دکنی ؎

حقیقت سب تری میں تجھ کوں آکھی — نہیں اس ہی بہتر چھپائی میں راکھی

(ب) سڑنا۔ پنجابی میں جلنے کے معنوں میں آتا ہے۔ پرانی اردو میں رائج تھا۔ محمد افضل جھنجھانوی متوفی ۱۰۲۵ھ ؎

اسے اساں بچانوں عشق کرناں — تن اس آگ سوں ہرگز نہ سڑناں (بکٹ کہانی)

(ج) لوڑنا۔ ضرورت ہونا۔ پنجابی میں بالعموم آتا ہے۔ پرانی اردو میں موجود تھا۔ احمد دکنی ؎

کرے ایک نیکی تو دے دس ثواب — جو لوڑے زیادہ پہ دے بے حساب (لیلیٰ مجنوں)

(د) اپڑنا۔ پہونچنا۔ دکنی کی مثال۔ احمد دکنی ؎

جو قاصد کہے ہاتھ نامہ چڑیا — جو نوفل کے نزدیک تدرت اپڑیا

(ہ) پچھاننا۔ پہچاننا۔ پنجابی میں آج بھی پ کے بعد چھ لاتے ہیں۔ پرانی دکنی اس بارہ میں پنجابی کے دوش بدوش ہے۔ محمد امین ؎

ستارے سعد اور سب نحس جانوں — سورج اور چاند کی گردش پچھانوں لا

دیگر ؎ پڑے جس کے سو سر اوپر سو جانے — مگر حق تعالےٰ سب پچھانے لا

شاہ میراں جی شمس العشاق شرح مرغوب القلوب میں فرماتے ہیں :-

"ہور یگانہ ہوا سالک اپنے توں ۔ باج تو بندگی کتابوں ہے ۔ جوں جھالاں کا پانی جھوٹ ہے ۔ نے بندگی بی جھوٹ ہے ۔ خدا کا پچھانت باج" (رسالہ اردو حصہ بست و ششم صہ ۱۸۹)

(د) سٹنا = پھینکنا ۔ ڈالنا اور چھوڑنا پنجابی میں آج بھی موجود ہے ۔ اور بطور فعل وامدادی فعل رائج ہے ۔ لیکن احمد دکنی :-

سو جیوں عشق کے بند میں جا پٹیا   نیٹ گیان شکر عقل بکھریا ہا

دیگر سے   مجھے لوک کہتے اَرَت دے پرت   پرت چھوڑ دینی کسے ہے سکت

محمد قلی قطب شاہ سے

پنکھی سٹے ہیں سب پراں رو رو بھرے سمندراں نو

چھوڑے ہیں سب اپنے گھراں دیکھ تو زاری وھٹے لے

(ذ) بھانا = تلاش کرنا ۔ دریافت کرنا ۔ عبدالحکیم پنجابی کہتے ہیں سے

کہا یک جو کوئی کھوہا بھادیں   دی وچ چاہ یوسف نوں سٹادیں

دکنی میں انہی معنوں میں آتا ہے ۔ محمد امین سے

یقیں جو کوئی اللہ بن بھاوے   مراداں دے کبھی جگ میں نپاوے

(ر) لانا = لگانا ۔ آج بھی پنجابی میں ملتا ہے ۔ اور دکنی سے یہ مثال ۔

احمد دکنی :-

بھودن کے ناموس کوں اگ لادی سہس بوس کا ننگ مانی ملائی نا

اور محمد افضل جھنجھانوی؛ ؎

سکھی کیسی سکھی ری بہہ نیبا یا کوئل نے انب پر چھر شور لایا

(ی) پانا ء ڈالنا پنجابی میں آج بھی موجود ہے ۔ اور پرانی اُردو سے یہ مثالیں

محمد امین :۔ ؎

خدا نے یوں انہوں کے دل میں پایا عزیز مصر نام اپنا بتایا

دیگر ؎

تہیں دل اس فکر کے بیچ نہ پاؤ اٹھو جیوں آئے ہو تیوں پھر کے جاؤ

(ٹ) لڑنا ۔ پنجابی میں سانپ کے ڈسنے کے لئے آتا ہے ۔ آج بھی کثرت

سے بولا جاتا ہے ۔ دکنی میں انہی معنوں میں آتا ہے ۔ احمد دکنی کہتے ہیں ؎

جسے کیس کالی سنپولی لڑے نہ اترے سب جگ منتر پڑھے (لیلیٰ مجنوں)

دل نسنا پنجابی میں بھاگنے کے معنے دیتا ہے ۔ کسی قدر اختلاف کے ساتھ

دکنی میں بھی ملتا ہے ۔ احمد دکنی کہتے ہیں ؎

جو لیدان آئے فقیران دو راس چلی سب فقیری جگت چھوڑ نہاس

محمد امین دکنی ؎

بلا کر لائے جا کر شاہ کے پاس کہا مایا چرا کر جانتے ہیں ناس

دل دکنی ؎

دونوں ہاتاں اپس کے کھو گیا اد　　فسنگ نخاس رگا ہے للگ۔ بجاد

مَیں اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ یاد رہے کہ ان مصادر میں سے بعض ممکن ہے کہ برج یا گجراتی وا ودہی میں مل جائیں۔ لیکن سب بحیثیت مجموعی نہیں ملتے۔ اس لئے ہم اس قیاس میں حق بجانب نہیں ہیں کہ اُردو نے ان مصادر کو برج یا دیگر زبانوں سے لیا ہے بلکہ ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ یہ اس ذخیرۂ زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو مسلمان بنداہیں پنجاب سے لیکر دہلی آئے ہیں ؛

(۱۹) میں یہاں بعض ایسے الفاظ کا ذکر کرونگا جو پنجابی اور اُردو میں مشترک ہیں۔ اگرچہ اُردو میں اب مستعمل نہیں ؛

(الف) دال۔ پنجابی میں طرف کے معنے دیتا ہے۔ دکنی میں اس کی ترکیب سے دُوَلاں بمعنی دو طرفہ آتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ جو اکبر کا معاصر ہے اپنے ایک قصیدہ میں لکھتا ہے ؎

دیے فانوس کے درمیانے تماں یوں جوت دیوے کا
سوتیوں دستا دُولاں میں تمے میویاں کا بہن سادا

(ب) نال: ساتھ۔ پنجابی میں آج بھی موجود ہے۔ اُردو میں بالعموم رائج تھا۔ محمد افضل متوفی ۱۰۳۵ھ ؎

بسر یہ تخت پر ناریاں رے　　پیا کے نال بیٹھی ساریاں رے

محمد امین دکنی ؎

بیٹے ہوئے خوشی ہو کے ہموں ناں نو ہموں اس کو بھی راکھے خوش و خوش حال

دیگر ؎

انے بھی سات خوشے نیل کہنسال اتے بھی سات سوکھے تھے انوں نال نو

(ج) کان ۔ پنجابی میں معنی "واسطے" "و تئیں" آتا ہے ۔ اور دکنی میں بھی یہی معنے دیتا ہے ۔ عبد الحکیم پنجابی ؎

سو نہراں نے اوسے تائیں لیا لکھاہ میں ہاں حیران الله کان سے شاہ

احمد دکنی قطب شاہی ؎

سو کچھ مان مانس کوں کیتا عطا جو سب کچھ اسی کان پیدا کیتا نو

دیگر ؎ جت میں سدا برہ کا وکھ و کھدل مرے کان جھگڑا ارو کیوں رکھوں

(د) کیچڑ کو پنجابی میں چکڑ کہتے ہیں دکنی میں بھی چکڑ آتا ہے ۔ احمد دکنی قطب شاہی

بڈھے جو رکت ہور چکڑ میں پڑے ہنکی جو سٹے کاٹ سو تر پڑے

دیگر ؎

بچھاڑی جو کھا کر ائی بی پڑیا کٹ ہور ہانی چکڑ میں پڑیا

(ہ) گھیو ۔ پنجابی میں گھی کو کہتے ہیں ۔ پرانی اردو میں یہ لفظ بھی آتا تھا ۔ میر جعفر زٹلی عہد عالمگیر و شاہ عالم کے مصنف ہیں ۔ ان کے ہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے چنانچہ ؎

تر سے پیشہ گھیو کو سمجھائے ۔ اکھے جیو کہ جلسا بلبھیا ہیو کو یہ نوکری کا حظ ہے

(ز) چوہڑا بمعنے خاکروب پنجابی لفظ ہے۔ میر جعفر کے ہاں یہ لفظ بھی ملتا ہے

ع دبے پر کیا چوہڑے کو سلام نہ پوچھا حلال اور نہ پوچھا حرام

(ح) کھیر۔ ملتانی میں دودھ کے معنوں میں آتا ہے۔ قدیم اساتذۂ دکن بھی اسی معنی میں لاتے ہیں۔ میراں جی شمس العشاق سے

تھا دکھنیں لاگا بالک کھد نہ آوے کھیر جس کے انگو بیرم نہ جاوے اس کیوں کہنا پیر

راج دہن کو دیویں مان کرتیوں فقیر بیرم نہ چاکھے ناک جنز دو کیا بوجھیں کھیر

(۲۱) یہاں ایسے الفاظ مذکور ہیں جو پنجابی لہجہ میں اُردو میں مستعمل رہے ہیں۔

(الف) منگنا پنجابی لہجہ میں ہے۔ اُردو میں ہم مانگنا کہتے ہیں۔ دکن میں یہی لہجہ رائج ہے۔ احمد دکنی سے

سرفراز کرے منگیا توں منجے خداوند اس کا جزا دے تجھے

اور محمد امین دکنی سے

زلیخا نے شکر رب کا کیا تب جو میں تجھ کن منگا سو مجھ دیا سب

(ب) بندنا = باندھنا پنجابی لہجہ میں بندنا یا بننا ہے۔ اہل دکن بھی بندنا بولتے تھے۔ مثلاً معراج العاشقین :۔

"کعبہ کو نیت بندنا یو راج"۔

(پ) ہنسنا پنجابی میں تخفیف نون غنہ آتا ہے۔ یعنی ہسنا۔ اہل دکن بھی ہسنا

بولتے تھے۔ محمد امین دکنی سے

سو تب یعقوب کے یوں دل میں آیا　　　یوسف کو نیند بھیتر کن ہسایا
دیگر سے یوسف جاگے تو تب پوچھا پدر نے　　　میں بھیتر ہسایا تجکوں کن نے

(ث) ٹٹنا = ٹوٹنا۔ پہلا پنجابی ہے اور دوسرا اردو۔ اہل دکن نے دونوں طرح سے لکھا ہے۔ احمد دکنی سے

پرت جوڑ دہ دوے دل جو جوڑے　　　نہ ٹوٹے جلا کاس ٹٹکر پڑے

(ٹ) پٹی = پاٹی بمعنی تختی و لوح۔ دکنی پنجابی لہجہ میں پٹی لکھتے ہیں۔ احمد دکنی

پرت حرف میں تن سبہ کر پٹی　　　کہاں گو دیں دھر سکے وہ پٹی

ہتھ۔ ہاتھ اہل دکن پنجابی طرز میں بھی لکھتے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ سے

حضرت نبی کے گیسواں دونوں اماماں کے پگاں
جبریل جھلاوے اپ ہتاں آرات ساری ولے ولے

(ج) بُھکا = بھوکا۔ محمد قلی پنجابی لہجہ میں باندھتا ہے سے

دونو رو یدہ ے بی بی کے آخر دیکھو کیوں دکہ سکے
لہو میں پڑے پیاسے بُھکے دیکھو یہ خواری ولے ولے

(چ) ڈبنا = ڈوبنا۔ دکنی پنجابی لہجہ سے بھی واقف ہیں۔ احمد دکنی سے

جو ڈبتا نکلتا دسے جگ میں سور　　　سو مشرق پھرا ہور ہیں نزدیک دور

(ح) بھین = بہن۔ دکنی بھین ہی لکھتے ہیں۔ محمد امین سے

چلے تب بہن کے گھر کو خوش حالی　　نہیں وو دکھ وو بل اس صاحب نے ٹالی

(خ) حکیم یوسفی دسویں صدی ہجری کے مشہور مصنف ہیں۔ طب ان کا میدان ہے۔ جس میں کئی تصنیفات یادگار چھوڑیں ہ؎

جناب سید مسعود حسن رضوی۔ ایم۔ اے لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی اپنے مضمون اُردو کے منظوم لغت (خیابان لکھنؤ۔ بابتہ جنوری ۱۹۲۶ء) میں حکیم یوسفی کے ایک قصیدہ کا ذکر کرتے ہیں جو "قصیدہ در لغات ہندی" کے نام سے موسوم ہے۔ اس قصیدہ میں کل چوالیس ابیات ہیں۔ جن میں سے چند سید صاحب نے اپنے مضمون میں نقل کئے ہیں۔ وہاں سے میں دو شعر یہاں نقل کرتا ہوں ؎

جیب و کن آمد زبان و گوش داڑی ریش داں　　موچھ را مچھاں بروت و کانہ کورو بہرہ کر

ہست پیشانی متہ سینہ چھتی و دست است ہتھ　　توہ روی و چل رواں شو بیت بنشیں و ک نگر

ان اشعار میں یہ الفاظ پنجابی لہجہ میں ہیں :-

کن۔ متہ۔ چھتی۔ ہتھ۔ موہ۔ دک = کان۔ ماتھا۔ چھاتی۔ منہ۔ دیکھ۔

(د) ہور = اور۔ یہ عاطفہ آج بھی پنجابی میں مستعمل ہے۔ اردو سے خارج ہو گیا ہے۔ لیکن قدمائے اردو کے استعمال میں عام طور پر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کہتا ہے ؎

سمندر ہے یک ہور ندیاں ہیں سو ہزاراں　　باتاں سو کموڑاں ہیں دے ٹیکا بس ہے

(ڈ) ہوک = لوگ۔ پنجابی میں کاف ہے۔ اور مرد میں گاف۔ لیکن اُردوئے قدیم

میں کاف ہی تھا۔ چنانچہ شاہ برہان الدین جانم متوفی ۹۹۰ھ سے

جے ہووے ہیں لوک عوام   بے مرشد بے قیام

احمد دکنی سے

جو بیلی کے لوکاں سُنی یہ خبر   سنواری صدر ترت سنگار گھر

(۵) جوک = جونک۔ اہل دکن پنجابی لہجہ میں لکھتے رہے ہیں۔ محمد امین دکنی

لگے بھوکوں سے مرنے دے سبھی لوگ   مریں یو نکلے کہ جوں بھوکے مریں جوک

(۶) پنجابی اور اُردو میں بعض حروف آپس میں تبدیل ہو جایا کرتے ہیں۔ مثلاً پنجابی کی "واؤ" اُردو میں "بے" سے بدل جاتی ہے:۔

پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو
ویچنا	بیچنا	وچھانا	بچھانا	ویری	بیری
وال	بال	وٹا	بٹہ	ورتا	برتا
ورتاوا	برتاوا	دیاج	بیاج	ویہٹ	بیہٹ
واگاں	باگاں جمع باگ	ویہڑ	بیہڑ	وچارا	بچارہ (بیچارہ)
وچار	بچار	وجلی	بجلی	وگھہ	بیگھہ
وکانا	بکانا	وسنا	بسنا	وین	بین
وگاڑ	بگاڑ	واری	باری	ورف	برف
وار	بار	ور	بر	والا	بالا

پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو
والی	بالی	وچ	بیچ، بچ	وچنا	بیچنا
وکاؤ	بکاؤ	وللا	بلبلا	ویہ	بیس
وساکھ	بیساکھ	وتّرنا	بسرنا	وس	بس (زہر)
وات	بات	وٹّی	بتی		

(ز) پنجابی کی "ہے" اُردو میں "سین" سے بدل جاتی ہے:-

پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو
کیہا	کیسا	جیہا	جیسا	کہیں	کسی
اوہ	اوس	ایہہ	اس	ورہ	برس
ترہیہ	ترس	ورہیا	برسا	ورہدا ہے	برستا ہے
سوہرا	سسرا	پھاہس	پھنسا	تیہ	تئیس
ویہہ	بیس	چالیہ	چالیس	گھاہ	گھاس
سرہوں	سرسوں				

(ڑ) پنجابی کی "ہے" اُردو میں "الف" سے بدل جاتی ہے:-

پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو
ہک	ایک	ہور	اور	ہسوار	اسوار

(ژ) پنجابی کی "دال" اُردو میں "تے" سے بدل جاتی ہے:-

پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو
دہاگو	تاگا	ماردا	مارنا

بعض الفاظ میں حروف مقدم مؤخر ہو جاتے ہیں،۔

پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو
کوڑا	کڑوا	بھڑنا	پڑھنا	چکڑ	کیچڑ
پچھان	پہچان	بھین	بہن	اناچک	اچانک
سہرند	سربند				

قدیم اردو پر پنجاب کا اثر

اردو پر قدیم زمانوں میں پنجابی لہجہ غالب تھا۔ اس کا ثبوت دینا موجودہ حالات میں بہت دشوار ہے۔ اس لئے کہ ان ابتدائی زمانوں کے جبکہ مسلمان لاہور سے ہجرت کر کے دہلی میں آباد ہوئے ہیں۔ نیز اس کے بعد کی تین صدیوں تک کے کوئی کتابی نمونے ہم کو نہیں ملتے۔ نہ ہم کو یہ علم ہے کہ اس عہد کی برج اور پنجابی میں کیا فرق تھا۔ الغرض برج پنجابی اور اردو کے نمونوں کی عدم حاضری سے ہمارا کام بہت مشکل ہو گیا ہے۔ یہ یقینی ہے۔ کہ جب مسلمانوں کا کثیر گروہ قطب الدین ایبک کے ساتھ شمال سے ہجرت کر کے دہلی آیا ہے تو اپنے ساتھ پنجاب سے کوئی نہ کوئی زبان ضرور لے کر گیا ہے آیا یہ زبان موجودہ پنجابی کے مماثل تھی۔ یا اس کی کوئی شاخ تھی۔ جواب معدوم ہے۔ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ بہر حال یہ زبان برج اور اس کی ہمسائگی میں ایک عرصۂ دراز تک رہنے سہنے کے باعث بدلنی شروع ہوئی ہے۔

برج اور موجودہ پنجابی کا اصولی فرق گذشتہ سطور میں دکھا چکا ہوں۔ پنجابی کے اکثر الفاظ میں حرفِ علت کو جب کہ حرف ثانی واقع ہو۔ گرا دیا جاتا ہے۔ اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ جب ہم فارسی کی تصنیفات اور تاریخوں کی ورق گردانی کرتے ہیں جن میں اتفاقیہ ہندی لفظ آجاتے ہیں۔ اور ان الفاظ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ

خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں پنجابی کا دہلی کی زبان پر خاصہ اثر تھا مثلاً پہلا منطقی نقد جس پر ہماری نظر پڑتی ہے "لک" یعنی لاکھ ہے۔ چنانچہ فارسی خوان اب تک لک ہی بولتے ہیں۔ قطب الدین ایبک کو لک داتا کہا جاتا تھا اب لک پنجابی لہجہ میں ہے۔

"اردو میں چارپائی کو ہم کھاٹ کہتے ہیں۔ پنجابی لہجہ میں اگر اس کو لکھا جائے تو کھٹ ہوگا۔ اب مولانا ابراہیم فاروقی صاحب شرفنامہ نویں صدی ہجری کے مصنف جو بنگالہ کے رہنے والے ہیں لکھتے ہیں:۔

"کت۔ بافتح تخت میاں بافتہ اہنہ کھت نامند"

مولانا فخرالدین مبارک قواس غزنوی جو ہندوستان میں فارسی لغات نگاروں کے باوا آدم ہیں۔ اور عہد علاء الدین خلجی کے شاعر ہیں۔ اپنی فرہنگ میں اسی لغت کے لئے کہتے ہیں:۔

"کت۔ تخت ہندواں باشد میاں بافتہ"

تاریخ سیرالاولیا میں جو تغلقوں کے عہد کی تصنیف ہے۔ یہ لفظ بار بار ہمیں ملتا ہے اور ہر بار کھت کی شکل میں ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ایام میں اہل دہلی کھاٹ کو کھٹ کہتے تھے۔ یعنی پنجابی لہجہ میں بولتے تھے"

پاگ بمعنے پگڑی۔ ایک اور بھاشہ کا لفظ ہے۔ اس کی پنجابی شکل "پگ" ہے۔ اب امیر خسرو دہلوی باوجود یکہ دہلی میں پرورش پاتے ہیں۔ اور مسلمانوں کو دہلی میں آباد ہوئے اس وقت تک ایک صدی گذر گئی ہے تاہم پگڑی کو پنجابی شکل میں "پگسا"

لکھتے ہیں۔ چنانچہ ؎

اے دہلی و اے بتان سادہ — پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں صفحہ ۲۴۱ پر ملک فخر الدین کھنڈ اور ملک رکن الدین انبہ کے نام نظر آتے ہیں۔ ان ناموں میں کھنڈ اور انبہ عرفی یا تمیزی نام ہیں۔ اس عہد میں کچھ اسی قسم کے عرف ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک امیر "ہرن مار" کے نام سے منسوب تھا۔ دوسرا امیر "تررا باندہ" کہلاتا تھا۔ اب بھاشا میں کھنڈ کو کھانڈ اور انبہ کو انب یا آم کہتے ہیں۔ لیکن ان امرا کے ناموں کے ساتھ کھنڈ اور انبہ مذکور ہونے سے واضح ہوتا ہے کہ اس عہد کے مسلمان کھانڈ کو کھنڈ اور آم کو انب پنجابی لہجہ میں کہتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ان ایام میں دہلی کے مسلمانوں میں پنجاب کا لہجہ غالب تھا۔ کھنڈ اور قند کا ماخذ ایک ہی معلوم ہوتا ہے:

ہم برج بھاشا کے لہجہ کے مطابق اردو میں نقال کو بھانڈ کہتے ہیں۔ لیکن ہمارے اسلاف پنجاب کے لہجہ میں بھنڈ کہتے تھے۔ اور اس سے 'بھانڈپن' کا مفہوم ادا کرنے کیلئے "بھنڈائی" بنا لیا ہے۔ چنانچہ ضیاء برنی کہتا ہے:۔

"از سخن مسخرگان و بھنڈائی بھنڈاں و بوالعجبی بازیگراں دیے شرمی ماداشتاں کہ از اطراف ممالک بدرگاہ رسیدہ بودند و در اطراف سراچہاے سلطانی بازی میکردند و ہنرہاے خود می نمودند و داد سخن میدادند و نادرشتی و بھنڈائی را بنہایت میرسانیدند" (تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۱۹۳)

یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں۔ کہ ان ایام میں دہلی پنجابی لہجہ غالب تھا :۔

اسی مصنف کے ہاں ایک اور مقام پر یہ عبارت ہے :۔

چندیں مواضع بر ہ چوترہ بندانیدہ بودند و چھپر انداختہ وچاہ ہا کاوانیدہ

ومٹہ ہا و سبلو ہا پر آب و آفتابہ ہائے گلیں مرتب داشتہ و بودہا قراز کردہ "

مٹہ پنجابی میں مات یا گول کو کہتے ہیں :۔

ضیاء برنی کے ہاں یہ فقرہ بھی آتا ہے :۔

" و آخر کار احمد ایاز را لرزہ در اندام افتادہ و دلش در باک شد و زہرہ ترقیدن گرفت

واز شدت خوف و غلبہ ہراس پگ در گردن انداختہ و سر کلونی را برہنہ

کردہ در پیش درگاہ سلطانی آمد " (تاریخ فیروز شاہی صہ ۴۵۴)

ہم دیکھتے ہیں کہ برنی بھی امیر خسرو کی طرح پگڑی کو پگ ہی لکھ رہا ہے، یہ یاد رہے

کہ پگ بھاشہ میں پانو کے معنے میں مستعمل ہے :۔

اسی تاریخ میں ایک اور موقعہ پر یہ فقرہ آتا ہے :۔

" درختان کہرنی و جمون و خرمائے ہندوی و بڑال و سنبل و پیپل و کل نہال

خواہند کرد " (صہ ۵۶۸)

برنی یہاں "جموں" پنجابی طرز میں لکھ رہا ہے، ہم آج کل بھاشہ کی تقلید میں جامن

یا جامون کہتے ہیں :۔

" تاریخ فیروز شاہی میں شمس سراج عفیف فیروز شاہ خلجی کے شکار کے ذکر میں

فقرۂ ذیل لکھا ہے :-

"وہمچنیں اگر درتلے ودہندے ماہی بودے۔ شہنشاہ فرمودے۔ کہ آں ماہہائے گراں کہ بالائے بیں بار کردہ ے بردنداں واہہا درآں تل ودہند اندازند" (صفحہ ۳۲۵)

اس فقرہ میں تل اور دہنا پنجابی ہیں۔ "تل" "تال" یعنے تالاب کی پنجابی شکل ہے۔ خالق باری میں تال ہے :-

رایت در نیزہ بود اسیر است ڈہال لب آب ندی حوض وگرپرداست تال

دھنڈ ملتانی لفظ ہے۔ جو بڑے اور گہرے تالاب یا جھیل کے معنے دیتا ہے۔ اب یہ لفظ ایسا ہے کہ آج پنجاب میں بھی عام طور پر لوگ اس سے واقف نہیں ہیں۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی میں ان ایام میں بولا جارہا تھا۔ تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ پنجاب کا اثر دہلی پر کس قدر زبردست ہو گا۔

ہم آج کل دیوچہ کو جونک یا دون لغنہ بولتے ہیں۔ پنجابی تکلم کے مطابق جیسا کہ اس سے قبل عرض کرچکا ہوں یہ لفظ جوک ہے۔ اہل دکن بھی جوک کہتے تھے۔ دکن کے علاوہ باقی اُردو خوان دنیا بھی جوک ہی کہتی تھی۔ چنانچہ صاحب شرف نامہ ابراہیم فاروقی قرن نہم ہجری کے بنگالی مصنف کہتے ہیں :-

"دیوچہ - ہندش جوک گویند"

آج ہم جونک بولتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے۔ کہ بعد میں ہلاشہ کے اثرات میں ہم نے

یہ لہجہ اختیار کیا ہے ؛

صاحب شرف نامہ کلاوہ کی تشریح میں کہتے ہیں :۔

" کلابہ وکلاوہ" ہند " انی " نامند" ؛

اب انی پنجابی ہے ۔ برج میں اَنٹی ہے ۔ اردو میں غالباً دونوں لہجے رائج ہیں یعنے وہ انّی بھی کہتے ہیں ۔ اور انٹی بھی البتہ برج کے لہجہ میں اتنی اصلاح کردی ہے کہ انٹی کے مد کو ترک کر دیا ہے ؛

گاڑی کو پنجابی گڈی کہتے ہیں ۔ صاحب شرف نامہ کہتے ہیں :۔

" گردوں ، چرخ ۔ ہند گدی خوانند"

یہاں پھر صاحب شرف نامہ پنجابی لہجہ میں لکھ رہے ہیں ، اسی طرح گڑیا کے واسطے مصنف موصوف کہتے ہیں :۔

" لعبت ، لعبت وخترگاں وآں صورت کہ از جامہ سازند ۔ ہند گدی گویند "

گڈی پنجابی میں گڑیا کو کہتے ہیں ۔ اور ظاہر ہے کہ اس عہد میں عام مسلمان اس لفظ کو پنجابی لہجہ میں بول رہے تھے ؛

چقندر کے ذکر میں بھی مصنف فرماتے ہیں :۔

" سبزی ایست مثل ترب کہ آنرا شلغم گویند ۔ ہندش گانگو نامند "

اہل پنجاب آج بھی شلغم کو " گونگلو " کہتے ہیں ۔ یہ یاد رہے کہ صاحب شرف نامہ بنگالہ کے رہنے والے ہیں ۔ اور انہیں پنجاب سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ بنگالہ میں شلغم کو آجکل

شلغم ہی کہتے ہیں۔ جب اس عہد کے مسلمان عام طور پہ گانگلو کہہ رہے ہیں، تو کیا یہ پنجاب کا اثر اور دور ظاہر نہیں کرتا۔ بعد کے اثرات میں ہم نے گونگلو کہنا ترک کر دیا ہے۔ اور شلغم کہنے لگے؛

بنو ماش کے ذکر میں بھی مصنف حوالہ قلم کرتے ہیں :۔

"بنو ماش بالضم "نام غلہ کہ بہندش منگ نامند"؛

دوسرے مقام پہ لکھتے ہیں :۔

"مزور آشامے است کہ مریض را دہند۔ چنانچہ دریں ولایت مثلاً از برنج و منگ آشام سازند و در خراسان از شکر و نار دہند"۔

اس عہد تک گویا مونگ کو پنجابی طرز میں مسلمان منگ کہتے رہے۔ لیکن صاحب مؤید الفضلا جو دسویں صدی ہجری کے مصنف ہیں۔ اس کو صاف مونگ لکھتے ہیں۔ اور جب سے اب تک ہم مونگ ہی بولتے آئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس لفظ کے متعلق دسویں صدی میں مقامی لہجہ اختیار کیا گیا ہے؛

اہل پنجاب سیسہ کو سکا کہتے ہیں۔ چنانچہ نصاب فروری :۔

"از زیر قلعی سرسے سکّا سطبر ٹھلا باریک لکا"

اور آج ہم اردو میں سیسہ بولتے ہیں، چنانچہ اسمائے ذارسی :۔

"انک سرب سیسہ کو جانو رانگے کو ارزیز پہچانو"

لیکن حکیم یوسفی جو دسویں صدی ہجری کے پہلے ربع کے مصنف ہیں۔ اپنی تصنیف

ریاض الادویہ میں آنک کا ہندی مرادف سکہ بتاتے ہیں۔ ان کے کچھ عرصہ بعد صاحب مؤید الفضلا آنک کی تشریح کے وقت دونوں لفظ یعنی سکہ و سیسہ دیتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اہل اردو اہل پنجاب کی طرح ابتدا میں سکہ کہتے رہے۔ بعد میں سیسہ کہنے لگے ور سیسہ ہی آخر کار غالب رہا ؛

اُردو میں برج لہجہ سے پنجابی لہجہ کا سخت مقابلہ رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی وقت میں ایک لفظ دونوں لہجوں میں بولا جا رہا ہے۔ مثلاً بادل اور بدل۔ بازار اور بزار۔ چھاج اور چھج۔ صاحب شرف نامہ ۸۶۷ھ و ۸۷۵ھ آزخ کے بیان میں لکھتے ہیں کہ :۔

"ہند مسا خوانند" ؛

لیکن صاحب مؤید الفضلا ۹۲۵ھ اسی لفظ کے ذکر میں کہتے ہیں کہ "ہند ماسہ گویند" اور ہم آج مساہی بولتے ہیں۔ یہاں گویا پنجابی لہجہ غالب رہا۔ "تاریخ فیروز شاہی" میں جمون بلہجہ پنجابی آیا ہے۔ لیکن صاحب مؤید الفضلا الوسیہ کے بیان میں اس کا ہندی مرادف جامن دیتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی جامن یا جامون بولا جاتا ہے۔ یہاں دیکھا جاتا ہے کہ برج کا لہجہ غالب رہا۔ اسی طرح اشترخار کے ذکر میں صاحب شرف نامہ کہتے ہیں۔ "وہند اوراجوانسہ گویند" لیکن مصنف مؤید الفضلا کا بیان ہے کہ "ہندش جوانسہ گویند"۔ ہم آج جوانسہ یا جواسہ کہتے ہیں اور یہ پنجابی لہجہ کے مقلد ہیں ؛

لفظ درائے کے متعلق صاحب ادات الفضلا ۸۲۲ھ کا بیان ہے۔ کہ

"... اہل ہند آنرا گھنٹی گویند" لیکن صاحب شرفنامہ ۸۶۲ھ و ۸۷۹ھ کا قول ہے کہ "ورائے جرس ہندش گھانٹی خوانند" ہم آج گھنٹی کہتے ہیں۔ صاحب شرف نامہ کے ہاں اور ایسے الفاظ ملتے ہیں۔ جو برج لہجہ میں ہیں۔ مثلاً تسمہ کے بیان میں "باؤ" شخار کے ذکر میں سہاجی۔ شخک کی تشریح میں "پچکلی" اور تشی کے بیان میں "ساہی" علی ہذا "پچاباتی"۔ آج ہم ان الفاظ کا تلفظ پنجابی لہجہ کے موافق۔ پٹی۔ سجی۔ پچکی۔ سہی۔ اور پچباتی کرتے ہیں؛

حکیم یوسفی نے ریاض الادویہ میں منجملہ اور ہندی الفاظ کے جو ہندی اور پنجابی میں مشترک مانے جا سکتے ہیں۔ یہ الفاظ بھی دئے ہیں؛

"لائی۔ انب۔ تماں۔ کریج۔ انڈہ۔ آملی۔ آرنڈ۔ ماکھی۔ کانجلی۔ بلاٹی۔ ہاڈ۔

سہاجی"۔

ان میں پہلے چار تو خالص پنجابی ہیں۔ باقی تمام برج کے لہجہ میں ہیں۔ جن کو آج ہم انڈا۔ املی۔ ارنڈ۔ مکھی۔ کینچلی۔ بلی۔ ہڈی۔ سجی۔ بلہجہ پنجاب ادا کرتے ہیں؛

میں خالق باری سے اور مثالیں دیتا ہوں۔ مثلاً:-

"ماٹی۔ پاتھر۔ چالنی۔ چاکی۔ کال۔ تاتا۔ ڈھاکنی۔ چاکھ۔ ماکھی۔ مانچھر۔ کانکر۔ ہانسلی۔ پوتھی۔ پانسلی؛

جنہیں آج ہم پنجابی لہجہ میں مٹی۔ پتھر۔ چھلنی۔ کل۔ تتا۔ ڈھکنی۔ چکھ۔ مکھی۔ مچھر۔ کنکر۔ ہنسی۔ پتلی۔ پسلی کہتے ہیں؛

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بالکل ممکن ہے۔ کہ پرانی برج میں اور پنجابی میں کوئی فرق نہ ہو۔ اور برج میں حروفِ علت کا اظہار بعد کی نشو و نما ہو۔ اس کے متعلق ہم اتنا جانتے ہیں۔ کہ پنجابی میں یہ قاعدہ یعنی حروفِ علت کی تخفیف تقریباً مسلمانوں کی ہند میں آمد کے وقت بھی موجود تھا۔ عرب سیاحوں نے بعض ہندی الفاظ کا ذکر کیا ہے جن میں انبہ اور زط بھی شامل ہیں۔ پنجاب میں انبہ آج بھی بولا جاتا ہے۔ باقی رہا زط یہ پنجابی لفظ جٹ کی معرب شکل ہے۔ اُردو میں برج کی تقلید میں جاٹ بولتے ہیں۔ یہ ایک جنگ جو قوم کا نام ہے۔ جو ان ایام میں سندھ و پنجاب میں کثرت سے آباد تھی۔ ایرانی بتقلید پنجاب جٹ کہتے ہیں۔ چنانچہ ابوالفرج رونی:-

کرد افغان جت برغبت شرص   بترہ رومو کہ موار ملک

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ قدیم زمانوں میں پنجاب کا اثر اُردو پر بہت نمایاں تھا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ یہ اثر رفتہ رفتہ زائل ہوتا گیا ؛

سطور آئندہ میں برج بھاشہ کی بعض خصوصیات درج کی جاتی ہیں تاکہ قارئین کرام اُردو پنجابی اور برج زبانوں کے فرق کو معلوم کر سکیں۔ اور یہ رائے قائم کر سکیں کہ آیا اُردو زبان پنجابی کے قریب ہے یا برج کے ؛

برج بھاشا

دراصل ضلع متھرا کی زبان ہے جہاں سے نکل کر اس نے بہت وسعت اختیار کر لی ہے۔ یعنی جنوب میں تمام ضلع آگرہ۔ اکثر علاقۂ ریاست بھرتپور۔ دھول پور اور قرولی۔ مغربی علاقۂ ریاست گوالیار اور مشرقی علاقۂ ریاست جے پور میں پھیلی ہوئی ہے شمالاً گڑگانوہ کے مشرقی حصہ میں۔ شمال مشرق میں دوآبہ۔ بلند شہر۔ علی گڈھ۔ ایٹہ۔ مین پوری ایٹہ اور گنگا پار۔ بدایوں۔ بریلی اور ترائی پرگنہ نینی تال میں بولی جاتی ہے۔ اور مختلف مقامات پر مختلف نام رکھ دئے گئے ہیں۔ مثلاً مشرقی علاقہ میں جہاں قنوجی زبان سے اس کا اتصال ہوتا ہے۔ انتر بیدی کہا جاتا ہے۔ گوالیار کے شمال مشرقی گوشہ میں جو دہر پور کے متوازی ہے۔ اور جہاں سیکروار راجپوت آباد ہیں سیکرواڑی، قرولی کے میدانی علاقہ اور بعض علاقہ گوالیار میں جمبل پار جادو بانی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اس علاقہ میں اس نام کی راجپوت قوم آباد ہے۔ بھرتپور کے جنوبی علاقۂ قرولی خاص اور مشرقی علاقہ جے پور میں جو ڈانگ کے نام سے موسوم ہے۔ ڈانگی کہتے ہیں۔ اور پھر اس کی مقامی تین تقسیمیں ہیں یعنی ڈانگ، ڈانگ کال مال۔ بور قسمت مانگ علاقہ نینی تال میں اس کا نام بھکسا ہے۔ قدیم زمانہ سے برج بھاشہ نے شاعری کی گود میں پرورش پائی ہے۔ اور ہندوستان کے بعض مشہور شاعر اسی زبان میں لکھنے

رہے ہیں۔ دِیْنا ناتھ، سور داس، نابھ داس، دیودت اور بہاری لال بے حد مشہور ہیں۔ (گریرسن)

اہلِ مغرب نے اس زبان کی یہ حد بندی شاید درست کی ہو۔ لیکن مسلمانوں نے اس کو بہت وسعت دے دی تھی۔ وہ اس کو بھاکھا یا بھاشہ کے نام سے یاد کرتے رہے اور بھاکھا کی ذیل میں انھوں نے قنوجی۔ اودھی اور بندیلی کو بھی داخل کر لیا تھا۔ بلکہ اس کا میدان اس سے بھی وسیع تر تھا۔ یعنی مشرقی اور مغربی ہندی ایک دامن میں آجاتی تھی۔ مسلمانوں کا یہ نقطۂ نظر عجیب رہا ہے۔ وہ ہندوستان کی ہر زبان کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عام اس سے کہ پنجابی ہو یا برج ہو یا پوربی۔ اُردو ہو یا مارواڑی اور بنگالی۔ آج ہندوؤں نے بھی ہندی کے ذیل میں برج۔ قنوجی اودھی۔ بندیلی۔ مارواڑی وغیرہ زبانوں کو شامل کر لیا ہے۔ بھاشہ شاعری کی زبان تھی۔ اور اس میں ہر ہندی شاعر عام اس سے کہ وہ اودھی ہو یا گجراتی۔ مالوی یا بہاری شعر لکھتا تھا۔ اگرچہ اس کے اشعار میں اس کی وطنی زبان کی خصوصیات زیادہ غالب ہوتی تھیں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمانوں کے لیے جہاں فارسی شاعری اور ادب کی زبان تھی۔ اسی طرح بھاشہ موسیقی اور شعر کی زبان تھی۔ اہلِ اسلام کی شعر دوستی نے بھاکا کی شاعری کو بہت کچھ تقویت دی ہے۔ انھی کے زمانہ سے اس زبان میں شعر و ادب پیدا ہوتے ہیں۔ گویا اہلِ اسلام کے پاس تین زبانیں تھیں۔ اوّل فارسی جس میں وہ شعر و ادب تاریخ و انشا لکھتے رہے

دوسری اُردو جس کو اپنے ساتھ پنجاب سے لے گئے۔ تیسری بھاکا یا بھاشہ جس میں موسیقی اور شعر لکھتے رہے۔ خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں فارسی پر زوال آنے لگا۔ آئندہ قرون میں عام توجہ بھاشہ کی طرف منعطف ہو گئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں عام ہندی گو شعرا پیدا ہو گئے۔ بھاشہ میں کثرت سے شعرا ہوئے ہیں۔ جن میں صوفی و غیر صوفی شامل ہیں۔ لیکن موجودہ نسلوں کی عدم اعتنا سے اُنکے کلام کا اکثر حصہ ضایع ہو گیا۔ اور جو کچھ باقی ہے۔ وہ بھی عنقریب معدوم ہو جائیگا برج بھاشہ کوئی قدیم نام نہیں ہے۔ قدما اس کو گوالیاری کے نام سے یاد کرتے تھے۔

برج کی بعض خصوصیات

برج میں مصدر "یو" یا "وو" یا "نو" آخر میں لگنے سے بنتا ہے۔ مثلاً ہونیو ہونا۔ پوچھیو = پوچھنا۔ چلنو = چلنا۔ اسماء افعال۔ اور اسمائے صفات کے آخر میں ایک واو مجہول اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جس موقعہ پر اردو اور پنجابی میں الف ملتا ہے مثلاً اپنو = اپنا۔ تھاریو = تمہارا۔ چلیو = چلا۔ یا واو معروف بڑھا دیا جاتا ہے۔ جیسے بستسے بستو۔ غلام سے غلامو۔ شیطان سے شیطانو۔ مستقبل کے اردو اور پنجابی لاحقہ "گا" کے بجائے "گو" آتا ہے۔ مثلاً مارونگو = مارونگا۔ لیکن زیادہ رائج شکل "ماریوں" یا "مارے ہوں" = ماروں گا "مارے ہیں" = (ہم)

مارینگے" " مار ہے" یا مارے ہیے۔ (تو یا وہ) ماریگا" مار ہو" یا مار ہو۔ (تم) مارو گے "مار ہیں" یا "مارے ہیں" = (وہ) مارینگے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح مصدر کی علامت "نو" اسی طرح مستقبل کی علامت "گو" اردو سے لی گئی ہے۔ ہے کی گردان اردو برج اور پنجابی میں یکساں ہے۔ صرف یہ فرق ہے کہ واحد متکلم میں برج میں ہُوں باواو مجہول اردو میں باواو معروف ہُوں۔ اور پنجابی میں واو الف سے بدل کر ہاں بن گیا۔ اور جمع واحد میں "ہن" بن گیا۔

تھا کی تصریف میں پنجابی اور اردو کسی قدر اختلاف کے ساتھ متفق ہیں۔ لیکن برج میں مختلف ہے۔ یعنی واحد مذکر "ہو" ۔ واحد مؤنث "ہی" ۔ جمع مذکر "ہے" اور جمع مؤنث "ہیں" ۔

ماضی تام میں "ہو" بجائے "تھا" لاتے ہیں۔ مثلاً میں مارتا تھا کے بجائے ہیں مارے ہو وغیرہ کہتے ہیں۔ حال و مستقبل میں بہت کم فرق ہے۔ ہوں ٹر رہا ہوں = میں مارتا ہوں۔ وغیرہ یا ہوں مارت ہوں وغیرہ لاتے ہیں۔ جمع کے لیے بالعموم اسم کے آخر میں ایک نون اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً موتی۔ اور دن گھاٹ۔ کان۔ بات۔ چور۔ گوال اور گائے کی جمع موتن۔ اورن۔ دنن۔ گھاٹن۔ کانن۔ باتن۔ چورن۔ گوالن اور گاین ہے۔ مصرع۔ کانن میں موتن کو جو کنڈ گل پھولن کا ہار ظرف کے لئے ایک "یا" اسم کے آخر میں لاتے ہیں۔ جیسے گھر سے گھرے یعنی گھر میں "میں" = "نی" اور "نون" بغرض جارہ آخر میں لگا دیتے ہیں۔ مثلاً بھوکن۔ بھوکی اور

بھوکنیں یعنی بھوک ہے۔ علامات جارہ میں کا اور کے کی جگہ "کو" آتا ہے۔ مثلاً گل پھولن کو ہار یعنی گلے میں پھولوں کے ہار۔ گھوڑن کو یعنی گھوڑوں کا۔ مجہول کا کم رواج ہے لاحقہ نے اکثر اوقات افعال لازمی کے ساتھ بر خلاف اردو اور پنجابی کے مستعمل ہوتا ہے۔ مثلاً ڈھوڑے نے بلبانے چلیو۔ یعنی چھوڑا بلبا چلانے کے استعمال میں پنجابی سے ظاہر ہے کہ وہ اردو اثرات میں برج میں پہنچا ہے۔ واو اکثر اوقات میم سے بدل جاتی ہے۔ جیسے مہماں = وہاں = چرائیو۔ چراونا یعنی چرانا۔ آمنیو = آونا یعنی آنا۔ منامن = مناون یعنی منانا۔ جامیں = جاویں۔ رومتی = روونی یعنی رونی۔ بامن = باون۔ مالدہ = والدہ۔ اردو کے اثرات میں اسما کی تصریف کا استعمال برج میں ہونے لگا ہے۔ لیکن بے قاعدہ اور غلط۔ مثلاً اردو میں جہاں چھوٹے لڑکے کا کہیں گے، اہل برج اس کی جگہ "لوہڑے چھورا کو" کہیں گے۔ اس میں بے قاعدگی یہ ہے کہ اہل اردو اسم کی تصریف کی خاطر اس کے اسمائے صفات و دیگر متعلقات کو پنجابی کی طرح منصرف کرتے ہیں۔ یہاں برج میں اسم "چھورا" کو منصرف نہیں کیا، اور اسم صفات لوہڑا کو منصرف کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اہل اردو اسی جملے کو لوہڑے چھورے کا کہیں گے اس سے ہمیں قیاس لگا لینا چاہیے کہ تصریف کا قاعدہ اردو سے گیا ہے۔ یہی حالت گھوڑان میں سیل اور کالے گھوڑا کو زین کی ہے۔ اردو میں جمع الف اور نون کے اضافے سے بنتی ہے۔ برج نے بھی اس قاعدہ کو اردو سے لیا ہے لیکن اس کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔ افعال کا پیچیدہ طریقہ جو اردو اور پنجابی میں افعال مرکبہ بالفاظ الحاقہ کے الحاق سے ہوتا ہے، برج اس سے بڑی حد تک آزاد ہے۔

اردو کی "لام" برج میں "رے" سے بدل جاتی ہے۔ مثلاً جلنا۔ جرنا۔ یہ بھی یاد رہے کہ "ڑے" اردو میں کثرت سے آتی ہے۔ اس کے برخلاف برج میں بہت کم مستعمل ہے۔ اردو کی "ڑے" یا تو "رائے" مہملہ سے بدل جاتی ہے۔ مثلاً لکڑی۔ لری لڑائی۔ لرائی۔ جوڑی۔ جوری۔ پھاڑنا۔ پھارنا۔ یا "دال" سے بدلتی ہے۔ جیسے بڑا۔ بدا۔ گاڑی۔ گادی۔ گوڑ۔ گود۔ گاڑنا۔ گادنا۔

شہر دہلی میں گرچہ اردو بولی جاتی ہے لیکن اس پاس کے دیہات میں ہریانی زبان موجود ہے۔ جو درحقیقت اردوئے قدیم کی ایک شکل ہے۔ یہ نظریہ کہ اردو برج سے نکلی ہے اس عقیدہ پر مبنی ہے۔ کہ قدیم زمانوں میں دہلی میں برج زبان بولی جاتی تھی۔ حالانکہ آج دہلی برج کے علاقہ سے فاصلہ پر واقع ہے۔ مسلمانی عہد سے پیشتر ممکن ہے کہ دہلی میں برج کا رواج ہو۔ لیکن اردو پر برج کے اثرات کی توجیہ اور طرح سے کی جا سکتی ہے۔ سکندر لودھی کے عہد سے شاہجہان کے زمانہ تک آگرہ لودھیوں، سوروں اور مغلوں کا پایۂ تخت تھا۔ جو عین برج کے علاقہ میں واقع ہے۔

مسلمان اور ہندی زبانیں

امیر خسرو اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کی مفصلہ ذیل زبانوں کا شمار کرتے ہیں ؛-

(۱) سندھی (۲) لاہوری (۳) کشمیری (۴) ڈوگری (۵) دھور سمندری (۶) تلنگی -

(۷) گجراتی (۸) معبری (۹) گوڑی منسوب بہ گوڑ - قدما گوڑ کو لکھنوتی کہتے تھے -

پٹھان گوڑہ - مغلوں نے جنت آباد نام دیا (۱۰) بنگالی (۱۱) اودھی (۱۲) دہلوی

(۱۳) سنسکرت - جو عربی کے سوا تمام زبانوں سے افضل ہے ؛

کسی قدر ترمیم کے ساتھ یہ تقسیم آج بھی صحیح مانی جاسکتی ہے - ان زبانوں کو ہندوستان کی قدیم پراکرتوں کی یادگار مانا جاتا ہے - لیکن ان میں ادب و شعر مفقود تھے - البتہ گیت اور سرود کا رواج تھا - جو عوام کی زبان زد تھے - اور یہ مسلمان ہیں جنہوں نے سب سے پیشتر ان زبانوں کی طرف توجہ دی ہے - اور شاعری کا ان میں رواج دیا ؛

مسلمانوں کی آمد سے پیشتر سنسکرت زبان ہندوؤں کی مذہبی، علمی، درباری اور ادبی زبان تھی - برہمن راجاؤں کے درباروں میں حاوی تھے - اور مذہب و علوم انہی کی حفاظت میں تھے - درباروں میں سنسکرت اور سنسکرت بولنے والوں کا گذر تھا - عوام الناس میں تعلیم عام نہیں تھی - اور نہ اس دیوبانی زبان کی تحصیل کی انکو اجازت تھی - وہ صرف برہمنوں کی میراث تھی - رعایا میں تجارت پیشہ لوگ اپنے لئے

اسی قدر تعلیم ضروری سمجھتے تھے۔ کہ بہی کھاتہ اور حساب جان سکیں۔ ورنہ باقی رعایا جاہل مطلق تھی۔ دیسی زبانیں جن کے بولنے والوں کی تعداد کروڑوں تھی۔ عام کس مپرسی کی حالت میں تھیں۔ نہ ان میں ادب تھا نہ شعر۔ برہمن جو ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ تھا سنسکرت کے ہوتے ہوئے عام پراکرتوں کی طرف کیوں توجہ کرتا۔ ان زبانوں کی ترقی یا انہیں علوم و فنون کا رواج اس فرقہ کے مقاصد کے عین مخالف تھا۔ راجا اور پرجا پر اس کا اقتدار اس قدر عظیم تھا کہ دنیا کا کوئی مذہب اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ برہمن کے بغیر دین و دنیا کا ہر کام بند تھا۔ اس کی صدارت کے بغیر عبادت اور پرستش دشوار تھی۔ موت زیست۔ شادی غمی میں اس کی شرکت لازمی تھی۔ ان کا معالج وہ تھا۔ نجومی وہ تھا۔ وزیر وہ تھا۔ مشیر وہ تھا۔ مدبر وہ تھا۔ اور مقنن وہ تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ کونین میں نجات انسانی کا مختار کار وہی تھا۔ ادھر راجا قبضہ میں تھے۔ اور ادھر دیوتاؤں پر تصرف تھا۔ برہمنوں نے نہ صرف جماعتی آزادی کو معطل کر دیا تھا۔ نہ صرف عوام الناس پر تعلیم کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ بلکہ ضمیر انسانی کی حریت کو بھی اپنے طاقتور قوانین سے ہمیشہ کے لیے مفلوج کر دیا تھا۔ صدیاں اس ابدی سکوت اور سکون میں گزر گئیں۔ آخر بودھ جی مہاراج آئے اور انہوں نے اپنے مت کی تلقین عوام الناس کی زبان میں شروع کی۔ اس طرح پالی زبان نے کچھ ہی عرصہ میں بے حد ترقی کر لی۔ اور بدھ مت والوں کی مذہبی زبان بن گئی۔ کئی صدی بعد برہمنوں نے اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کر لیا۔ اور بدھ مت کا ہندوستان سے اخراج کر دیا۔ اور ایک مرتبہ اور ہندوستان میں برہمنوں کا دور

دورہ ہو گیا:

سنسکرت اور برہمنوں کے اقتدار کے زمانہ میں ظاہر ہے کہ کوئی دیسی زبان ترقی نہیں کر سکتی تھی۔ اور نہ اس کے لئے کوئی ایسا موقع تھا۔ لیکن مسلمانوں کی آمد عظیم الشان تغیرات کا پیش خیمہ ہے۔ جس کے دنبال میں اقتصادی، معاشی، تمدنی اور لسانی انقلاب رونما ہوئے۔ مسلمان فاتحانہ حیثیت سے آئے۔ اور بہت جلد اس سرزمین کو اپنا وطن تصور کرنے لگے۔ انہوں نے ممالک خارجہ کی تجارت کا دروازہ اس ملک پر کھول دیا بیسیوں نئی صنعتیں مثلاً کاغذ سازی، پشمینہ سازی، زین سازی، نعلبندی، باغبانی فن حلوائی، قالین سازی، پارچہ بافی، طب یونانی، فن تعمیر، کاشی کاری، آئینہ سازی، بیطاری، دارو سازی، کشتی گیری، شال بافی وغیرہ وغیرہ کی ترویج دی۔ زندگی کے ہر شعبہ اور فن کو نمایاں ترقی دی۔ فنون لطیفہ کی سرپرستی کی۔ مختلف کھانوں اور اچاروں کا رواج دیا۔ قسم قسم کے عطریات کی ایجاد کی۔ شعر دوستی اور ادب پرستی مسلمانوں کی قومی خصوصیت ہے۔ چنانچہ جب وہ ہندوستان میں آباد ہو گئے۔ اور ملکی زبان سمجھنے اور بولنے لگے۔ ان کی یہ قومی خصوصیت بروئے کار آئی۔ اور وہ اس ملک کی زبانوں میں دلچسپی لینے لگے۔ ہندوستان کے شمال و مغرب کی زبانیں جن میں پشتو، کشمیری، سندھی اور پنجابی شامل ہیں۔ اکثر مسلمان شعرا کی مرہون منت ہیں۔ برج اودھی، گجراتی اور بنگالی زبانوں میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے بھی ایک معقول حصہ لیا ہے۔

میرا یہ بیان کہ ہندی زبانوں کے ادبیات مسلمانوں کے ہندوستان میں قیام کا نتیجہ ہیں۔ ایسے حلقوں میں جہاں برج کی شاعری اور پرتھی راج راسا کی قدامت میں یقین کیا جاتا ہے۔ ناقابل قبول ہوگا۔ کیونکہ ایک عرصہ سے برج اور راسا کا نام ہماری روایات میں گونج رہا ہے۔ لیکن اگر واقعات کو اچھی طرح پرتالا جائے۔ اور اس امر کو بھی مدنظر رکھا جائے۔ کہ ہندو قوم تاریخ میں ہمیشہ کمزور رہی ہے۔ اور آج بھی اسکی تحقیقات قدیم ادبیات ہندی کے متعلق الجھی اور پریشان ہونے کے علاوہ زیادہ تر ظنی واقعات پر مبنی ہے۔ تو میرے مطالب کا سمجھنا آسان ہو جائیگا۔

یہاں میں اپنے دعوے کی تائید میں جناب دنیش چندر سین۔ بی۔ اے کی تاریخ ادبیات بنگال سے ایک اقتباس جو زیادہ تر خلاصہ کی شکل میں ہے۔ ناظرین کو پیش کرتا ہوں۔

"بنگالی زبان کے ادبی پایہ تک ارتقا حاصل کرنے کے متعدد اسباب ہیں۔ ان میں سب سے پیش پیش بلاشائبہ اشتباہ مسلمانوں کی فتح بنگال ہے۔ اگر ہندو راجہ بدستور سابق مختار اور حکمران رہتے۔ تو بنگالی زبان کے لئے دربار تک رسائی حاصل کرنا ایک دشوار امر تھا۔ ان پٹھانوں نے تیرھویں صدی میں بنگال کو تسخیر کر لیا۔ اُن کے سلاطین نے بنگالی زبان سیکھی اور اپنی کثیر التعداد ہندو رعایا کے ساتھ جن پر حکمرانی کرنے کے لئے وہ آئے تھے۔ قریبی تعلقات قائم کر لئے۔ جب ان سلاطین نے سنسکرت کے مشہور

رزمیوں راماین لعدہ مہابھارت کا ذکر سنا ۔ جو ہندوؤں کی مذہبی اور منزلی زندگی
کی تشکیل میں عجیب و غریب اثر رکھتے تھے ۔ تو قدرتاً اُن کو شوق ہوا کہ ان نظموں کے
موضوع سے آگاہی حاصل کریں ۔ انہوں نے چند عالموں کو بنگالی زبان میں
اُن کے ترجمہ کرنے کا حکم دیا ۔ جس زبان کو وہ اب بولتے اور جانتے تھے ۔
مہابھارت کا بنگالی ترجمہ ناصر شاہ والی گوڑ کے حکم سے ہوا ۔ جس نے ۱۳۲۵ء
تک پورے چالیس سال سلطنت کی تھی " (ص۱۱۵)

جب بنگالی زبان کے ادبیات کا سنگِ بنیاد مسلمانوں کے ہاتھ سے رکھا جاتا
ہے جس کا ہم کو اب تک کوئی علم نہیں تھا ۔ تو یقین کر لینا چاہئیے ۔ کہ دوسرے علاقوں
میں جو اہلِ اسلام کے زیرِ نگیں تھے ۔ انہوں نے دیسی زبانوں کی ترویج میں ضرور حصہ
لیا ہے ۔ اس کا ثبوت پیش کرنا کوئی دشوار نہیں ہے ۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ بھاشہ
کے میدان میں مسلمانوں کے نام ہندو شعرا سے اقدم ہیں ۔ ہندی کا پہلا بڑا شاعر کبیر ہے
جو نویں صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے ۔ ہندو شعرا زیادہ تر دسویں صدی ہجری
میں پیدا ہوتے ہیں ۔ جیسے تلسی داس اور سور داس ۔ کبیر سے پیشتر بھی مسلمان شعرا
موجود تھے ۔

مسلمانوں میں ہندی شعرا کے سرتاج خواجہ مسعود سعد سلمان المتوفی ۵۱۵ھ ہیں
ان کا ہندی کلام اگرچہ دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہیں رہا ۔ لیکن بارہ ماسہ سب سے پیشتر
انہی نے لکھا ہے ۔ چنانچہ فارسی میں ان کا مشہور یہ یا دوازدہ ماہہ اب تک محفوظ ہے ۔

چونکہ پنجاب سے مسلمانوں کے تعلقات دہلی کے مقابلہ میں زیادہ قدیم ہیں۔ اس لیے مسلمانوں نے اسی ملک کی زبان میں سب سے پہلے شعر گوئی کی بنا رکھی۔ مشائخ وصوفیہ نے سب سے پیشتر دہلی و پنجاب میں ہندی کی سرپرستی کی ہے۔ ان کا تعلق عوام الناس سے براہ راست تھا۔ اس لئے دیسی زبانوں کی تربیت انہی سے شروع ہوتی ہے۔ ان اہل اللہ میں ہم بعض مشہور بزرگوں کے نام دیکھتے ہیں۔ مثلاً شیخ فرید الدین مسعود متوفی ۶۶۴ھ۔ شیخ نظام الدین اولیا متوفی ۷۲۵ھ۔ امیر خسرو متوفی ۷۲۵ھ۔ شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی متوفی ۷۲۴ھ انہوں نے شیخ نظام الدین اولیا سے ہندی دوہروں میں مشاعرات کئے ہیں۔ اور مبارز خاں کے ارادہ سفر کے وقت ذیل کا ہندی دوہا مع اس کے ترجمہ فارسی کے خان کے پاس بھیجا تھا:

سجن سکارے جائینگے اور نین مرینگے روے   بدہنا ایسی رین کر بھور کدہی نا ہوے

شعر فارسی:-

من شنیدم یار من فردا رود وقت شتاب   یا الٰہی تا قیامت برنیاید آفتاب

اسی جماعت نے ہندی موسیقی کی تہذیب و ترقی میں بھی بڑا حصہ لیا ہے۔ جہاں فارسی موسیقی قول و ترانہ وغیرہ کے وہ دلدادہ تھے۔ ہندی موسیقی سے بھی ان کی خانقاہیں خالی نہیں تھیں۔ وہ سنسکرت تک کے نغمات سننے کے عادی تھے۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی متوفی ۶۶۶ھ اس فن میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ ملتانی دہناسری انہی کی ایجاد ہے۔ امیر خسرو نے فارسی اور ہندی موسیقی کو پیوند دیا۔ سلطان حسین شاہ

جونپوری ۹۰۵ھ نے سترہ راگ ایجاد کیے۔ نایک بخشو نے بہادری راگ۔ نایکی کلیان اور نایکی کانھڑا وضع کیے۔ درباری کانھڑا میاں تانسین کی یادگار ہے۔ شیخ عطاء اللہ الملقب بہ شیخ رتن فن موسیقی میں ممتاز پایہ رکھتے تھے۔ شیخ بہاء الدین برناوی متوفی ۱۰۳۸ھ اس فن میں کامل و اکمل تھے۔ ساز خیال اور ساز کھڑس کے موجد ہیں ابراہیم عادل شاہ متوفی ۱۰۳۵ھ فن موسیقی میں نایکی کا درجہ رکھتا تھا۔ باز بہادر والی مالوہ اس فن میں بے نظیر مانا گیا تھا۔ موسیقی میں مسلمانوں نے اس قدر ترقی کی تھی کہ اس فن پر جس قدر نفیس کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اکثر مسلمان مصنفین نے لکھی ہیں۔ بنگالی میں اس فن کی تمام تر تصنیفات مسلمان دماغوں کا نتیجہ ہیں؛

سلاطین و امراء و عمال نے ہندی کی سرپرستی میں کچھ کم حصہ نہیں لیا ہے۔ ناصر الدین والی لکھنوتی متوفی ۷۲۶ھ بنگالی میں مہابھارت کا ترجمہ کراتا ہے۔ اسی صدی میں فیروز شاہ خلجی ۶۹۵ھ سنسکرت سے بعض کتابیں ترجمہ کرواتا ہے۔ سلطان زین العابدین والی کشمیر متوفی ۸۷۷ھ کئی زبانوں میں ماہر تھا۔ تبتی زبان بھی بے تکلف بولتا تھا۔ ایک طرف جہاں اس نے مہابھارت اور راج ترنگنی کا ترجمہ کرایا۔ دوسری طرف فارسی اور عربی کتابوں کا بھی کشمیری زبان میں ترجمہ کرا دیا۔ ودیاپتی شاعر غیاث الدین والی بنگالی کا مداح ہے۔ ہندی زبانوں کی سرپرستی میں علاء الدین حسین شاہ والی بنگال متوفی ۹۲۵ھ کا نام آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس کا دربار ہندی اور بنگالی شعرا سے آباد تھا۔ قطبن نے اپنی

تصنیف مرگاوتی جس کا ذکر آئندہ آئیگا ۹۰۹ھ میں اسی بادشاہ کے نام پر معنون
کی ہے۔ اور علاوہ ہرداسو ساکن کلنگرام اسی بادشاہ کے حکم سے بھاگوت کا بنگالی
زبان میں ترجمہ کرتا ہے۔ ابھی اس کے دو باب ہی ترجمہ کئے تھے۔ کہ بادشاہ نے شاعر
کو ۱۵۱۸ء میں گنراج خاں کا خطاب دے دیا۔ اسی حسین شاہ کے سپہ سالار پراگل
خاں کے حکم سے جو ناظم چٹاگانگ بھی تھا۔ کویندر پرمیسور نے مہابھارت کا دوسرا
ترجمہ بنگالی زبان میں شروع کیا۔ ترجمہ ختم ہونے نہیں پایا تھا۔ کہ اسکا انتقال ہوگیا۔ اسکے
فرزند چھوٹے خاں نے جو باپ کا قائم مقام ہوتا ہے۔ سری کرناتندی کو اسی کام
پر مقرر کیا۔ اور ترجمہ ختم ہوگیا؛

قاضی محمود گجراتی متوفی ۹۴۱ھ ہندی کے زبردست شاعر تھے۔ اُن کے
اشعار مجالس حال وقال کو ایک عرصہ دراز تک گرماتے رہے۔ ملک محمد جایسی نے
شیر شاہ سور کے نام پر پدماوت لکھی۔ اور دوسری متعدد تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں
شیخ دانیال چشتی آٹھویں صدی ہجری میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور ایک سو گیارہ سال عمر پا کر
۹۹۲ھ میں رحلت کرتے ہیں۔ ہندی کے اعلیٰ شاعر تھے۔ شیخ عثمان غازی پوری
نے چتراولی کا عشقیہ فسانہ لکھا۔ قطبن۔ ملک محمد جایسی اور شیخ عثمان غازی پوری
نے عام مذاق کی تصنیفیں لکھ کر ہندی شاعروں کو عالمگیر مقبولیت کی شاہراہ پر گامزن کر
دیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ بعد کے آنے والے ہندو شعرا نے اس کو مذہبی رنگ
میں رنگ دیا۔ تلسی داس اور سورداس نے زبان کو مذہبی تنگنا میں محصور کر کے مناسب

سری رام چندر د سری کرشن کے لئے وقف کر دیا پچھلے شاعر جو آئے اور جن میں اکثر ہندو تھے۔ تلسی داس اور سور داس ہی کے نقش قدم پر جادہ پیما ہوئے۔ اور نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ہندی شاعری مذہب کی جکڑ بندیوں سے کبھی آزاد نہ ہو سکی اور سرگزشت کرشن و رامچندر کے بیان پر اس کی تمام جد و جہد ختم ہو گئی۔

اکبر کے دربار میں متعدد ہندو شاعر موجود تھے جن کی تنخواہیں اور جاگیریں بھی تھیں۔ اسکا فرزند شہزادہ دہنیال ہندی کا قابل شاعر تھا۔ عبدالرحیم خاں خانخاناں فن شعر میں بلند پایہ رکھتا تھا۔ اسکا دربار فارسی اور ہندی شعرا کا مرجع تھا۔ نرہری اور باناکوی اکبر کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ باناکوی کو جس کا نام مشہور پہاٹک تھا۔ بادشاہ نے راؤ کا خطاب اور جاگیر عطا کی تھی "کلی چرتر" اس نے عبدالرحیم خاں خانخاناں کے اشارہ سے لکھی تھی۔ تان سین نے اپنی کتاب سنگیت سار اسی عہد میں تالیف کی۔

کیشو مسر اور پوکھر دونوں جہانگیر کے دربار کے شعرا کے زمرہ میں داخل تھے۔ اسی عہد میں طاہر نے کتاب کوک سار ۱۶۲۱ء میں تصنیف کی۔ سندر داس گوالیاری اور سر دمنی شاہجہان کے عہد کے شعرا ہیں۔ سر دمنی نے شاہجہان کے ارشاد سے "ارنشی" نام کی منظوم لغت طیار کی۔ سندر داس کو شاہجہان نے "مہاکوی راجہ" کا خطاب دیا تھا۔ ویدک میں ایک کتاب "پران سکھ" نامی ۱۶۲۴ء میں وجود میں آئی۔ جگناتھ کلاونت کو شاہجہان نے خطاب "کبرائے" عنایت کیا۔ بادشاہ کے نام پر بارہ دھرپد اس نے مختلف نغموں میں تیار کئے جو بادشاہ کو بہت پسند آئے۔ شاہی حکم سے وہ

روپیوں میں تولا گیا - اس کا وزن چار ہزار پانچسو روپیہ ہوا اور یہی روپیہ اس کو انعام
میں مل گیا؛

شیخ پیر محمد سلون متوفی ۱۰۴۳ھ ہندی و فارسی میں عمدہ اشعار لکھتے تھے - یہ شیخ جنید
موہانی چشتی متوفی ۱۰۴۸ھ عربی فارسی و ہندی کے اعلیٰ شاعر تھے - دارا شکوہ کے ہاں
متعدد ہندی خواں ملازم تھے - جن کا کام ہندی زبان میں ترجمے کرنا تھا "سار سنگرہ"
جو دوہوں کی بیاض ہے - اسی کے حکم سے مدون ہوئی -

سترھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں دولت قاضی نے "لور چندرانی" بنگالی نظم لکھنی
شروع کی - قاضی کی بے وقت وفات کی وجہ سے یہ نظم ختم نہ ہو سکی - علاول ایک اور
مسلمان شاعر نے ۱۶۵۹ء میں اس کی تکمیل کی - عبدالحکیم نے قصہ یوسف زلیخا کو اسی زبان
میں نظم کیا - دولت وزیر بہرام نے لیلیٰ مجنوں کی مثنوی لکھی محمد اکبر نے "یمین جلال"
ایک عشقیہ افسانہ پر قلم اٹھایا - کبیر محمد نے "رنگ مالا" شمشیر علی نے "ریجوان ساہا"
(رضوان شاہ) اور شمس الدین صدیق نے "بھاو لابھ" تصنیف کیں - بنگالی زبان میں بیشمار
مصنفین گزرے ہیں جنھوں نے مسلمانی بنگالی نیز ہندو بنگالی میں پہلی یادگار چھوڑی ہیں؛

عالمگیر کا دربار اگرچہ شاعروں سے خالی نظر آتا ہے - لیکن اس کا لاڈلا فرزند محمد
اعظم شاہ ہندی زبان سے بے حد الفت رکھتا تھا - نواز ایک مسلمان شاعر نے اعظم
شاہ کی خواہش سے ۱۶۸۰ء میں شکنتلا ناٹک لکھی - اسی شہزادہ کے فرمان سے مختلف
کویوں نے مل کر بہاری شاعر مشہور کی "ست سئی" کی تدوین کی یہ نسخہ اشاعت اعظم شاہ"

کے نام سے مشہور ہے۔

دیوانِ شاہ عالم اوّل ۱۱۲۴ھ کے دربار سے متعلق تھا ایک اور شاعر عالم نامی اس بادشاہ کا ملازم خاص تھا۔ ہندوؤں کی روایت ہے کہ عالم دراصل برہمن تھا کسی مسلمان عورت کے عشق میں مبتلا ہو کر مسلمان ہو گیا۔ عالم نے ایک تصنیف عالم کیلی جس میں رادھا اور کرشنا کے واقعات درج ہیں۔ اپنی یادگار چھوڑی۔ قاسم پسر واجد نے کیشوداس کی "رسک پریا" پر ایک نفیس شرح لکھی:

سری پت بھٹ ایک گجراتی اودھیا برہمن تھا۔ اس نے سید ہمت خان نواب الٰہ آباد کے نام پر "ہمت پرکاش" ہندی ویدک میں بعہد عالمگیر ۱۶۷۶ء میں نظم کی ایک اور شاعر بلبیرا نے ہمت خاں مذکور کی فرمائش پر فن عروض میں کتاب "پنگل من ہرن" سمت ۱۷۴۲ بکرمی میں تصنیف کی۔ سید محمد سعید المخاطب بہ سید میراں بھیک چشتی صابری عہد عالمگیر کے بزرگ ہیں۔ ان کا انتقال ۱۱۳۱ھ میں ہوتا ہے۔ ہندی زبان کے قابل شاعر تھے۔ قوال اُن کے اشعار ابھی تک گاتے ہیں۔ انہی کے مرید محبوب عالم عرف شیخ جیون ہیں۔ برباہ کی زبان میں ان کی تصنیف دردنامۂ محمد ہے۔ محشر نامہ بھی انہی کی یادگار ہے:

یعقوب خان نے بندیلی زبان میں کتاب "رس بھوشن" لکھی۔ "متھ سکھ" میرزا عبدالرحمٰن نے عہد فرخ سیر میں تالیف کی۔ سید پہار خلف سید حمزہ "رس رتناگار" ایک طبی تالیف کے مصنف ہیں۔ شیخ سلیمان ایک معراج نامہ موسوم بہ حقائق نامہ کے ناظم ہیں۔ شیخ خوش محمد قادری نوشاہی متوفی ۱۱۲۶ھ فارسی و ہندی کے مقبول شاعر تھے:

خود محمد شاہ بادشاہ دہلی متوفی ۱۱۶۱ھ ہندی زبان کا شاعر تھا۔ اس کی تصنیفات سے ایک بارہ ماسہ اب تک موجود ہے۔ اعظم خان نے اس کے حکم سے "سنگار درپن" سمت ۱۷۸۶ بکرمی میں تالیف کی۔ آنند گھن شاعر مشہور محمد شاہ کا ملازم تھا۔ امیر خاں محمد شاہی دیوی کوی کا مربی تھا۔ صورت مشر اسی عہد میں نصر اللہ خان محمد شاہی کا ملازم تھا عالم۔ فیض اور اکرم۔ غلام نبی اور نور خاں بھی ہندی شعرا کے زمرہ میں منسلک ہیں لیکن ہم اُن کے زمانوں سے ناواقف ہیں۔ فیض غالباً محمد معظم فیض ہیں۔ جو فارسی و ہندی کے زبردست شاعر تھے۔ اور سنسکرت کے فاضل۔ انھوں نے لیلاوتی کا سنسکرت سے دوبارہ ترجمہ کیا ہے۔ ڈیڈوانہ کے رہنے والے ہیں۔ اور قاضیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا زمانہ عہد محمد شاہی ہے۔ ان کا فارسی دیوان اور کچھ مثنویاں طبع ہو چکی ہیں۔

آخر میں "رس خان" کا نام بھی داخل کیا جاتا ہے۔ جس کو ہنود مذہباً ہندو بیان کرتے ہیں۔ کبھی اس کو ایک ساہوکار بچہ کا عاشق کہتے ہیں کبھی کسی ہندو عورت کا شیدا بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض اس کو سید کہتے ہیں۔ اور بعض پٹھان۔ شاہی خاندان کا اس کو ممبر بتایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ رس خاں ایک روز بھاگوت پڑھ رہا تھا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ جس شخص پر ہزاروں گوپیاں عاشق تھیں۔ اُس سے عشق کرنا چاہئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس کی معشوقہ نے طعنہ دیا۔ کہ جیسا تم مجھے چاہتے ہو اگر اس کو چاہتے جس کی ہزاروں گوپیاں عاشق تھیں۔

تو تم کتنے پاگل ہو جاتے۔" قصہ مختصر رس خاں نے پربھو کا مقام دریافت کیا۔ اس سے کہا گیا کہ وہ برج میں رہتا ہے۔ اس پر وہ برج چلا گیا۔ وہاں کرشن نے اپنے دیدار اسے دیئے۔ اس طرح رس خاں کرشن کا نام لیوا ہو گیا۔ اس کا زمانۂ حیات اس کی نظم پریم باٹکا سے معلوم ہوتا ہے کہ سمت ۱۶۷۱ بکرمی تھا۔ رس خاں کے زمرہ میں علی خاں۔ شیخ نبی۔ میر احمد۔ تاج خاں اور پیرزادی بی بی کے نام بھی شامل کئے جا سکتے ہیں۔ ان کے واقعات حیات ہندی بھگت مالاؤں میں مل سکتے ہیں۔ ہندوؤں نے ان کو اپنی جماعت میں تسلیم کر لیا ہے۔

پرتھی راج راسا

"سبھا چندرکا" میں ہندی شعرا کے ذکر میں لکھا ہے :-

"کہا جاتا ہے کہ گیارھویں شتک کے انت تک اپبھرنش کا پرچار تھا۔ اُس کے اوپرانت وہ ہندی کے رنگ میں ڈھلنے لگی۔ کوی چند ہندی بھاکا کے آدکوی ہیں۔ اُن کے پہلے بھی کچھ کوی ہو گئے ہیں جن میں کھومان۔ قطب علی۔ سائیں دان چارن۔ فیض۔ اکرم کوی کا نام وشیش الیکھیو گیہ ہے۔ پرنتو ہندی بھاکا کے آدیم پرشو کوی چند بردائی ہیں۔ ان کے پہلے کے کویوں کے نہ تو کوئی کاوی کہلانے یوگے اُتم گرنتھ ملتے ہیں۔ اور نہ اُن کی بھاکا ہی ٹکسالی اتھوا استوک ہندی کہی جاسکتی ہے۔"

اس بیان کی رُو سے چند بردائی کو ہندی کا سب سے پہلا شاعر مانا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ چند پرتھی راج کا وزیر اور شاعر تھا۔ اور پرتھی راج راسا اسی طرف منسوب ہے۔ ۵۸۸ھ میں پرتھی راج ترائن کے میدان میں سلطان معزالدین محمد بن سام سے شکست کھا کر مارا جاتا ہے اور مسلمانوں کا قبضہ اجمیر و دہلی پر ہو جاتا ہے۔ راسا اس عہد کی تصنیف بتائی جاتی ہے۔ لیکن راسا ایک مشتبہ تصنیف ہے۔ اس کے متعلق بہت کچھ اختلاف آرا ہے۔ بعض اس کو چند کی اصلی

تصنیف مانتے ہیں۔ اور بعض ایک مجہول تالیف خیال کرتے ہیں۔ باخبر اصحاب کی یہ رائے ہے کہ راسا سولھویں یا سترھویں صدی میں کسی نے چند کے نام پر تصنیف کر دی ہے۔ چنانچہ مہامہو پادھیا کبیراج شیامل داس جی کی یہی رائے ہے (ہندی نورتن صفحہ ۵۲) برخلاف اس کے مصنفین ہندی نورتن اس کی اصلیت کے حق میں ہیں۔

راسا سے واقف کاروں کی یہ رائے ہے کہ اس میں دس فی صدی فارسی اور عربی الفاظ موجود ہیں۔ جو بجائے خود بدگمانی کے لئے ایک زبردست دلیل ہے کیونکہ اجنبی زبانوں کے الفاظ کی اس کثرت کے ساتھ دہلی یا اجمیر کی زبان میں آمیزش ایسے ابتدائی زمانہ میں قریب قریب ناممکن ہے۔ اس کے بیانات بھی اس قدر لغویت سے لبریز ہیں۔ کہ یہ کتاب بحیثیت کتاب تاریخ ہمارے احترام کی مستحق نہیں۔ مثلاً یہ بیان کہ شہاب الدین کا بھائی حسین نامی تھا۔ شہاب الدین کی بیوی سے ناجائز تعلقات رکھتا تھا۔ جب شہاب الدین کو ان تعلقات کی خبر ہوئی تو حسین اپنی پیاری جان لے کر پرتھی راج کے پاس بھاگ آیا۔ یا یہ کہ پرتھی راج نے شہاب الدین کو مختلف موقعوں پر سات مرتبہ شکستیں دیں۔ گرفتار کیا۔ اور روپیہ لے کر چھوڑ دیا۔ نیز یہ کہ شہاب الدین پرتھی راج کا مطیع و محکوم تھا۔ یہ بیانات اس قدر لغو ہیں۔ کہ ہمیں ان کی تردید میں کوئی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ صرف اس قدر جاننا کافی ہے کہ حسین نام کا کوئی شخص

معزالدین محمد بن سام کا بھائی نہیں تھا۔ اس کا صرف ایک بھائی تھا۔ جو غیاث الدین محمد بن سام کے نام سے غور کا بادشاہ تھا۔ اور معزالدین محمد بن سام اس کے نائب اور سپہ سالار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی طرح یہ خیال کہ پرتھی راج نے سلطان موصوف کو سات مرتبہ شکستیں دیں۔ اگرچہ ابوالفضل نے ہندو بیانات کی تقلید میں لکھ دیا ہے۔ قرین عقل و قیاس نہیں۔ کیونکہ جب ہم شہاب الدین کے کارناموں کو سال وار دیکھتے ہیں۔ تو ان فرضی شکستوں کے لئے اس کی سوانح حیات میں کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اس لئے یہ بیان بھی صداقت سے معرا ہے۔

راسا میں آتشیں اسلحوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ جو راسا کے مفروضہ زمانہ سے کئی صدی بعد ہندوستان میں رائج ہوئے ہیں۔ ڈوسن صاحب کہتے ہیں کہ۔

> راسا کے ۵۰۱ ویں چھند میں تاتار خان شہاب الدین کو مسلح ہوتے اور آتشیں اسلحہ کی تیاری کے لئے کہتا ہے۔ ۲۷۵ ویں چھند میں توپوں اور ان کی آوازوں کا ذکر آتا ہے۔ ۲۱۶ ویں چھند میں رائے گوند کا قتل زنبورک کے ذریعہ جو شترنال کا دوسرا نام ہے۔ بیان کیا جاتا ہے۔

ہمیں ان بیانات کی اتنی ہی وقعت کرنی چاہیئے۔ جتنی بی جمیعہ کے امیر خسرو کو حقہ پلانے کے قصہ کی۔ نہ سلطان معزالدین کے عہد میں توپیں تھیں اور نہ زنبورک نہ اس کے عہد میں تاتار خاں کے نام یا خطاب کا کوئی شخص تھا۔ تاریخ ہند میں

سب سے قدیم شخص جو اس خطاب کا مالک ہے۔ محمد ارسلان تاتار خان ہے۔ جو غیاث الدین بلبن متوفی ۶۸۶ھ کے عہد کا امیر ہے ؞

یہاں ایک اور امر قابل غور ہے کہ شہاب الدین سلطان محمد بن سام کے بھتیجے کا نام ہے۔ جو اس کے غزنین کا بادشاہ بنائے جانے پر ترک کر دیا گیا۔ اور معز الدین محمد بن سام اختیار کر لیا گیا۔ اب اس نام سے وہ اپنی مدت سلطنت میں مشہور رہا ہے۔ اس کے سکوں پر بھی یہی نام ہے۔ اس کے عہد کے مؤرخین مثلاً صاحب تاج المآثر و طبقات ناصری اسی نام سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ بعد کی تاریخیں مثلاً تاریخ فیروز شاہی میں بھی معز الدین کے نام سے مشہور رہے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے۔ کہ راسا میں بار بار اس کو شہاب الدین غوری کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس پہیلی کا حل یہی ہے۔ کہ اکبری عہد کے مسلمان مؤرخین زیادہ تر اس کو شہاب الدین کے نام سے پکارتے آتے ہیں۔ چنانچہ بعد کے مورخین نے یہی نام اختیار کر لیا۔ اس لئے اگر راسا کا مصنف سلطان معز الدین کا درحقیقت معاصر ہوتا۔ تو وہ قطعاً شہاب الدین نہ لکھتا بلکہ معز الدین۔

راسا میں توپ و بندوق کا ذکر۔ دس فیصدی غیر ہندی الفاظ کی اس میں آمیزش اور دیگر بیانات کی لغویت وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ کتاب ایسے زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ جب کہ توپ و بندوق ہندوستان میں عام طور پر استعمال ہونے لگی ہیں۔ اور فارسی و عربی الفاظ ہندی زبان میں شامل ہو چکے ہیں ؞

امیر خسرو

وفات ۷۲۵ھ

ادبی دنیا کے آفتاب عالمتاب ہیں۔ اور خاک ہند اب تک اُن کے اوصاف وکمالات کا انسان پیدا نہیں کر سکی ہے۔ وہ ایک طرف فارسی کے زبردست ناظم و ناثر ہیں۔ دوسری طرف عربی و سنسکرت میں دستگاہِ کامل رکھتے ہیں۔ متعدد امور کی ایجاد انہی کی طرف منسوب ہے۔ ہندی اور ایرانی موسیقی کی تدوین کر کے اپنی ایجادوں سے اس کو مالامال کر دیتے ہیں۔ جہاں فارسی پر ان کے احسان ہیں۔ وہاں ہندی بھی اُن کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئی ہے۔ ان کی تصنیفات نظم و نثر کی تعداد ننانوے بتائی گئی ہے۔ اشعار کی تعداد چار اور پانچ لاکھ کے درمیان کہتے ہیں۔ جس قدر فارسی میں ان کا کلام ہے اس سے کہیں زیادہ ہندی میں بتایا جاتا ہے۔ لیکن امیر نے دیباچہ غرۃ الکمال میں اپنی ہندی نظموں کا ذکر بدیں الفاظ کیا ہے:۔

"جزوے چند نظم ہندوی نیز نذر دوستاں کردہ شدہ است۔ ایں جا ہم بہ دیگرے بس کردم و نظر بر نداشت۔ کہ لفظ ہندوی در پارسی لطیف آوردن

چنداں لطفے ندارد مگر بضرورت آں جا ضرورت بودہ است آوردہ شد"۔

آخری فقرہ میں اشارہ ہے۔ اِن الفاظ و فقرات ہندی کی طرف جو امیر گاہ گاہ اپنے اشعار میں لکھ گئے ہیں۔ لیکن امیر کے ہندی کلام کا اب تک پتا نہ چل سکا گزشتہ صدی کے تذکرہ نگاروں نے جو نمونہ کلام دیا ہے۔ میں یہاں نقل کئے دیتا ہوں۔ از قسم شہر آشوب سے

تیلی پسرے کہ میفروشد تیلے ۔۔۔ از دست و زباں چرب او داوہلے

خالے بلبش دیدم و گفتم کہ تل است ۔۔۔ گفتا کہ برو نیست دریں تل تیلے

یہ عین ترجمہ ہے "ان تلوں میں تیل نہیں"۔ کا ہندوستان کا قاعدہ ہے کہ گوجریاں دودھ وہی وغیرہ لے کر گلی گلی آواز دیتی پھرتی ہیں۔ "لیو وہی لیو وہی" امیر کے عہد میں بھی یہی دستور تھا۔ فرماتے ہیں ؎

گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی ۔۔۔ آں دیگ وہی بر سر تو چیز شہی ؎

از ہر دو لبت قند و شکر میریزد ۔۔۔ ہر گاہ بگوئی کہ "وہی لیہو وہی"

و دیگر ؎ زرگر پسرے چو ماہ پارا ؎ ۔۔۔ کچھ گھڑیے سنولیے پکارا

نقد دل من گرفت و بشکست ۔۔۔ پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

اشعار ذیل بھی صنف شہر آشوب سے تعلق رکھتے ہیں سے

رفتم بہ تماشا بکنار جوئے ؎ ۔۔۔ دیدم بلب آب زن ہندوئے

گفتم صنما چیست بہائے موئے ۔۔۔ فریاد بر آورد کہ "در در موئے"

"دوردور ہوئے" فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں پڑھا جاتا ہے۔ فارسی میں یہ معنی ہیں کہ ایک ایک موتی کا ایک ایک بال ہے۔ ہندی میں یہ مطلب ہے۔ کہ مردار دور رہو۔ فرہنگ آصفیہ میں ذیل کا قطعہ شہر آشوب امیر کے نام پر دیا ہے:۔

ہندو بچۂ ہیں کہ عجب حسن دھرے چھے   بر وقت سخن گفتن لکھ پھول جھڑت چھے

گفتم زلب لعل تو یک بوسہ بگیرم   گفتار کارے رام تنک کا ہیں کرے چھے

اس قسم کی نظمیں جن میں پیشہ وروں کا قطعات کی شکل میں ذکر ہو شہر آشوب کہلاتی ہیں۔ مولانا محمد امین چڑیا کوٹی جنھوں نے جواہر خسروی میں امیر کا شہر آشوب مرتب کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"سنسکرت اور ہندی بھاشا میں اس قسم کی نظمیں میری نظر سے گذری ہیں۔ دیتی داکیرو لاس گوپال کوی نے اسی طرز پر نظم کیا ہے۔ جس میں تمام پیشہ وروں کے نام اور اُن کے کام نظم میں بیان کئے ہیں۔ غالباً اسی طرز کو حضرت امیر خسرو نے فارسی زبان میں لاکر ایک جدت اور فارسی لٹریچر میں نیا اضافہ کیا ہے۔"

مَیں یہاں اس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ اس معاملہ خاص میں، امیر خسرو سنسکرت و بھاشا کے مرہون منت معلوم نہیں ہوتے۔ کیونکہ خواجہ مسعود سعد سلمان سب سے پیشتر فارسی میں ان نظموں کا رواج دیتے ہیں۔ اور "مقطعات شہر آشوب" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ تمثیلاً خواجہ کے شہر آشوب سے یہاں ایک آدھ نمونہ حوالۂ قلم کر دیا جاتا ہے:۔

در حق دلبر خبّاز بگفت

آنکه او بردکاں ز بس خوبی   همچو خورشید بر سپہر آمد
شد فراز تنور چوں دل من   باد و مہ رفت و بادہ مہر آمد

صفت یار بربطی گفتہ

بتا زہرۂ آسمان جمالی   چو زہرہ بمن بر تو فرخندہ فالی
کنار تو خالی نباشد ز بربط   ز بربط نباشد ولے زہرہ خالی

ذیل کی نظم بھی امیر کی طرف منسوب ہے : ؎

ز حال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم ای جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت منکے ورائے لاکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

وہ گئے بالم وہ گئے ندیو کنار ٹو   آپے پار اتر گئے ہم تو رہے اروار

بھائی رے ملاح ہم کوں پار اتار   ہاتھ کا دیو ونگی مندرا گل کا دیوں ہار

دیکھ میں اپنے حال کوں روؤں زار و زار   پی کن وتا بہت ہیں ہم ہیں او گنہار

بل بھجی میں دیج کوں تاند کو بھول   ہو چھا دیجہ دہا جیا نالا ہا مول ٹو

چکوا چکوی دو جنے انکوں مارو نہ کو   اوہ مارے کرتار کے رین بچھوڑی ہو

سیج وجھتی دیکھ کے روؤں دن رین   پیا کرتی ہیں پہروں پل بھر سکھ نہ چین

سب نارین سو سکھ سیویں کنتاں کوں گل لار   ہیں دو دکھیاری جنم کی دو کھی گئی بہار

تانی چھوٹا دیس میں قصے پڑی پکار   دروانے دیتے رہ گئے نکس گئے اسوار

گوری سوئے پلنگ پر مکھ پر ڈارے کیس   چل خسرو گھر آپنے سانجھ پڑی چو دیس

(از بیاض مملوکۂ پروفیسر سراج الدین آذر ایم۔اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور)

ذیل کی غزل ایسی بیاض سے نقل کی جاتی ہے۔ جو تیرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں لکھی گئی ہے:۔

جب یار دیکھا نین بھر دل کی گئی چنتا اتر   ایسا نہیں کوئی عجب راکھے اسے سمجھائے کر

جب انکھ سے اوجھل بھیا تڑپن لگا میرا جیا   حقا الہی کیا کیا آنسو چلے بھر لائے کر

توں تو ہمارا یار ہے تجھ پہ ہمارا پیار ہے   تجھ دوستی بسیار ہے یک شب ملو تم آئے کر

جاناں طلب تیری کروں دیگر طلب کس کی کروں   تیری جو چنتا دل دھروں اک دن ملو تم آئے کر

میرا جو من تم نے لیا تم نے اٹھا غم کوں دیا   تم نے مجھے ایسا کیا جیسا پتنگا آگ پر

خسرو کہے باتاں غضب دل میں نہ لاوے کچھ عجب   قدرت خدا کی ہے عجب جب جیو دیا گل لائے کر

(از بیاض پروفیسر سراج الدین آذر - ایم - اے)

میں نے اس غزل کو یہاں لکھ تو دیا ہے۔ لیکن یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ امیر خسرو اس کے مالک ہیں۔

خالق باری

یہ وہ خوش قسمت کتاب ہے۔ جو بالاتفاق حضرت امیر خسرو دہلوی کی طرف منسوب ہے تذکرہ نگاروں نے اس کے متعلق حسب معمول مبالغہ سے کام لیا ہے۔ مولوی محمد امین صاحب چڑیا کوٹی فرماتے ہیں۔ کہ "اس میں کئی ہزار اشعار تھے" مولانا محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ "کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی"۔ اور اپنے تخیل کی رنگینی سے کام لے کر یہ فقرہ بھی اضافہ کر دیا ہے کہ "وہ ایک بھٹیاری کے لڑکے کے لئے لکھی گئی تھی"۔ لیکن اگر تحقیق سے کام لیا جائے تو یقین ہے کہ یہ بیانات بے اصل ثابت ہوں۔ یہ بات تو عقل میں آتی ہے کہ بچوں اور مبتدیوں کے لئے جو کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ بالعموم مختصر اور رسالہ کی شکل میں ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً حامد باری۔ رازق باری۔ واحد باری۔ اللہ باری۔ ایزد باری۔ صمد باری اور قادر نامہ وغیرہ جو سب کی سب

اسی خالق باری کی طرز میں ہیں۔ یہ رسالے اکثر اوقات بچوں کو حفظ کرائے جاتے تھے اس لیے ضروری تھا۔ کہ مختصر ہوں۔

یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ خالق باری کے امیر کی طرف منسوب کرنے کے لیے ہمارے پاس کیا وجوہ ہیں۔ کلیاتِ خسرو کے سلسلہ میں ایک جلد موسوم بجواہر خسروی بھی علیگڑھ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں امیر کے متفرق کلام کے علاوہ مولوی محمد امین صاحب چریاکوٹی نے خالق باری کو نہایت محنت اور تحقیق کے ساتھ مرتب کر کے شامل کر دیا ہے۔ اس کے دیباچہ میں مولانائے ممدوح ذیل کے بعض وجوہ کی بنا پر خالق باری کو امیر کی تسلیم کرتے ہیں۔

"...جتیل کا لفظ اس کتاب میں ملتا ہے۔ جو حضرت امیر کے زمانہ تک ایک ہندی سکہ تھا۔ اور آپ کے قریب عہد میں متروک ہو چلا تھا۔ یہاں تک کہ تاریخ میں اس عہد کے بعد اس کا نام بھی نہیں ہوتا ہے۔"

میں اس کے متعلق اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ لفظ جیتل ہر زمانہ میں ملتا ہے مثلاً آئینِ اکبری میں جہاں اکبری عہد کے سکوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ابوالفضل جیتل کو ایک فرضی سکہ اور دام کا پچیسواں حصہ مانتا ہے۔

مہابت خاں عہدِ عالمگیر کا ایک امیر ہے۔ وہ ایک عرضداشت میں جو سرتاپا شکایت سے مملو ہے لکھتا ہے :۔

مدار کار بر تقاضی و تقاضی بر ثبوت راضی۔ ورغزنی و قندھار اشتہار یافتہ

کہ مطربان باستقبال فرمان می شتابند نرخ حسب الحکم موقوف بر دو جتیل افتادہ و
اسد خان کہ ہنوز بعتہ شیر از دہانش نرفتہ وزیر اعظم و دستور معظم فرمودند۔''

آنند بن ہیمراج گوا ہیری نے فن سیاق میں ایک رسالہ موسوم بخلاصة السیاق ۱۱۱۱ھ
مطابق ۴۳ سنہ جلوس عالمگیری میں تصنیف کیا ہے۔ اس میں جتیل کا لفظ عام طور پر ملتا ہے
چونکہ یہ رسالہ چھپا نہیں۔ اس لئے یہاں ایک دو فقرے نقل کر دئے جاتے ہیں۔

''دستور معلوم کردن دامہا بہ حساب فی من دو باید کہ مبلغ نرخ من را با دامہا ضرب
نماید و حاصل ضرب را جتیل دانستہ۔ پنجاہ جتیل یک تنگہ بگیرد۔ مثلاً فی من بیست تنگہ
قیمت پنج دام می باید۔ پس بیست را با پنج ضرب دادیم۔ حاصل ضرب یک صد
جتیل بیاید و از ین دو تنگہ گرفتیم قیمت پنج دام معلوم شد۔''

''اگر کسی پرسد فی من دہ تنگہ است دو آثار را چہ باید داد۔ باید کہ آثارہ را با تنگہائے
نرخ من ضرب دہد و حاصل ضرب را جتیل دانستہ بر چہل جتیل مقرر نماید پس
یک بہلولی قیمت دو آثار معلوم شد۔''

شیخ جنید کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

چو دزد و اندر کیس باشد کرے جو نیند نجا را
نباشد سود یک جتیل گو لوٹے مول ہی سارا

جس زمانہ میں جتیل کا سب سے زیادہ چرچا رہا ہے وہ امیر خسرو کے عین بعد ہے۔
سلطان فیروز شاہ تغلق ۷۵۲ھ و ۷۹۰ھ نے اپنے عہد میں جتیل ایک تنگہ کا بیجا سوال

حصہ کی تقسیم جس میں نیم جتیل اور دانگ جتیل شامل ہے کر دی تھی۔ چنانچہ مولانا شمس سراج اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:۔

"سلطان فیروز شاہ فرمان فرمود کہ مہر نیم جتیل کہ آنرا گوبندہ مہر دانگ جتیل کہ آنرا بنگ گویند وضع کنند تا غرض فقراو مساکین حاصل شود"۔

جتیل کے لئے ہر عہد کی مثالیں بہم پہنچائی جا سکتی ہیں۔ لیکن میں بخوف طوالت انہی امثال پر قناعت کر کے مولوی صاحب کے دوسرے استدلال کو بیان کرتا ہوں:

(۲) محاورات قدیم مثلاً "میں تجھ کہیا" "توکت رہیا" "باد او ڑانی (ہو چلی)" "آکھنا (دیکھنا)" "چاو (شوق)" وغیرہ الفاظ کی گواہی سے خالق باری کا زمانہ تصنیف عہد خسروی میں قطعی طور پر تقدیر اور متعین ہو سکتا ہے۔

یہ دلیل بھی مضبوط معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ میں تجھ کہیا۔ توکت رہیا آج بھی ہندوستان کے دیہات میں بولے جاتے ہیں۔ آکھنا پنجابی زبان میں کہنے اور دریافت کرنے کے معنی میں آج بھی آتا ہے۔ باد اڑانی کے معنی خدا جانے مولانا نے ہو چلی کیسے لکھ دیئے۔ کیونکہ مصرع خاک دھول جو باد او ڑانی ہیں باد اوڑانی کا تعلق دھول کے ساتھ ہے یعنی ایسے دھول جسے خاک اڑ سکے۔ بہرحال ان میں کوئی بھی ایسا محاورہ نہیں جو محاورات قدیمہ کی فہرست میں شامل کیا جا سکے۔ تیسری وجہ مولانا نے مفصلہ ذیل دی ہے:۔

(۳) اس میں شک کرنے کے بہت کم وجوہ ہیں کہ خالق باری حضرت امیر خسرو کی تصنیف ہے۔ اور یہ شائبہ شک بھی خود خالق باری کے مقطع یعنی آخری شعر کو

دیکھ کر بالکل رفع ہو جاتا ہے جس میں لفظ خسرو موجود ہے ۔ اور جس شاعرانہ شوخی و فصاحت کے ساتھ یہ لفظ مقطع میں واقع ہوا ہے ۔ اور اس پر درویشانہ انکسار کا طرّہ دیکھ کر ناممکن ہے کہ کوئی صحیح المذاق شخص اس کو تخلص نہ سمجھے اور صرف یک لفظ بامعنی مثل دیگر الفاظ بامعانی کے جن سے خالق باری بھری ہوئی ہے قرار دے ۔ وہ شعر یہ ہے :-

مولوی صاحب بسران بنا ؔ گدا بھکاری خسرو شاہ

اس کی ترکیب بالکل وہی ہے ۔ جیسے آج کوئی خسرو نام کا شخص اپنے تئیں کسی تحریر میں خاکسار خسرو لکھ کر ختم کلام کر دے ؏

مولانا کا یہ استدلال زیادہ تر شاعرانہ رنگ میں ہے ۔ اہل اللہ میں سادات نے اپنے نام سے پہلے یا بعد میں شاہ کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ مثلاً شاہ نعمت اللہ ۸۳۲ھ شاہ میاں جی ۸۹۸ھ اور سید راجی حامد شاہ ۹۰۱ھ وغیرہ لیکن امیر خسرو کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ شاہ کا لفظ اپنے تخلص کے آخر میں لا کر سادات کے نام کے ساتھ خواہ مخواہ التباس پیدا کر دیتے ۔ اور نہ امیر کے زمانہ میں فقرا کے نام کے ساتھ اس لفظ کا رواج تھا ۔ لیکن اس شعر میں سب سے زیادہ توجہ طلب مصرع اوّل ہے ۔ جس میں مولوی صاحب کی ترکیب موجود ہے ۔ ظاہر ہے کہ مولوی صاحب ، منشی صاحب ، پنڈت صاحب کی سی ترکیبیں امیر خسرو کے عہد میں رائج نہیں تھیں ۔ مولوی صاحب در کنار تنہا مولوی کا لفظ بھی امیر کے عہد میں علما کے نام کے ساتھ نہیں ملتا ۔ ایسے مرکب محض گزشتہ

صدی کی مصنفات سے ہیں۔ اس لئے ہمیں اس شعر کو جدید اضافہ ماننا پڑے گا۔
اور بات بھی یہی ہے کیونکہ اگرچہ یہ شعر مطبوعہ نسخوں میں اسی طرح ملتا ہے۔ مگر قلمی نسخوں
میں اس کی شکل بالکل مختلف ہے۔ جو حسب ذیل ہے :۔

دو جگ رہا خسرو کا نام　　خالق باری ہوئی تمام

ایک اور نسخہ میں یوں ہے ؎

دو جگ میچ رہیا خسرو نام　　خالق باری ہوئی تمام

ان شعروں میں اگرچہ خسرو کا تخلص موجود ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ
خسرو وہی مشہور امیر خسرو ہیں۔ خسرو اور لوگوں کا بھی تخلص ہو سکتا ہے۔ اور میرا خیال ہے
کہ ہم نے خالق باری کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔ تاریخ و ادب میں
اس کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ نہ امیر خسرو کی تصنیفات کے ساتھ اس کا شمار ہوتا اور نہ
کوئی اسے جانتا ہے۔ اور نہ اس کے قدیم نسخے دستیاب ہوتے ہیں۔ جس قدر نسخے
ملتے ہیں۔ بارھویں اور تیرھویں قرن ہجری کے نوشتہ ہیں۔ صرف ایک نسخہ ایسا ہے۔ جو
گیارھویں صدی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ نسخہ برٹش میوزیم کی فہرست کتب فارسیہ
میں "ردیل ۱۲ ب ۲" ہے۔ جو طامس ہائڈ متوفی ۱۷۰۳ء مطابق ۱۱۱۴ھ کی
ملک تھا۔ فہرست نگار کا بیان ہے کہ کسی فرنگی نے سترھویں صدی عیسوی میں نقل
کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس نسخہ میں مصنف کا نام مذکور نہیں ہے۔ انڈیا آفس
میں ایک نسخہ ۲۴۷۸ء، ۱۱ سنہ جلوس محمد شاہی مطابق ۲۸ ربیع الثانی ۱۱۴۲ھ

کا کتابت شدہ ہے۔ لیکن اسی کتب خانہ میں ایک اور نسخہ ۲۶۴۷ ہماری دلچسپی کے کچھ سامان رکھتا ہے۔ اس کی تاریخ کتابت معلوم نہیں لیکن اسکا نام "مطبوع الصبیان" دیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق باری کا اصلی نام مطبوع الصبیان ہے اس نسخہ کے ساتھ نثر کا ایک دیباچہ بھی ہے۔ فہرست نگار نے اس کا ایک پارہ نقل کر دیا ہے وہو ہذا:۔

"الحمد للہ .... (بداں) اسعدک اللہ تعالیٰ فی الدارین کہ چند کلمۂ عربی و فارسی ہر یک با ترجمۂ ہندوی برائے تعلیم صبیان بر طریق ریختہ (گفتہ آمد)"

بدقسمتی سے اس نسخہ میں بھی مصنف کا نام مرقوم نہیں۔ اس رسالہ میں چھپن فصلیں ہیں۔ اور ہر فصل میں چار شعر ہیں۔ اس حساب سے اس کے اشعار کی تعداد دو سو چوبیس ہوتی ہے۔ کتاب کا آغاز حسب معمول خالق باری سرجن ہار الخ سے ہوتا ہے۔ اب یہ فصلیں یا تو متناسب الفاظ و لغات یا بحور کے لحاظ سے قائم کی گئی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ رائج الوقت خالق باری کا شیرازۂ اشعار بہت کچھ درہم و برہم کر دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا دیباچہ اور نام قطعاً بھلا دیئے گئے۔ سب سے دلچسپ دیباچہ کا وہ پارہ ہے۔ جس میں ریختہ کا لفظ موجود ہے ریختہ کے موجد اگرچہ امیر خسرو ہیں۔ لیکن ان کے ہاں وہ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے۔ اس دیباچہ میں ریختہ نظم کے معنوں میں آیا ہے۔ اور یہ وہ معنی ہیں۔ جو ولیؔ اور سراجؔ کے ہاں ملتے ہیں۔ ریختہ بمعنی نظم گیارھویں صدی کے آخر میں ملتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے۔ کہ کتاب

مطبوع الصبیان مع دیباچہ اسی قرن میں کسی وقت تصنیف ہوئی ہوگی:۔

عالمگیر کے عہد میں اردو زبان کی طرف خاص توجہ کی جاتی ہے۔ اور بچوں کیلئے یہی زبان ذریعۂ تعلیم بن جاتی ہے۔ اور بارھویں اور تیرھویں صدی میں خالق باری کے انداز کی درجنوں کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً رازق باری، حامد باری، ایزد باری واحد باری، صمد باری، مالک باری، اللہ باری اور قادر نامہ میرزا غالب وغیرہ جب اس قدر کتابیں دو صدی کے اندر اندر لکھی گئی ہیں۔ تو ظاہر ہے۔ کہ خالق باری بھی ان کے متصل زمانہ میں لکھی گئی ہوگی۔ یہ امر قرین قیاس نہیں کہ خالق باری ۷۰۰ھ سے قبل لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد پورے چار سو برس یعنی گیارھویں صدی تک اہل علم خاموش رہیں۔ اور بارھویں اور تیرھویں صدی میں اس کی تقلید میں درجنوں کتابیں لکھی جانی شروع ہوں۔ میرے نزدیک خالق باری اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور اس کا زمانہ ہمیں دیگر تصنیفات کے زمانہ کے قریب ماننا چاہیئے:۔

اگر خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہوتی تو صورت حالات بالکل مختلف ہوتی۔ اس عہد سے بیسیوں سینکڑوں کتابیں اب تک اسکی تقلید میں لکھی جاتیں۔ شارح اس کی شرحیں لکھتے۔ اہل لغات اس سے استناد کرتے۔ اور یہ کتاب مختلف فیہ لغات کے لیے ایک سندی ماخذ بن جاتی۔ بہت کم لوگ واقف ہیں۔ جس محنت اور مشکلات کے ماحول میں آٹھویں نویں اور دسویں قرن ہجری کے ہندی فرہنگ نگاروں نے اپنی کتب لغات ترتیب دی ہیں۔ وہ ادنیٰ ادنیٰ

شرحوں سے لغات جمع کرتے ہیں۔ کتابوں کے حواشی سے الفاظ لیتے ہیں۔ استادوں سے پوچھ رہے ہیں۔ خطوط و رقعات سے استناد کر رہے ہیں۔ وغیرہ۔ اگر امیر خسرو اتنا بڑا مجموعۂ لغات اپنی یادگار چھوڑ جاتے جو کہا جاتا ہے کئی ہزار اشعار اور کئی جلدوں پر شامل تھا۔ تو کیا یہ فرہنگ نگار جو ایک درجن سے زیادہ ہیں۔ اس سے استفادہ نہ کرتے۔ یہ خیال کرنا کہ محض اتفاقیہ یہ کتاب ان کے ہاتھ نہ لگی، بے حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کتاب کو داخل نصاب مانا جاتا ہے۔ اس لئے شروع ہی سے ان کی واقفیت اس سے ضروری تھی۔

مولانا محمد امین صاحب نے اس یقین کے اندر کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہے۔ شاعرانہ انداز میں دل کھول کر اس کی مدح سرائی کی ہے۔ بلکہ نصاب الصبیان سے ایک قسم کا مقابلہ کر کے خالق باری کی افضلیت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور غالباً مولانا نے یہ سب کچھ محض عقیدتاً کیا ہے۔ کیونکہ حقیقتاً اگر ان کو مقابلہ منظور ہوتا۔ تو نصاب الصبیان کے بجائے عبد الواسع کے نصاب یا قادر نامۂ میرزا غالب سے مقابلہ کرتے۔ جو ہر حال میں زیادہ موزون ہوتا۔ امیر کی وقعت ہمارے دل میں بھی اسی قدر ہے۔ جس قدر کہ مولانا کے دل میں ہے۔ لیکن خالق باری کا معاملہ اور بات ہے۔ میں امیر کی طرف اس تالیف کا انتساب امیر کی ہتک سمجھتا ہوں۔ ہمیں اس کے نقائص پر بھی ذرا ایک نگاہ ڈال لینی چاہیئے۔

اس کتاب میں ہر قسم کی ترتیب کا التزام مفقود ہے۔ مضمون الفاظ اور

وزن میں کوئی ترتیب ملحوظ نہیں۔ ہندی الفاظ کے صحیح تلفظ کی کوئی پروا نہیں کی گئی۔ عربی۔ فارسی اور ہندی الفاظ کے مرادفات التزاماً نہیں دیئے۔ کبھی فارسی ہندی دیے۔ کبھی فارسی عربی پر قناعت کرلی۔ اور کبھی صرف ہندی الفاظ پر۔ پھر بھرتی کے الفاظ اس کثرت سے لائے گئے ہیں۔ کہ الفاظ برائے بیت خالق باری کا وقیع پہلو بن گئے ہیں۔ مثلاً سہ

باده شراب وراوق وصہبامے است دمد
گرجرعہ زاں خوری تو کنی کار نیک و بد

کا آخری مصرع تمام و کمال برائے بیت ہے۔ پھر ہی الفاظ بعض اوقات دوبارہ دہرا دیئے ہیں۔ ان کی مثالیں دینا باعث طوالت ہے۔ ہمیں غور کرنا چاہیئے۔ کہ کتاب نوعمر بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس لئے اس کی بحروں کا شگفتہ اور سبک ہونا ضروری تھا۔ لیکن اس تصنیف کی اکثر بحریں غیر شگفتہ اور ناہموار ہیں۔ پھر اوزان کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔ ایک مصرع بڑھ گیا۔ اور ایک گھٹ گیا۔ کوئی اوچھا اور کوئی لمبا ہو گیا۔ مثلاً

ند بود سونا سیم جتبل نقرہ روپا   جامہ کپڑ تاٹ پیرھوڈ یہ کو یا

جو بظاہر بحر رمل مسدس سالم ہے۔ لیکن مصرع اوّل کی ابتدا میں ایک سبب خفیف زائد از وزن لایا گیا ہے۔ اور شعر

عقرب بتازی بچھو کثردم برج فلک   بشمر تو مروش دفرشتہ ملک

میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلا مصرع انگڑائی لے رہا ہے۔ اس کے وزن کی اگر تلاش کی جائے۔ تو فارسی والے کہیں گے کہ کوئی ہندی وزن ہوگا۔ اور ہندی والے کہیں گے کہ فارسی وزن ہوگا۔ ٹنے والے شعر میں

تون فصاد است کہیرا باد رنگ تو   چھینکا آدنگ ہندوی ڈھیل ہے ورنگ

آدنگ کا کاف اور ڈھیل کی لام زائد از وزن ہیں ؛

بعض مقامات پر دیکھا جاتا ہے کہ مصنف مختلف موقعوں پر ایک ہی لفظ کے دو مختلف معنی دے جاتا ہے۔ مثلاً ذیل کے دو شعر

عنقا یمرغ ہست لگ لگ ہے تلیرا   ہم بارکش ربیحاں ہے جیبڑا

طاؤس مور باشد و درّاج تلیترا   خوب دنکو بھلا و بد و زشت ہے برا

مصنف کے نزدیک تیتر کی فارسی لگ لگ بھی ہے۔ اور درّاج بھی۔ لیکن خود فارسی میں لگ لگ اور درّاج دو مختلف جانور ہیں۔ درّاج بیشک تیتر ہے لیکن لگ لگ کو اہل لغات یوں بیان کرتے ہیں :۔

"مرغیست مشہور، کہ گردن و منقار و پائے دراز دارد و مار را شکار کند۔"

حکیم سنائی فرماتے ہیں ؎

آں لگ لگ گوید کہ لک الحمد و لک الشکر   تو طعمۂ من کردۂ آں مارسیاں را

اب ایسی غلطی امیر خسرو سے نہایت بعید ہے۔ کسی دوسرے موقع پر خرما کے معنی ہنگو کھجور بتاتے ہیں۔ اور دوسری جگہ املی۔ چنانچہ ؎

جان خرما ہندوی املی ۔۔۔ واں صمغ گوند گلیم اسپ کمبلی

ہندوی گویند خرما را کھجور ۔۔۔ ذاکھ را تو فارسی میدان انگور

املی کو اگرچہ خرمائے ہندوی کہا جاتا ہے۔ لیکن جس طریق سے مصنف نے بیان کیا ہے بے حد مغالطہ خیز ہے۔ انگور کا تلفظ جس طرح شعر دوم میں کیا گیا ہے۔ وہ ہمیں پنجاب کی یاد دلاتا ہے۔ انگور کا یہ تلفظ امیر سے بعید ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ شعر آئندہ میں مصنف سے ایک اور لغزش مشاہدہ ہوتی ہے:

فارسی سیمرغ و عنقا ہست تدرو و کبک ہنس

ہمچو بزغان است کانور ہے زربرو نسل بنس

اس شعر میں تدرو، کبک اور ہنس تین مختلف پرندوں کو مصنف نے ایک مان لیا ہے۔ کبک کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ اسی کو ہم چکور کہتے ہیں۔ ع

کبک کو ہندی میں کہتے ہیں چکور

میرزا غالب قاطع برہان میں کہتے ہیں "تدرو در فارسی طائرے را گویند کہ بہ ہندی نیست" اور فرہنگ نویس کہتے ہیں کہ "مرغے ست صحرائی شبیہ بخروس در نہایت خوش روشی و خوش رفتاری۔" لیکن ہمارے لئے سب سے اہم یہ امر ہے۔ کہ خود امیر خسرو کبک اور تدرو کو علی الرغم مصنف خالق باری علیحدہ علیحدہ پرندے تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ قران السعدین

آنکہ پیدے زیر خود تدرد ماندہ چو پر گم شدگاں زیر سرو

لالہ چو از کوہ برفت از شکوہ کبک بریدہ دل از بیخ کوہ

قرآن السعدین میں دونوں شعر اسی ترتیب سے بلا فاصلہ ملتے ہیں جس سے اس احتمال میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ امیر کے نزدیک کبک اور تدرو دو مختلف جانور ہیں۔ اس لئے خالق باری کا مصنف اور امیر خسرو ایک شخص نہیں ہیں۔ لیکن صاحب خالق باری نے تدرو اور کبک کو ایک جانور کیوں تسلیم کیا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ خود بعض اہل لغات اس غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مثلاً مؤید الفضلا میں تدرو کی تشریح میں ہم یہ عبارت پڑھتے ہیں :-

تدرو بفتحتین، کبک و آں پرندہ ایست آتش خوار و خوش رفتار کہ بکوہہا بود

کذا فی الادات (الفضلا)

ادات الفضلا، قاضی بدر الدین محمد دہلوی نے ٨٢٢ھ میں تالیف کی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ صاحب خالق باری نے اپنی کتاب کی تالیف کے وقت ادات الفضلا مؤید الفضلا ٩٢٥ھ یا کسی اور ایسی کتاب لغات سے امداد لی ہے۔ جس کے ماخذ میں یہ کتابیں شامل ہیں :-

بیت ذیل بھی قابل توجہ ہے ؎

نیا خال ہندوی ماموں جان او رعم کہئے چچا لکھان

نیا' کے معتبر معنی دادا یا نانا کے ہیں۔ چنانچہ لغت فرس۔ فرہنگ جہانگیری رشیدی

چراغ ہدایت اور آنندراج میں صرف یہی معنی دیئے ہیں۔ اور فردوسی علی العموم
انہی معنوں میں لاتا ہے۔ مثال :-

درو گر زمانست دریا چو گیا　　همانش نبیره همانش نیا

مصنف خالق باری نہایت مشہور اور مستند معنی کو صرف نظر کر کے غیر معروف
بلکہ مشتبہ معنی "ماموں" دیتا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ یعنی
ادات الفضلا یا مؤید الفضلا وغیرہ لغات سے نقل کر رہا ہے۔ چنانچہ مؤید الفضلا
میں اس لغت کے لئے لکھا ہے۔ "جد و برادر مادر و برادر بزرگ" لیکن یہ یاد رہے
کہ آخری دونوں معنی کے لئے ہمارے پاس کوئی معتبر سند نہیں ہے۔ اور غالباً
ایسے معنی ہیں جو ہندوستان میں بعض غلط فہمیوں کی بنا پر پیدا ہو گئے ہیں :

خالق باری جیسی کتاب کی تصنیف کتب لغات کی امداد کے بغیر دشوار ہے۔
لیکن جو لغات مصنف کے پیش نظر ہیں۔ ایسی ہیں۔ جو مغلوں کے عہد سے پیشتر ہندوستان
میں لکھی گئی ہیں۔ کیونکہ جو لغزشیں ان کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کا عکس خالق باری
میں بھی مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے۔ کہ خالق باری ان کتب لغات کے
بعد لکھی گئی ہو۔ مؤید الفضلا سنہ ۹۲۵ھ میں کہا جاتا ہے۔ تصنیف ہوئی ہے۔ اگر یہ
صحیح ہے۔ تو ظاہر ہے کہ خالق باری اس کتاب کی تصنیف کے بہت بعد تالیف
ہوئی ہوگی :

خالق باری کو مؤید سے مؤخر ماننے کے لئے ایک اور بھی دلیل ہے۔ جو یہ ہے۔

کہ مؤید الفضلا میں بعض اوقات فارسی الفاظ کے ہندی مرادفات بھی دیے گئے ہیں۔ جب ان ہندی الفاظ کا خالق باری کے ہندی الفاظ سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ تو مؤید کا تقدم خالق باری پر صریحاً ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ مؤید کی زبان خالق باری کی زبان سے زیادہ قدیم ہے۔ میں یہاں چند الفاظ کی فہرست مقابلہ کی غرض سے ناظرین کے پیش کرتا ہوں:-

مؤید الفضلا۔ حربا = کھرکٹ ۔ داس = ہنسوا ۔ چار مغز = اکروٹ

خالق باری۔ حربا = گرگٹ ۔ داس = داتی ۔ جوز خراسان = اخروٹ

مؤید الفضلا۔ جوز بوا = جاپھل ۔ بوے = گندھ ۔ خیار = ککھری

خالق باری ۔ جوز بوا = جائے پھل ۔ بوے = باس ۔ خیار = ککڑی

مؤید الفضلا ۔ انگوزہ = ہینگھ ۔ دبہ = کوپہ ۔ خرس = بھال

خالق باری ۔ انگوزہ = ہینگ ۔ دبہ = کوپا ۔ خرس = ریچھ

مؤید الفضلا ۔ غنور = کوٹھی ۔ دوغ = چھاچھ ۔ اسمانہ = چھنہ

خالق باری ۔ کندو = کوٹھیا ۔ دوغ = مہی ۔ سقف = چھت

مؤید الفضلا ۔ فاذہ = جنوائی ۔

خالق باری ۔ فاذہ = جمائی ۔

لیکن خالق باری کی زبان کے مقابلہ کے لئے میرے نزدیک سب سے مناسب کتاب نصاب سہ زبان یا صمد باری عبد الواسع ہانسوی ہے۔ عبدالوسع عہد عالمگیر کے

ایک بزرگ مانے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب دستور العمل معروف بہ رسالۂ عبد الواسع نہایت مشہور ہے، اور اب بھی درس میں داخل ہے۔ نصاب سہ زبان ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ اس میں التزاماً ہر مصرع میں تین تین لفظ عربی، فارسی اور ہندی کے بالترتیب یکے بعد دیگرے دئے گئے ہیں۔ ساتھ ہی متناسب الفاظ کو علیحدہ علیحدہ عنوان کے نیچے بیان کر دیا ہے۔ مثلاً لغات اعضائے انسان، اجناس غلہ، میوہ جات، ترکاریہا دگھا، ادویات وغیرہ خاتمہ میں مصادر مشہورہ و غیر مشہورہ دیئے ہیں۔ اب خالق باری اور نصاب کی زبان میں بہت کم فرق دیکھا جاتا ہے۔ اکثر الفاظ دونوں میں عام ہیں۔ لیکن چونکہ عبد الواسع ہانسی کے متوطن ہیں جہاں ہریانی زبان کی اشاعت ہے۔ غالباً اس اثر میں عبد الواسع بعض ایسے الفاظ (اگرچہ ہندی ہیں) دئے جاتے ہیں جن سے موجودہ دوجوان واقف نہیں۔ ذیل میں خالق باری اور نصاب کے بالاعتبار الفاظ کی ایک فہرست دی جاتی ہے :-

خالق باری	فاژه = جمائی	تپ = جوڑی	راسو = نیولہ
نصاب سہ زبان	فاژه = جمہائی	تپ = جڑا	راسو = نیولا
خالق باری	روباہ = لونگڑی	شیر = سینگھ	امید = آس
نصاب سہ زبان	روباہ = لومڑی	شیر = باگھ	امید = آسا
خالق باری	نیا = ماموں	مردمک = پوتلی	لب = ہونٹھ
نصاب سہ زبان	نیا = دادا	مردمک = پتری	لب = ادھر

خالق باری گوش = کان رخسار = گال انگشت = اونگلی

نصاب سہ زبان گوش = سرون رخسار = کپول انگسٹ = انگری

خالق باری پاے = پانو مادر = ماں پیشانی = کپار

نصاب سہ زبان پاے = چرن مادر = مہتاری پیشانی = ماتھا

خالق باری چشم = نین پہلو = پانسلی

نصاب سہ زبان چشم = لوچن پہلو = پانسلی

دونوں کتابوں کی زبان پر غور کرنے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ خالق باری نصاب سے چنداں مقدم نہیں ہے؛

آخر میں ایک اور امر کی طرف بھی توجہ دلائی جاتی ہے کہ موجودہ خالق باری کا متن جس میں علیگڑھ کا نیز بازاری اڈیشن شامل ہیں چنداں قابل اعتبار نہیں معلوم ہوتے۔ مولوی محمد امین صاحب چڑیاکوٹی نے اگرچہ نہایت جانفشانی سے اپنا نسخہ مرتب کیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے انھوں نے زیادہ تر مطبوعہ نسخوں پر اعتبار کیا ہے۔ اور قلمی نسخوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس لئے ان کا نسخہ گرچہ بازاری نسخوں کے مقابلہ میں بہتر مانا جاسکتا ہے۔ تاہم مستند نہیں ہے۔ کیونکہ بمرور زمانہ مطبوعہ نسخوں میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ اور حک و اصلاح ہو گئی ہے۔ خالق باری کی قدیم ترتیب اور اشعار کی تنظیم بالکل برباد کر دی گئی ہے۔ اور رفتہ رفتہ بعض اغلاط بلکہ یوں کہیے۔ مصنوعی لغات اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ میں یہاں صرف چند مثالوں پر قناعت

کرتا ہوں :۔

علی گڑھ اور بازار کے نسخوں میں ایک مصرع ۔

"تا بہ گزکان است کڑاہی و توا"

آتا ہے ۔ جس میں "گزکان" نے مصنوعی لغت کی حیثیت اختیار کرلی ہے ۔ گزکان اس صورت میں آنند راج ۔ برہان ۔ نفائس ۔ رشیدی اور جہانگیری میں نہیں ملتا البتہ قازقان ۔ قزقان اور گزغان بمعنی "دیگ بزرگ مسین" ملتا ہے ۔ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے ۔ امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

دے با اینہمہ زیں خوان غالی شستہ ہر دو ستم

کہ حلوائے رضا پختہ نگردد اندریں گزغان

قلمی نسخوں کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مصرع بالا میں "گزغان" دراصل لکھا تھا ۔ اسی طرح مصرع ؏

بندری کہانڈ کہاوے اَن من ریاں من امیخ

میں "اَن من" یا "اَن من" ایک حیرت میں ڈالنے والا لغت بن گیا ہے ۔ مولوی محمد امین صاحب بھی اس لفظ کی تشریح سے عاجز ہیں ۔ اور تجویز کرتے ہیں "قیاس یہ چاہتا ہے کہ یہ لفظ "انمڑ" ہے ۔ اس صورت میں وزن عروضی درست ہو جاتا ہے" لیکن اس کے معنی جو مولوی صاحب "بادل کا گھر آنا" بیان کرتے ہیں ۔ چنداں چسپاں نہیں ۔ مگر قلمی نسخوں میں یہ مصرع یوں ہے ؏

اب وہ تمام گنجلک رفع ہو جاتی ہے۔ ایک مصرع

"ہم قرنفل لونگ رکیکر بنجواں"

میں لکیکر پنجابی لفظ بنایا گیا ہے۔ چنانچہ تمام نسخوں میں اس کو پنجابی لکھا گیا ہے لیکن سب سے زیادہ حیرت خیز یہ امر ہے کہ اہل پنجاب اس لفظ سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہیں۔ قلمی نسخوں میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصرع مذکورہ دراصل یوں ہے کہ۔

"ہم قرنفل لونگ رانکو یاں"

اس سے ظاہر ہے کہ کیکر محض اتفاقیہ ایک مصنوعی لغت بن گیا ہے اور کوئی تعجب نہیں۔ اگر لفظ رنیکو ترقی معکوس کرتا ہوا کیکر بن گیا ہو!!

شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ

ہندوستان کے مشاہیر اولیا سے ہیں ابتدا میں سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کے مرید ہونے کی نیت سے ۷۲۵ھ میں دہلی آئے۔ لیکن اس وقت تک ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ آخر دہلی ہی میں شیخ نجیب الدین فردوسی کے مرید ہو گئے۔ بہار جا کر مانوں کوہ راجگیر میں ریاضت و عبادت میں مشغول رہے ۷۸۲ھ میں وفات پائی اور میر اشرف جہانگیر سمنانی نے نماز جنازہ پڑھائی تصنیفات کے سلسلہ میں آپ کے ملفوظات و مکتوبات موسوم بہ معدن المعانی کتاب ارشاد السالکین اور شرح آداب المریدین مشہور ہیں۔ شرف نامۂ احمد منیری ابراہیم بن قوام فاروقی نے آپ ہی کے نام پر سلطان باربکشاہ ۸۶۴ھ و ۸۷۹ھ والی بنگالہ کے عہد میں لکھا ہے۔ شیخ شرف الدین بھاشا میں بھی شاعری کرتے تھے۔ اور شرف آپ کا تخلص تھا۔ ذیل میں آپ کا ایک "کج مندرہ" جو انواع امراض کے لئے مفید بتایا جاتا ہے۔ نقل کرتا ہوں۔ ان کے دو دوہرے اس کج مندرہ میں بھی موجود ہیں۔ علاوہ ازیں کج مندرہ اس عہد کی اردو کا بھی ایک اچھا خاصا نمونہ ہے:۔

کج مندرہ از شاہ شرف الدین احمد یحییٰ منیری برجمیع امراض کہ دریں ذکر میشود مجرب است از علف خشک جھاڑا بکند:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللّٰهم صل علیٰ محمد وآل محمد صاحب التاج والمعراج
والبراق اسمه جسمه مطهر منور مولی الثقلین صاحب
العلم والحلم دافع البلاء والوباء ابو القاسم محمد بن عبد اللہ
صاحب العرب والعجم . یاایها المشتاقون الذین امنوا بنور
جماله صلوا علیه وآله وسلموا تسلیما کثیرا کثیرا برحمتک
یا ارحم الراحمین ۔ بسم اللہ شافی بسم اللہ المعافی بسم اللہ
الکافی بسم اللہ خیر الاسماء بسم اللہ الذی لا یضر مع اسمه
شیئ فی الارض ولا فی السماء وهو السمیع العلیم ۔ اوّل انکارا
اوتنا کرنا بین ہرتا دہی ایک سرجن ہار دو جگ تین تلوک، چار بید پانچ پیاد تھ
نمک سات سمند بات نیں نو گرہ دس راون اگیارہ رودر بارہ راس ۔ تیرہ
تھول چودہ بھون پندرہ تتھ سولہ کلا ستار کہاں چار بان پانچ بھوت اٹ
بان نوے نا تچاراسی ستیا ہا چوستھ جوگنی اٹھت کوڑی اناک تی تیس
کوڑی دیوتا چوراسی ۔ سحن سرجیو جنت اکاس پاتال سرتا منڈل راتدی
بھرکھری ڈنڈتی ڈنڈ ٹلا پیلا اجک مہورت بن تہیں سا کھی دہرت ہوں جو کچھ
فلانے کے پنڈ بدن میں ہیتی ر وسحا بات کا ۔ کڑتے کا پوکھر کا اند بیاری کا
اجیالی کا جوت کا بھیت کا کنے کا کرات کا بیچے کا بھجاتے کا لانکھے کا

آلکھیں کا دیو دانو بھوت بیت لا کھن بھوکس ڈاکن سکھن کچن چوڑیل میل ملان
جان بھوان ڈیتہ موت تب نجاری جات اجوڑی اکھوری ہمکوڑی اندھنیا مروت
اؤ وبلھکی کرکری آدھا سیسی آدھ پر سیسی نہروا ڈہروا اکل سوا کچھ دی ملھی اٹھارہ
کوڑھ اٹھارہ پر میوہ ہوک سوک ہملندر کٹن دھر پس ایس کوڑھ کشت اوس تو ہو بلغم
پی جلش سرکی کیسی کہا کلتی بھرکی باؤ کولا سرخ باد سبز باد سیاہ باد زرد باد و ہفتاد
و دو باد ہر بادے کہ باشد و رہ جوہ فلاں جن اکار دھس ہے دوہائی سلیمان بن داؤد
پیغمبر کی جل بھسمنت ہو بیک بلا جائے بیک بلا جائے تا تر سو لاکھ پیغمبر کا بجر نشاب
ذرے ناتہ چیہ رسی ستہ بہا کا سراپ جی جی کرنت تی تی مرنت دہائی شاہ شرف الدین
احمد یحیی منیری کی بحق کھیعص و حمعسق و بحق لم یلد ولم یولد و
لم یکن لہ کفوا احد و ننزل من القران ما ھو شفاء و رحمۃ
للمؤمنین ولا یزید الظالمین الا خسارا

کالا ہنسا نرملا بسے سمندر تیر
پنکھ پسارے بکھ ہرے نرمل کرے شریر　　　　در درد بے نظیر
بحق لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ این دوہرہ را سہ بار بخواند
شرف حرف مایل کہیں درد کچھوڑ بساے
گر وچھیں دربار کی شرورو ودور ہو جاے

(از بیاض مملوکہ مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار)

شاہ کبیر یا کبیر داس

یہ ذات کے جلاہے اور بنارس کے رہنے والے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کی وفات پر مسلمانوں نے انہیں رسوم اسلام کے مطابق دفن کرنا چاہا۔ اور ہندوؤں نے اپنے مذہبی طریق پر جلانا چاہا۔ اس سے کم از کم دونوں قوموں میں ان کی ہردلعزیزی مسلم ہے۔ صاحب دبستان نے جو حالات دیئے ہیں۔ وہ زیادہ تر ہندو ذرائع سے ماخوذ ہیں۔ ان میں انہیں راما نند کا چیلا بنایا گیا ہے۔ رہندی نورتن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکے کا نام کمال اور لڑکی کا نام کمالی تھا۔ کبیر کے کلام میں قدم قدم پر مسلمانی اثر نمایاں ہے۔ اگرچہ اس کا کلام کبیر پنتھیوں اور ہندوؤں کی مزاولت میں رہنے سے بہت کچھ مسخ ہو گیا ہے اور اکثر غیر کبیری کلام اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔ تاہم مسلمان صوفیوں اور کبیر کے کلام میں بہت کم فرق دیکھا جاتا ہے۔ اکثر امور میں وہ صوفیوں کا ہم آواز ہے۔ عشق الٰہی۔ ذکر۔ فنائیت۔ محویت۔ حیرانی۔ ترک و تجرید۔ موت کی یاد۔ دنیا کی بے ثباتی۔ ہمہ اوست جو صوفیہ کے ممتاز مضامین ہیں۔ کبیر کے ہاں عام ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کے اکثر اشعار ہمیں مسلمان شعرا کی یاد دلاتے ہیں حافظ شیرازی کہتے ہیں ؎

ہر کسے پنج روزہ نوبت اوست

کبیر کہتے ہیں ع

کبیر نوبت آپنی دن دس لیہو بجا ے

فردوسی کا شعر ہے ؎

چہ بندی تو دل بر سرائے فسوس ‌ ‌ ‌ ‌ که هر دم همی آید آواے کوس

کبیر کہتے ہیں ؎

کبیر سر پر سراے ہے کیا سوئے سکھ چین ‌ ‌ ‌ ‌ سوانس نگارا کوچ کا باجت ہے دن رین

ابُوالفرج کہتا ہے ؎

هر کس بقدر خویش گرفتار محنت است ‌ ‌ ‌ ‌ کس را نداده اند برات مسلمی

کبیر کا قول ہے ؎

راجا دکھیا پرجا دکھیا جوگی کو دکھ دونا ری ‌ ‌ ‌ ‌ کہے کبیر سنو بھائی سادھو کوئی مندر نہیں نیاری

مولانا روم ؎

چشم بند و لب بربند و گوش بند ‌ ‌ ‌ ‌ گر نه بینی سرّ حق بر من بخند

اور کبیر ؎

دیکھ رہی دیکھ تجھ میں تیرا دہنی دم کو روک دیدار پاوے
دم کو روک اور محل کو بند کر چاند سورج گھر ایک آوے

کبیر کا یہ شعر ہمیں عمر خیام کی یاد دلاتا ہے ؎

ماٹی کہے کمہار کو تو کیا روندے موہیں ‌ ‌ ‌ ‌ اک دن ایسا ہوئیگا میں روندونگی توہیں

کبیر کی زبان اُردو سے بہت ملتی جلتی ہے۔ دس فیصدی سے زیادہ اس کے ہاں فارسی الفاظ ہیں، بلکہ ایسے فارسی محاورے جو اُردو کے ذریعہ سے عام میں رائج تھے۔ اس کے ہاں موجود ہیں۔ مثلاً نوبت زدن فارسی محاورہ ہے۔ کبیر نے اس کا ترجمہ نوبت بجانا کرلیا۔ اسی طرح "تیشہ برپا زدن وغیرہ دن" فارسی کا ایک اور محاورہ ہے۔ کبیر اس کا بھی استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ ؎

بن گنوایو سنگ دنی ونی نہ چالی ساتھ　　پانو کلھاڑی ماریا مورکھ اپنے ہاتھ

فارسی کی ضرب المثل ہے:۔ ؎

کہ زنگی بشستن نگردد سفید

کبیر اپنے انداز میں یوں لکھتا ہے:۔

کوئلا ہوے نہ اوجرو نو من صابن لائے

ان چند امثال سے جو میں نے یہاں دکھائی ہیں، ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کبیر اپنے تخیل جذبات اور معقولات میں بہت کچھ مسلمانوں کے زیر اثر ہے۔ اور یہ کہ اس کی تربیت مسلمانوں میں ہوئی ہے۔ لیکن جس طرح حضرت عیسیٰ نے یورپ پہنچ کر یورپی خط و خال پیدا کرلئے ہیں۔ اسی طرح کبیر کے کلام نے ہندوؤں کی صحبت میں رہ کر ہندوانی شکل اختیار کرلی ہے۔ کبیر کے معتقدوں نے یہی نہیں کیا ہے بلکہ ایک قدم اور بلند پروازی کی ہے یعنی کبیر کے نام پر ایسے ابیات اور نظمیں شائع کی ہیں۔ جو اسلام پر حملہ ہیں۔ مثلاً یہ شعر کبیر کے نام پر شہرت رکھتا ہے ؎

کانکر پاتھر جوڑ کے مسجد لینی بنائے　　تا چڑھ ملا بانگ دے بہرا ہوا خدائے

کیا یہ سمجھا جائے کہ کبیر جو مسلمان اور مسلمان زادہ تھا۔ اور مسلمان گھر کا پرورش یافتہ اذان جیسے معمولی رکن اسلامی کی غایت اصلی سے ناواقف محض تھا۔ مسلمانوں کا بچہ بچہ تک جانتا ہے کہ اذان کا مقصد اعلان نماز ہے۔ "تاکہ نمازی بروقت جمع ہو جائیں۔ نعوذ باللہ یہ مقصد نہیں کہ خدا بہرا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر ہے ؎

مسلمانوں کے پیر اولیا مرگی مرگا کھے گی
خالا کی ری بیٹھی بیاہیں گھر ہی میں کریں سگائی

اس شعر میں پہلا اعتراض مرغا مرغی کے ذبیحہ پر ہے۔ دوسرا اعتراض خالہ کی بیٹی بیاہنے پر ہے یہ اعتراض محض ہندو نقطہ نظر سے ہیں۔ اور ہر وہ شخص جس نے مسلمانوں میں پرورش پائی ہے اسکو لغو سمجھیگا۔ کبیر ایک صاحب ترک و تجرید شخص ہے۔ اس کے مسلک کو ایسے فقہی مسائل سے کوئی لگاؤ نہیں۔ کبیر اپنی اصلی نظموں میں اپنے آپ کو مسلمان جلاہا کہتا ہے۔ وہ اپنی ایک نظم میں بار بار اپنے آپ کو مسلمان جلاہا کہتا ہے۔ جس کا پہلا مصرع یوں شروع ہوتا ہے :۔

"مسلمان جولاہہ ایک"

دوسرا مصرع مجھ کو یاد نہیں رہا :

کبیر کا بارہ ماسہ راقم کے پاس موجود ہے۔ جو انھوں نے اپنے مرید سید مراد کی فرمائش پر لکھا ہے۔ اس میں سمت تصنیف سمت ۱۱۳ دیا ہے۔ جو غالباً

کوئی اور سمت ہے۔ میں اس کا ابتدائی بند یہاں نقل کر دیتا ہوں :-

کئی ہیں اب آیو یو تو ہاپا   بناں بیو کہو یو تر نا پاٹو   سبھی ہیں میں کھیل گنوائی   پیر کی نیہا نیک نہیں پائی
ساہو رکھو ہیں جات نجانی   گور کی بچن نیک نہیں مانی   جھن جھن دیہہ بھی جات جھیلاں   پہ گو سمرن کچھو نہ کینان
سب جیہن کارتھ کھویو   برہی نام کبیر ارویو   پیلا سید مراد سیانا   جن گو بچن ساتھ گورمانا
موسوں کہی موہ یہ آسا   کہو یو موکوں بارہ ماسہ   مانس مانس میں جی دکھ پایے   تے جگ کوں ان آئے سنائے
برہی سمت ہے بھیو گیارہ سے اور تیس   بارہ ماسہ میں کہوں بنا ت دیو اکیس

صاحب مخزن الاصفیا (ص ۴۴۶) کبیر کے متعلق لکھتے ہیں :-

" مرید و خلیفۂ شیخ تقی است از اولیاء اللہ و مشاہیر عہد خود است و جمال ولایت
را در طریق ولایت مستور داشتے و در موحدان وقت خود ممتاز بود و او را
در زبان ہندی کلام بسیار عالی است کہ بر علو درجات او دال است و اگر
در کلام او تفحص و تجسس کردہ آید نوعے از قسم وصال یافتہ شود و فراق را
در ساحت وصلت او اصلا عبور نیست - و اول کسے کہ بزبان ہندی حقائق
و معارف بیان فرمودہ او ست و انواع اشعار ہندی دارد لیکن اکثرے
از جنس بشن پد و ساکھی از روے منقول است و اگر بنظر انصاف بہ بینی جواہر
دقائق و لآلی حقائق بمیزان سنجیدہ است کہ مثل آں در کلام دیگرے یافتہ
نمیشود .... و از قوت باطنی او آنکہ اہل اسلام و ہنود و ہر دو فریق
بروے اعتقاد کامل دارند و از خود شمارند چنانچہ اہل اسلام بہ پیر کبیر و در ہنود

به بھگت کبیر اشتہار دارد"

شیخ عبدالحق اپنے دادا شیخ سعد اللہ متوفی ۹۲۸ھ کی رائے کبیر کے متعلق ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :-

"عمی میفرمودند روزے از ایشان پرسیدم ایں کبیر مشہور کہ بشن پدہاے وے میخوانند مسلمان بود یا کافر؟ فرمودند موحد بود، عرضہ کردم کہ موحد مگر غیر کافر و مسلمان است؟ فرمودند فہم ایں معنی دشوار است خواہید فہمید"

(اخبار الاخیار صہ ۳۰۳)

کبیر کے زمانۂ وفات کے متعلق بہت کچھ اختلاف ہے۔ اکثر مصنفین ان کو سلطان سکندر لودھی کے عہد میں ملتے ہیں مثلاً ابوالفضل اور صاحب دبستان المذاہب اس طرح ان کی وفات دسویں صدی ہجری کے پہلے ربع میں ہونی چاہیئے۔ لیکن سرکاری آرکیالوجیکل رپورٹ آثار قدیمہ و مخطوطات صوبۂ شمال و مغربی و اودھ (صہ ۲۲۴) میں لکھتا ہے۔ کہ بجلی خاں نے کبیر کا روضہ موضع مگھر ضلع بستی میں (جہاں کبیر وفات پاتے ہیں) ۱۴۵۰ء میں طیار کرایا جو سال ۸۵۴ھ کے مطابق ہے؛ اور ۱۰۷۲ھ میں فدائی خاں نے بعہد اکبر اس روضہ کی مرمت کرائی۔ شاہ کبیر کی یادگار میں ایک مسجد شہر جونپور میں بابا بھیک نے ۱۰۹۱ھ میں تعمیر کی ہے۔ کبیر کی اوقاف کے لئے دو گانو شاہی زمانہ سے معافی میں چلے آتے ہیں۔ ایک گانو مسلمانوں کے قبضہ میں ہے۔ اور دوسرا ہندوؤں کے قبضہ میں۔ کبیر کے

مزار کے برابر ہندوؤں نے کبیر کی سمادھ بنا رکھی ہے۔ سمادھ میں ایک سادھو رہتا ہے

اور مزار پر مسلمان مجاور رہیں ::

کبیر کی تحریک ان اثرات کی آواز بازگشت ہے جو اسلام کی موجودگی سے ہندوستان میں بر روئے کار آئے ہیں۔ کبیر کی آواز توحید کی نشر و اشاعت اور بت پرستی کی بیخ کنی میں نہایت مفید ثابت ہوئی ہے۔ اور ہندوستان کے ایسے مذاہب پر جو اس کے بعد وجود میں آئے ہیں۔ اس کا اثر نہایت گہرا ہے۔ مثلاً کبیر پنتھیوں کا وہ پیشوا مانا جاتا ہے۔ دادو پنتھیوں، ستنامیوں اور نانک پنتھیوں پر بھی کبیر کا پرتو نمایاں ہے۔ مسٹر بوس کا بیان ہے کہ کبیر نے ہندوستان کی بارہ تیرہ مذہبی تحریکات پر اثر ڈالا ہے۔ بلحاظ شاعری اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ ہندی زبان کا در حقیقت پہلا بڑا شاعر ہے۔ اس کا کلام سادگی، تاثیر، صفائی، جدت، معنی آفرینی، سوز و گداز اور شیرینی ادا کے اوصاف سے آراستہ ہے۔ کبیر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے۔ کہ دقیق سے دقیق خیال کو چند معمولی الفاظ میں ادا کر سکتا ہے جسکو خواندہ و جاہل اور عامی و عالم سب سمجھ سکتے ہیں۔ اور اسی کمال کی بدولت اسکو دائمی شہرت کا تاج مل گیا ہے۔ تلسی داس اور سور داس اگرچہ کبیر سے بہت بعد گزرے ہیں۔ لیکن ان کا کلام اس قدر دقیق اور عالمانہ ہے کہ ہم اس کا اکثر حصہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لیکن کبیر کے ہاں یہ دقت محسوس نہیں ہوتی اگرچہ اس کا وطن بنارس ہے۔ لیکن اُسنے وہ زبان استعمال کی ہے جو اس زمانہ میں عوام الناس کی زبان تھی اسی لئے

اس کا کلام اردو کے اس قدر قریب ہے کہ آج بھی اس کا سمجھنا دشوار نہیں۔ کبیر کی تصنیفات سے بعض ریختہ بھی مشہور ہیں۔ اسی طرح اس نے فارسی بحروں میں بھی لکھا ہے۔ اور دیکھا جاتا ہے کہ بعض موقعوں پر اس نے ردیف و قافیہ کی بھی پابندی کی ہے۔ میں یہاں دو مثالیں درج کرتا ہوں:۔

خلق سب رین کا سپنا سمجھ من کوئی نہیں اپنا — کٹھن ہے موہ کی دھارا، بہا سب جات سنسارا
گھڑا جوں نیر کا پھوٹا پتا جو ڈار سے ٹوٹا — اس نر جات جند گانی ابھوں لگ بھی مانی
بھولو مت دیکھ تن گورا جگت میں جیونا تھورا — تجو بد لو یہ چترائی رہو نہ سنگ جاگ مائیں
نکس جب پران جاوینگے کوئی نہیں کام آوینگے — جسن پہ پوار ست دارا اسی دن ہو ینگے نیارا
اس نر جان یہ دیہا لگائے نام سے نیہا — کٹے جسم جال کی پھانسی کہے کبیر ابی ناسی

(کبیر بچن اولی صد ۱۹۳)

دیگر:۔

سنتا نہیں دھن کی خبر ان حد باجا باجتا — رسمند مندر گاجتا باہر سنے تو کیا ہوا
گانجا افیم د پوستا بھنگ و شراب پیوتا — اک پریم رس چاکھا نہیں املی ہوئے تو کیا ہوا
کاسی گیا اور دوارکا تیرتھ سکل بھرمت پھر — گانٹھی نہ کھولی کپٹ کی تیرتھ گیا تو کیا ہوا
پوتھی کتابیں بانچتا اوروں کو نت سمجھاوتا — ترکوٹی محل کھوجے نہیں بک بک مرا تو کیا ہوا
قاضی کتابیں کھوجتا کرتا نصیحت اور کو — محرم نہیں اس حال سے قاضی ہوا تو کیا ہوا
شطرنج چوپر گنجفہ اک نرد ہے بد رنگ کی — بازی نہ لائی پریم کی کھیلا جوا تو کیا ہوا

جوگی ہو کبیرے بڑا کپڑا رنگے رنگ لال سے | واقف نہیں اس رنگ سے کپڑا رنگا تو کیا ہوا

مندر جھروکے راوٹی گل چمن میں بیٹھے سدا | کہتے کبیرا ہیں سہی گھٹ گھٹ میں صاحب رم رہا

(کبیر بیجاولی)

یہ نظمیں اچھی خاصی اردو کہلائے جانے کی مستحق ہیں۔ لیکن مجھ کو شبہ ہوتا ہے کہ وہ کبیر کی نہ ہوں۔ اور بعد میں کبیر کی طرف منسوب کر دی گئی ہوں۔ بات یہ ہے۔ کہ ہندی ادبیات میں ہم ہر قسم کی ابتری اور آشوب سے ملاقی ہوتے ہیں۔ قدما کے حالات اور ان کے سنین حیات و ممات سے ہندی ادیب اکثر بے خبر ہیں۔ اسی طرح اساتذہ کے اصلی اور غیر اصلی کلام کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ اب اسی کبیر کی طرف اسی پچاسی تالیفات منسوب ہیں۔ خدا جانے ان میں کتنی کبیر کی ہیں اور کتنی الحاقی ایسی طرح اپنے ادبی ذوق کی قدامت ثابت کرنے کی دھن میں وہ ہر دستاویز کو پرتھی راج اور اس کے جانشینوں کے عہد کی ماننے کے لئے تیار ہیں؛

میرا خیال ہے کہ کبیر کے بعد بھی کبیر کے نام پر برابر نظمیں لکھی جاتی رہی ہیں۔ کیونکہ بعض نظموں میں ایسی اشیا اور چیزوں کا ذکر آتا ہے۔ جو کبیر کے عہد میں رائج نہ تھیں۔ مثلاً۔ بندوق۔ تمباکو اور دوربین۔ بندوق اگرچہ دکن میں پہلے سے رائج تھی۔ لیکن ہندوستان میں بابر کے عہد تک بھی بہت کم معلوم تھی۔ اور عام استعمال میں ہرگز ہرگز نہ تھی۔ تمباکو ہندوستان میں اکبر کے عہد میں آئی ہے۔ اور دوربین تو گزشتہ صدی میں یورپی لائے ہیں۔ میں ان کی مثالیں ذیل میں عرض کرتا ہوں ؎

نیر تہک سے جو لٹے سو تو سنہ نہوے

بابا تیج بھگتی کمے سور کھائے سوے

(کبیر بیجناولی صـ۲۸)

دیگر :-

کب تار د بندوق چلایا   داس دیو کب نبب بجایا

(کبیر بیجناولی صـ۶۹)

دیگر :- ع

بھنگ نبا کو سلفا گانجا سو کھا کھوب اوڈایا رے

(کبیر بیجناولی صـ۱۴۵)

دیگر :-

تھرے دو ارے دو ربیں لگاوے انتے بوجھل یارا

(کبیر بیجناولی صـ۱۱۳)

شیخ بہاء الدین باجن متوفی ۹۱۲ھ

ملتصف آخر قرن نہم کے بزرگ ہیں۔ اور شیخ رحمت اللہ گجراتی بن مخدوم شیخ عزیز اللہ متوکل کے مرید ہیں۔ صاحب خزینۃ الاصفیا شیخ عزیز اللہ کے مرید بتاتے ہیں (صفحہ ۱۸۴) شیخ رحمت اللہ محمود بیگڑہ ۸۶۲ھ تا ۹۱۷ھ والی گجرات کے پیر ہیں۔ شیخ بہاء الدین کے والد کا نام معزالدین ہے۔ اور مزار برہان پور میں ہے۔ انکا بھائی میاں علیاں بھی شیخ رحمت اللہ ہی کے مرید تھے۔ سال وفات بقول تذکرۂ گلزار ابرار ۹۱۲ھ ہے کچھ مدت سیاحی بھی کی ہے۔ ادھر گجرات سے سندھ و خراسان تک گئے ادھر جزیرۂ سیلان تک پہنچے :۔

شیخ باجن ہندی و فارسی میں اشعار لکھتے تھے اور باجن تخلص کرتے تھے باجن کے معنی ہندی میں ساز کے ہیں۔ انھوں نے فارسی زبان میں ایک تصنیف اپنے پیر کے حالات اور مریدوں کی ہدایت میں لکھی ہے اور اس میں اپنے اشعار کثرت سے لائے ہیں۔ باجن پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو زبان کو "زبان دہلوی" کے نام سے یاد کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو ان ایام میں بھی برج بھاشا سے علیحدہ مانی جاتی تھی۔ آنکے ہاں صرف ایک نمونہ اس اردو کا ملتا ہے۔ میں اسکو اس سے پیشتر انہی صفحات میں نقل کر چکا ہوں۔ نمونہ کلام :۔

مناجات ؎

روزے دہر دہر نماز گذاری دہنی فرض زکوٰۃ بن فضل تیرے چھوٹک ناہیں آگیں کہیں بات

دوہرہ ؎

بھونرا ہوئے پھول رس بیا لیوے باس باجن ملے سینچے اس کر بھونرا کھڑا اداس

دوہرہ ؎

نہ نہ جنیا نہ وہ جایا نا وہ مائی باپ کھلایا باجن سہاد آپ نہ پایا یہ گت ہو پر آپ لگایا

دوہرہ ؎

باجن وہ کسی سر کہیا نہیں اوس سر کہیا نہیں کوئے جیسا کوئی من منہ چنت وسے ویسا ہی نہ ہوئے

دوہرہ ؎ باجن جو کسی کے عیب ڈہانکے اس تھے درجن تھر تھر کانپے
نعمت علی اس تھے پائی ہیں چیاں رکڈا انکھیاں جانکہائی

دوہرہ ؎ باجن بھکیاری بکھان کرے گا دیے اپنی بھیک کا رن کچہ کچہ کہیگا
جو کچھ قسمت میں ہے سو ہی لیگا گدکوں تو ہی بڑا ناہے گا

دیگر ؎ تھا سر در پر م کا رحمت اللہ بھریا باجن چھوڑ اوار کر سر آگین دہریا

عقدہ ؎ ایک آپیں جاگنہ لور ن بھی جگاوو نہ پھرے پھرے سبدہ سناو نہ
الک الک بیٹھی ہے چوکیاں جاگو لوکا جاتی رات

دوہرہ ؎ باجن کوئی نہ جانے وہ کد تھا او کد تھے یہ گت ہووا
وہی جانے آپ کوں جب تھے یہ گت ہووا

اصلی نام معلوم نہیں تخلص قطبن ہے اور بھاشا کے سر برآوردہ شاعر ہیں۔ انکے
متعلق میری اطلاع کا تنہا ماخذ ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی ۱۹۰۲ء کی رپورٹ ہے
جو سیام داس صاحب بی۔ اے آنریری سکرٹری سبھا مذکور نے تیار کی ہے۔ اور یو۔ پی
کی گورنمنٹ نے اپنے خرچ اور حکم سے چھپوائی ہے۔ سبھا کی یہ رپورٹیں جو صرف
ہندی مخطوطات سے تعلق رکھتی ہیں ۱۹۰۰ء سے شروع ہوئی ہیں۔ ابتدا میں سالانہ
رپورٹ شائع ہوتی رہی۔ بعد میں سہ سالہ رپورٹ کی شکل میں تبدیل کردی گئی۔ اور مسٹر
سیام داس ہی اڈیٹر ہے۔ یہ رپورٹیں اب تک مسلسل شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان رپورٹوں
نے ہندی قلمی ادبیات کی تلاش اودھ۔ بہار۔ اضلاع متحدہ۔ مالوہ۔ راجپوتانہ اور
بندیل کھنڈ وغیرہ میں جاری رکھ کر جہاں جہاں قلمی ذخائر کا سراغ لگا ان کی فہرست
اپنے ذیل میں شامل کرلی ہے۔ ان فہرستوں سے ہندی کے ذخیرہ پر ایک نہایت ہی
حیرت بخش روشنی پڑی ہے۔ اور سینکڑوں نادر اور نامعلوم کتابیں دریافت ہوئی ہیں۔
درحقیقت ناگری پرچارنی سبھا نے یہ ایک نہایت مفید کام ہے جو تکمیل کو پہنچایا ہے۔
طباعت کے مصارف گورنمنٹ صوبہ متحدہ نے برداشت کئے ہیں۔ ہم مسٹر سیام داس
کو ان کی محنت، ہمت، ذوق اور استقلال کامل پر جو انھوں نے ہمارے وطن کے مخطوطات

کے تحفظ میں دکھاتے ہیں۔ مبارک باد دیتے ہیں۔ اور دعا کرتے ہیں۔ کہ اردو کے میدان میں بھی خدا مسلمانوں کو یہی توفیق عطا فرماتے۔

ناگری پرچارنی سبھا کی تازہ دریافت کردہ کتابوں میں قطبن کی تصنیف مرگاوتی بھی شامل ہے۔ یہ ایک نظم ہے۔ جو محمد جائسی کی پدماوت کی طرح ایک عشقیہ افسانہ ہے۔ قصہ کا خاکہ مسٹر سیام داس نے اس طرح بیان کیا ہے:-

"راجہ گنپت دیو چندر گیری کے راجہ کا فرزند شہزادی مرگاوتی کے عشق میں مبتلا ہو کر صحرا نوردی اختیار کرتا ہے۔ یہ شہزادی کنچنگر کے راجہ روپا مرار کی دختر نیک اختر ہے۔ راج کنواری اور کمالات کے علاوہ فن پرواز سے بھی واقف ہے۔ شہزادہ بڑی اور مسلسل مصائب کی برداشت کے بعد شہزادی تک رسائی حاصل کرتا ہے اور بیاہ ہو جاتا ہے۔ بیاہ کے کچھ عرصہ کے بعد شہزادی یکا یک غائب ہو جاتی ہے۔ اور شہزادہ کو اس کی تلاش میں پھر بیابانوں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ وہ ایک دریا سے محصور پہاڑی پر پہنچتا ہے۔ اور ایک عورت کو جو کسی راکشس کی قید میں تھی۔ رہائی دلاتا ہے۔ اس عورت کا نام رکمن تھا۔ رکمن کا والد اس شکر گزاری میں رکمن کا بیاہ شہزادہ سے کر دیتا ہے چند روز کے بعد شہزادہ چھپ کر چل دیتا ہے۔ اور متواتر تکالیف اٹھانے کے بعد اسی شہر میں پہنچ جاتا ہے جہاں مرگاوتی اپنے باپ کی وفات کے بعد اس کی جانشین بنکر راج کر رہی ہے۔ میاں بیوی دوبارہ مل جاتے ہیں۔ اور شہزادہ حکومت میں شریک ہو جاتا ہے۔

دونوں بارہ سال تک نہایت راحت اور آسائش کے ساتھ حکومت کرتے ہیں۔
راجہ گنپت دیو اپنے فرزند کی لمبی جدائی کی تاب نہ لا کر اس کی تلاش میں آدمی روانہ کرتا ہے۔ جو رکمن کے شہر سے ہوتا ہوا کنچن نگر پہنچ جاتا ہے۔ اور راجہ کا ضروری پیغام شہزادہ کو پہنچا دیتا ہے۔ شہزادہ اپنی بیگم مرگاوتی و خدم و حشم سمیت روانہ ہوتا ہے۔ اور راستہ میں سے رکمن کو لیتا ہوا مع الخیر اپنے باپ کی راجدھانی میں پہنچ جاتا ہے۔ شہر میں اس کی آمد پر بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ اور شہزادہ کئی برس تک اپنی دونوں بیویوں کے ساتھ بڑے لطف سے زندگی بسر کرتا ہے ۔ ایک دن شہزادہ شکار کھیلنے گیا۔ اور اپنے ہاتھی سے گر کر فوت ہو گیا۔ اس کی وفادار بیویاں اس کی نعش کے ساتھ جل کر مر جاتی ہیں۔ اور قصہ ختم ہو جاتا ہے؛؛

مسٹر سیام داس کی نگاہوں میں اس کتاب کی اہمیت اس لئے بڑھ گئی ہے کہ ہندی ادبیات کا اکثر حصہ سری رامچندر اور سری کرشن کی مناقب آرائی پر وقف ہے۔ خال خال ایسے شاعر گذرے ہیں۔ جنھوں نے ملک محمد جایسی کی طرح عشقیہ افسانوں یا حکایات پر قلم اٹھایا ہے۔ قطبن اس سلسلہ کا غالباً پہلا ہندی شاعر ہے۔ جس نے جایسی سے بھی سینتیس سال قبل افسانہ نگاری کی بنیاد ڈالی ہے۔ مسٹر سیام داس کا بیان ہے "کہ قطبن کا سرپرست حسین شاہ شیر شاہ سور کا باپ ہے۔" اور حاشیہ میں اضافہ کرتے ہیں۔ کہ حسین شاہ بعد میں جونپور کا بادشاہ ہو گیا۔ جب ۱۴۷۶ء میں بہلول لودھی نے جونپور کا الحاق دہلی کے ساتھ کر دیا۔ حسین شاہ بہار میں جا کر ۱۴۹۴ء تک حکومت کرتا رہا

اس سال سکندر لودھی نے بہار پر حملہ کیا حسین شاہ کو شکست ہوئی اور بھاگ کر بنگال چلا گیا اور کچھ سال بعد وفات کر گیا"۔

یہاں مسٹر موصوف کو تھوڑا سا مغالطہ ہو گیا ہے وہ حسن سور شیر شاہ کے باپ جاگیر دار سہسرام اور سلطان حسین شرقی والی جونپور ۸۶۳ھ (۱۴۵۸ء) تا ۹۰۵ھ (۱۵۰۰ء) کو ایک ہی شخص فرض کر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ قطبن کا سرپرست نہ حسن سور ہے اور نہ حسین شاہ شرقی ہے اس لئے کہ مرگاوتی محرم ۹۰۹ھ (۱۵۰۴ء) کے پہلے منتصف میں تصنیف ہوتی ہے۔ اور حسین شاہ شرقی اس سے چار سال پیشتر یعنی ۹۰۵ھ (۱۵۰۰ء) میں فوت ہو جاتا ہے۔ حسین سور کو قطبن کا مربی ماننا بھی دور از کار ہے۔ اس لئے کہ دونوں کے نام مختلف ہیں یعنی مرگاوتی کا مصنف اپنے ممدوح کا نام حسین شاہ بتاتا ہے اور شیر شاہ کے باپ کا نام حسن ہے۔ جو ایک معمولی جاگیر دار تھا۔ میرے خیال میں قطبن کا سرپرست علاء الدین حسین شاہ والی بنگالہ ہوگا جس نے ۸۹۹ھ (۱۴۹۲ء) سے لے کر ۹۲۵ھ (۱۵۱۸ء) تک حکومت کی ہے۔ یہ بادشاہ ہندی اور بنگالی ادبیات کا ایک سرگرم سرپرست تھا۔

قطبن اپنے مرشد شیخ بڈھن کے ذکر میں کہتے ہیں ؎

شیخ بڈھن جگ سانچا پیرو ٭ نام لیت سدھ ہوئے سریرو
قطبن نام لئی پاد بہرے ٭ سر بدی دوہ جگ نہ مرے
پاچھلے پاپ دھوئے سب گئے ٭ جھڑیں پرانے اور سب نئے
نیکے بھیا آج اوتارا ٭ سب مہں بڑھو پیر ہمارا

جیہ کو بات دکھاتی ہووے پہنچے ایک نمک میں سووے

دوہرا :-

گروپنتھ دکھاوے وہی ہے جو چل جانے کو سوئے
نمک ایک میں پہنچے جو ست بھاوے سو ہوئے

اور حسین شاہ کے لئے کہتے ہیں :-

شاہ حسین آہے بڑ راجا چھتر سنگاسن ان کو چھاجا
پنڈت اوبدھ ونت سیانا پڑھے پوران ارتھ سب جانا
دھرم دود سٹل ان کو چھاجا ہم سر چاہ جیو جگ راجا
دان دے لوگنت نہ آوے بلی او کرن نہ سر بر پاوے
راے جہاں لوں گنئے رہیں سیلوا کریں یا سب جیہ میں

شیخ عبدالقدوس گنگوہی متوفی ۹۴۵ھ

آپ کے والد کا نام اسمٰعیل ہے اور یہ شیخ محمد بن شیخ عارف بن شیخ احمد عبدالحق چشتی صابری کے مرید ہیں۔ اور صاحب تصنیفات کثیرہ ہیں۔ از آنجملہ انوار العیون۔ رسالہ قدسیہ۔ رسالہ نور الہدیٰ۔ رسالہ قرۃ العین اور رشد نامہ ہیں۔ ان کے مکتوبات مولانا خضر بدہ بن رکن جونپوری نے جمع کئے ہیں۔ ۹۴۵ھ میں وفات پائی۔ وہ ہندی کے بلند مرتبہ شاعر ہیں۔ الکھ داس تخلص کرتے تھے۔ نمونہ کلام:۔

سر دو در پدہ پوربی ؎

دلھن کارن پی آپ سنوارا	بن دلھن سکھی کنت کنھارا
نہ کھیلے دلھن نہیں ایوان	پاس پھول منہ اچھے جیوان
کیوں نکھیلوں تیج سنگ پیتا	مجھ کارن تیں اپنا کینا ٹو
الکھ داس آکھے سن سوئی	سوئی پاک ان نہ پہن سوئی

شبد ؎

ایک تھیں ہم اننت بھیلی آپی آپ بیاہی	سبھنہ سبھنہ کینا سبھیدرا ناایام سر اجتوائی

دوہرہ ؎

ایک اکیلا آپ سو جس تھیں یہ سنسار	آنتہ نیا تتہ تھول سو سبھی ایک اکار

دوہرہ ؎

جدھر دیکھوں ہے سکھی دیکھوں اور نہ کوی دیکھا بوجھ بچار منہ سبھی آپیں ہوے
جیسو کنبہہ آنبہہ منو تیسو پنڈ بتائیں نرمیو باہر بھیتر کہاں جاے سرب نرنتر ایکی کاے
چت پانی ست ہت بھول اہنس پوجا اچھی بھول یو جواہیں رس لاو میسو بھیو سرب نرنتر آپیں دیو

شبد ؎

جل تھل مہیر اور اکاس پی سرب نرنتر تو سے پاس
نوہ چھاڈ یا لکہ کہداں جانوں جہہ رجانوں تنہ تو را ٹھانوں
باہر بھیتر کہا نہ جاسے سرب نرنتر ایکی کا سے
الکہ داس آکھے مور کنت دنہہ جگ سکھی رات بسنت

شبد ؎

جان اجان بسہہ کھیلنہ ہوئی بن پی کھیلے نہ کھیلا ہوئی
جان اجان جگ کھیلے سے ہو ہو ہو ہولی رے
بسہہ کھیلنہ سکھی مہہ جان ہو سرب نرنتر پی پہ دان
جان اجان جگ کھیلے بھاگ کنت بلیا لیوں ہر رستے لاگ
الکہ داس آکھے سن ناہاں ہم تم کھیلینہ دی گل ناہاں

دوہرہ ؎

دیکھوں ہی من پوچھوں ہی دیکھوں اونہاں ہی سبھی ننگ تیرکا بابا ننگ سبایا پانی

رہنسی کہوتنھ ناچوں سکھی پی جی رنگ چڑھایا   تن من جیو ایک رنگ دیکھا تو میں آپ گنوایا

عقدہ :-

الکھ واس اکھے سن لوے   دوئی دوئی کھومت بھائی کوئی
جل تھل مہیر سدب تر نتر   کو رکھ ناتھ اکیلا سوئی ہو

شلوک :-

اپا ناشت پرا ناشت ناشت کنجت جلکز ا
بدھ با چا منو ناشت نز دیوی اکل بتا ہو

شبد :-

پھلے نہ پھولے آوے نجاوے   کانسی کا سبد کانسی ہی سماوے
جل تھیں اپنا ملبلا جل ہیں ماتھ بلائے   تیسایہ بینسار سمجھ مو لنہ جلے ملے

دوہرہ :-

آپ گنوا ئیں پی ملے پی کھوئے سبھ جائے
اکتھ کتھا ہے پرم کی جے کوئی بوجھے مائے

شاہ علی محمد جیو گام دھنی گجراتی ؒ

سید احمد کبیر رفاعی کی اولاد میں ہیں۔ اور سید عبدالرحیم کے پوتے ہیں[1]۔ ۱۴ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۷۳ھ کو انتقال کیا۔ اور رائکھڑ میں متصل روضۂ شاہ عربی مدفون ہیں۔ ہندی کے شاعر ہیں۔ کتاب چشتیہ میں لکھا ہے۔ کہ جب مخدوم بہاء الدین برناوی خاتم التارکین بسبیل سیاحت گجرات تشریف لے گئے۔ شاہ علی جیو کے مہمان رہے۔ اس قیام کے زمانہ میں میزبان نے اپنا ہندی کلام جو عجیب و غریب اور پر لذت بحور میں لکھا تھا، سنایا۔ اور اپنا ایک رسالہ جو نکات و دقائق موحدانہ پر مشتمل تھا ہدیہ دیا:۔

شاہ علی جیو کے کلام کو ان کی زندگی میں اُن کے مرید شیخ حبیب اللہ ابن عبدالرحمٰن الفرشتی الاحمدی نے ایک مختصر دیباچہ کے ساتھ مدوّن کیا ہے۔ اور اس کا نام جواہر اسرار اللہ رکھا ہے۔ دیباچہ حسب ذیل ہے:۔

"میگوید بندۂ فقیر و حقیر کہ یکے از کمینہ مریداں و خاکروب حضرت رب العالمین
بندگی حضرت قطب الاقطاب العالم والآفاق تاج الافراد و سلطان العارفین

---

[1] نسخۂ الکرام میں سید عبدالرحیم کا پوتا لکھا ہے۔ لیکن حبیب اللہ شاہ عمر کا پوتا بیان کرتا ہے یہ ظاہر ہے کہ حبیب اللہ اپنے مرشد کے جد کے نام سے زیادہ صحیح اطلاع دے سکتا ہے۔

غوث الاعظم الشریف سلطان سید معشوق اللہ الحسینی الرفاعی رضی اللہ تعالےٰ
عنہ المسمیٰ بہ شیخ حبیب اللہ ابن عبد الرحمٰن قریشی الاحمدی کان اللہ لہ کہ چند مکاشفات
حضرت بندگی سید السادات سیدی و شیخی شیخ العالم الشریف المخاطب حضرت
اللہ تعالیٰ بخطاب سلطان العارفین و سلطان العالم الشریف شاہ علی جیو
معشوق اللہ مد ظلہٗ ابن شاہ ابراہیم ابن شاہ عمر الحسینی الاحمدی رضی اللہ عنہم
در بیان توحید و اسرار بالفاظ گوجری بطریق نظم فرمودہ بود دریں مختصر آوردہ
و جمع کردہ و آں ملفوظات حضرت سلطان العالم شاہ علی محمد معشوق اللہ اند
جواہر اسرار اللہ را بکتاب جواہر اسرار اللہ نام داشتہ ؛؛

جواہر اسرار اللہ کی یہ پہلی اشاعت ہے جس کا ایک نسخہ دیوان عطار (مملوکہ
پروفیسر سراج الدین آذر۔ ایم۔ اے) کے حاشیہ پر مرقوم ہے یہ نسخہ گیارھویں صدی
کی ابتدا کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی دوسری اشاعت شاہ علی جیو کے پوتے سید
ابراہیم بن شاہ مصطفےٰ ابن شاہ علی جیو نے مرتب کی ہے۔ اس اشاعت کا ایک نسخہ
نوشتہ ۱۱۲۷ھ میرے پاس ہے۔ سید ابراہیم اپنے دیباچہ میں حبیب اللہ کی اشاعت
کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس کا نام بو الحسن شیخ محمد ابن عبد الرحمٰن القریشی الاحمدی لکھتے
ہیں اور اس کا ایک فارسی قصیدہ بھی جو شاہ علی جیو کی مدح میں ہے۔ نقل کرتے ہیں؛؛

یہاں شاہ علی جیو کے کلام کا نمونہ دیا جاتا ہے :۔

نکتۂ اوّل در مکاشفہ ؎

اپنے بھاؤ جو لبا یا لوسے   سو کیوں بھیس گھو بھی چھورے

نکتۂ دوم سے

تو کھنڈ ہو جے اسمۂ ہے   سب پو جہت تھیں جھنا ہولہے
ہونتوں دو نون نا نواسی کے   آہیں اسے سب بھیس جسی کے

نکتۂ سوم سے

مرگ اجھر ہور مندر مارے   ہور جے اس منہ ندیاں بارے
مانک موتی سگھ سنگارا   اَسے سب بھیس پیا کا سارا

نکتۂ چہارم سے

کبھیں سو لباوے بھیس اکاسا   ہو کر چند آتا رے باسا
دیہ الالا تیج بکھیرے تو   روپ انپڑے اپیں ہیرے

نکتۂ پنجم سے

کبھیں سو ہوئے اندھیاری رتا   سانجہ بتی کر لاوے دھانا
ہو کر دیوار راتیں ساری   لاکر جوت دکھاوے بھاری

نکتۂ ششم سے

مکھ پر مال بکھیر سو ساتھی   چھپ کر ہوئے مانت سنگاتی
دلی سنبھال سو بکھیرے کیسا   دن ہو آوے سورج بھیسا

نکتۂ ہفتم سے

ان بھردلی کھیلے میرے   بھیس کیتے ہیں میرے تیرے
پرکھ نار ہو آہیں آیا ہو   دیکھو بھیس اوناری لیا یا ہو

نکتۂ ہشتم ــ

کھیل جد جیا بھروپا کھیلے ہو   ہنس تل بھی کھیل نہ میلے
آہیں ناچے آہیں گاوے   آہیں آپس بھاو دکھاوے

نکتۂ نہم ــ

کبھیں تیج بھر ابھیس لیاوے   دھرتی ہو کر آپ بچھاوے
کر پریت ہو بھاری بلیے   سرماں ہو کر نینوں بیسے ہو

نکتۂ دہم ــ

ایک سمندر وہ سات کہاوے   دھنوس بادل مینہ ہو آوے
وہی سمندر کہ بوند دکھاوے   ندیاں نالے ہو کر جاوے

نکتۂ یازدہم ــ

کبھیں سو مینہاں ہو جھڑ لاوے   کبھیں پیوتی اوڑے نہاوے
کاج بچ ہنس آہیں کھیلے   نار پرکھ ہو وہی سو جھیلے

مکاشفہ ــ

جاوا اٹھیا اس میرے سائیں کی ہوں جگ بھیس ہو اول   کہیں سو زن جا کہیں سو پر جا کہیں سو بند اپ کہاؤں

نکتہ ــ

کہیں سو عاشق ہو کر راتوں کہیں عارف ہو نے پچھانوں کہیں موحد کہیں محقق کہیں سو جانوں کہیں نجانوں

نکتہ سے بھیس بندوں کے کروں سو بندگی اودہا ہو ہو نماز گذاروں

ہوں حاجی ہوں کعبا ہوں آہیں آپس او پر واروں

نکتہ سے

ہمیے بندے ہو رہے تیاں یوں آہیں آپ کہا سوں فرض کیتاں یہ باتاں تم پر پیار کروں گا کرسیں سوں

نکتہ سے

بھاو نماز جب لیاؤں گیر الھلیں تن یوں آپ سنواروں وضو غسل کرانھوں کبر زیبا کیرے بھر سنگاروں

نکتہ سے

ستر عورت کر کا جھوں آپس یہ سنگاروں ساز ملاوں کعبا ہو کر آپ دکھاؤں سجلے کر کر ٹکے لاسوں

نکتہ سے

آج سو تیوں بھیس کتے ہیں علم قدیم میں جیوں تھے گور ہے فرض نماز آپس پر کیتی تس منہ تیرہ فرض سو جو رہے

نکتہ سے

اسمنہ بھلا ساز جو اسی سبھے شرطاں جانیں پیارا حدث خبث تھیں ہیلوں ہاری تن پاک کر یجا سارا

نکتہ سے

دوجی فریضہ اپنے کپڑے پاک نمازی چھنے تو تیجی شرط سو تھاں پاک جیتے دہنے قدم تقدر رہنے

نکتہ سے

بچسے کی بھی جو سے بھایو بکری پاک سو تھانہاں سو کیوں چوکی تھام کیجے سیس نمانے جاں سو نہاں

نکتہ ـــ

چوتھی شرط سو سنر عورتاں کی پن تو تسمہ نکٹ شادانہیں   مرد میں کوں تن ڈھنپیا لوٹے دو تیئے ٹھیں پل کھونیں ملتیں

نکتہ ـــ

مجسے بیبیاں ہور اصیلاں ان تن سار ڈھانپیا ہوتی   دے نذراییں مکھ ہور پاتواں عورتاں بیبیاں جمال ملک ہوئی

نکتہ ـــ

مرد و نکاحے سنر عورت باندیوں کا بھی جانیں تیویں   پن ان ٹنیاں ڈھانپیں انگلیٹ ہور پیٹھ نہ دیکھی جیویں

نکتہ ـــ   اصیل عورت کے تن تکرے جیر کینہیں عورت ماہال

چوتھا بھاگ کہلے جو تسمہ بھلیں ڈلپنے جے اس تھانہال

آگے زمانہ کی ہدایتیں ہیں ہیں اسی پر اکتفا کرتا ہوں شاہ علی جیو نے ایک اوجھ مقام پر خاص بحر میں طبع آزمائی کی ہے۔ بحر ہزج مربع سالم :۔

مکاشفہ در عقدہ ـــ

بچاری ہور ٹکی کھادو   دور تھی آپ کوں کادمو

نکتۂ اول ـــ

پرم رنگ جیو جن ماہاں   سو دیکھیں نہ سب تھانہاں   تنہوں من لوک ہے کا نہال

نکتۂ دوم ـــ

لوکاں کی بھوک کوں بوجھو   گسائیں سلاح ان سو جھو   پرم کی بات کچھ بوجھو

نکتۂ سوم ـــ

جو جیوڑا پیو سوں لاگا ہے جس نیہ کی اگا تنہوں کا لوجہ سب بھاگا

نکتۂ چہارم ہے

جو لوئیں نہ بھریں ناکہیں رونیں ہور دوکھ سکہ جاکہیں تنہوں اے نا چتے اکہیں

نکتۂ پنجم ہے

بنو بول کچھ کا چوٹا جو لاگے پیار تم سا چو تنہ بھی اینوں ہیں ناچو

نکتۂ ششم ہے

جنہوں من پرم کا بھٹکا تلیں تل نیہ کا کھٹکا سو جانے مرم کا ٹکا

نکتۂ ہفتم ہے

انکھوں کی سیج تر بس بس ہساوے پیو انہس ہس مرے تب سوک ہانو کھس کھس

نکتۂ ہشتم ہے

الٹی انکھ کھیں لاگے سو تا یہ جیوڑا جاگے جو انکا بوگہ پن بھاگے

نکتۂ نہم ہے

پر کیہی نادہ پڑاویں سو سنتیں اپ کھو جاویں سو بیدہ بے بان بندہ ہواویں

نکتۂ دہم ہے

جو یا نا پیو سنبرا وے پیا سوں پیار بڈہ ہواوے پراتس کینو کہواوے

نکتۂ یازدہم ہے

جو اپنے کتنے بسراوے پراتس انکھیا جاوے بہلا سو پیو دکھلاوے

نکتۂ دوازدہم ہے

ڈھوں جگ مانہہ ہے کاجے سارہں ستر ناچ جے راجے سینں تن گیت سنہ باجے

نکتۂ سیزدہم سے

جو بولیں لوگ بہترے کھلے ہیں کان جن کیرے نے سب سادہ پیو میرے

نکتۂ چہاردہم سے

باجوں سب مانہ وہ بولی ناسوں اور بانس پر وو بلی پوچھیں جن جیو پیو کھولی

نکتۂ پانزدہم سے

بجنتر مانہ کونا نہیں کرے سب سادہ وہ سائیں بنو بول ہب کائیں

نکتۂ شانزدہم سے

جو گاویں گیت بہ نانوں سنیں لے پیو کے کانوں سہی کر بات تم جانوں

نکتۂ ہفدہم سے

ہمارے لوگ اَے سارے دیکھیں جب جیو کے پیارے نہ ما بہ جا تو ہیں وارے

نکتۂ ہژدہم سے

نبی کی نین ات ماتی سلونی اور رنگ راتی کھلیں دے پیو دکھلاتی

نکتۂ نوزدہم سے

جھنڈا ہا آج ہیں دیتہا سو رہے پاؤ تک بیٹھا دھریا نہ ہاتہ منجہ پیٹھا ر

نکتۂ بیستم سے جو ایسے پیو کوں پاویں انھیں ہور بھیر گل لاویں پھریں ہور واریں جاویں

نکتۂ تخلص سے سو ہگن لٹکتا آوے لٹک گل بانہ جب پا ہوے

علی تب جانپ گل لاوے

شیخ خوب محمد چشتیؒ

گجرات کے رہنے والے ہیں۔ اور شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید ہیں ۹۸۶ھ میں تصوف کی ایک مثنوی خوب ترنگ نامی تصنیف کی۔ اور ۱۰۰۱ھ میں اس کی شرح بزبان فارسی لکھی۔ شرح کا نام امواج خوبی ہے۔ خوب ترنگ کی تاریخ تصنیف شعر ذیل کے دونوں مصرعوں سے الگ الگ برآمد ہوتی ہے۔ بلکہ دوسرے مصرعے سے دوہری تاریخیں نکلتی ہیں:-

خوب محمدؐ کئے سنچار　　　جو دو گھاٹا دس برس ہزار

اور شرح کی تاریخ اس شعر میں بیان کی ہے:- ؎

عدد شمار ز تاریخ شرح نعت محمدؐ　　　ہزار سال مکمل ز فکر خوب محمد

دیباچہ میں کہتے ہیں ؎

خوب کھیگا خوب ترنگ سنیتیں کچھو نہ کیو بنگ　　　یوں الکار نہ کیجو دیکھ جانو تل تج یوں من لیکھ
کے یہ تو کہتا ہے خوب　　　دیکھو کے کہتا ہے خوب　　　پڑھتے جو چیو کردا و قرآن تو اس کوں کھیوٹ نہ ان
منت تجیں ہے چھو کردلو　　　الکا کہ پوچھے بہ ربلو　　　جو یتقدر کنیں نہیں پاتے جو ہر تو کیا بھناں لکھا ہے
یہ تو جان بنا یچ نہووے　　　جے مقصود نجھے یوں کوے　　　یہ تو کہیا فلانے یار　　　ایسا بوجھ کہے الکار
جتناں طالب گوں بس ہوئے　　　میں اس ماز کھیلا ہے سوے　　　جیوں دل عرب عجم کی بات　　　سن بدلے بولی گجرات

تیوں سمجھاں ہو بلبیل ڈال کسوں وند تھیں حل مشکل یں مرشد تھیں سنیاں ہیاں جیسے مرشد صاحب عرفان

جنہو منجھے سکھلایا دین کو جن تھیں منجہ دل ہوا یقین جیلانی بسطامی شاہ بغدادی جس چتر کلاہ

ہر ماضی پر حجت بیک ہوں معتقد ہوا ان ریک داشت محمدی ہر ٹھانوں شیخ کمال محمد نانوں

کیا عروج مقام اقدم اللّٰہم اغفر وارحم اون کوں تھا یہ علم کمال خذ العلم افواہ رجال

اون تھیں ہیں سنیا دن رات اوس منہ یاد ہے کچھ بات وہ جیوں منجکوں آئی زنگ جمع کئے یہ نقش دہنگ

خوب ترنگ اس دیا خطاب مدح رسول اللہ بات یا اللہ لیے مدح رسول اوسی دوستی کر قبول

جیوں یہ ری بول منہ بات خوب ترنگ ایک سنگھات تیوں ہی کہو لگاکیں تجھو اپا بول کیا نہیں جھوٹ

اینہاں شعر کا قصد نہ لیکھ اینہاں مرتب کوں سو دیکھ ارض سما منجہ نہ سمائے ونین شعر نڈرے کیوں آئے

نعت میں کرتا ہوں میر یا اللہ تم باخبیر غلط نہ کریں ہوں جان ورس کہیں بچے ہیں اوں

جو کچھ خطا اس منہ تو پائے اسے سبھی کر بائے خدائے بن انساں کہوں گو دیکھا ہے مت ان تجھ بول پڑے

نسخہ کی تاریخ اس تھانہ پائے علاوہ ہر مصرے ماں خوب محمد کئے بچار چودہ گھاٹ نو سن ہزار

دو جا چاند جو تھا شعبان دیس دوشنبہ کیا بیان

شیخ خوب محمد اس زبان کو عربی و فارسی آمیز گجراتی کہتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ اردو ہے اگرچہ اس میں گجراتی زبان کا بھی پتہ تو موجود ہے۔ گجری بھی اسی کا نام ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب رسالہ اردو حصہ بیست و ہفتم ص ۱۴۸ میں رقمطراز ہیں :-

جب یہی زبان دکن میں آئی اور اس میں دکنی لفظ اور لہجہ داخل ہوا۔ تو دکنی کہلائی اور گجرات میں پہنچی تو اس خصوصیت کی وجہ سے گجری اور گجراتی کہی جانے لگی۔ شاہ برہان صاحب جانم متوفی ۹۹۰ھ نے اپنے کلام میں کئی جگہ اپنی زبان کو گجری کہا ہے۔ مثلاً وہ کتاب حجت البقا میں فرماتے ہیں ؎

"جے ہوویں گیان بچاری نہ دیکھیں بھاکا گجری"

"یعنی جو صاحب عرفان ہیں وہ گجری (گجراتی) زبان کا خیال نہ کریں گے"۔

فارسی و عربی الفاظ ان کے زمانہ سے پیشتر مقامی لہجہ اختیار کر چکے تھے اس لیے وہ ان کو مروجہ لہجہ میں لکھ جاتے ہیں۔ مثلاً اوپر کے اقتباس میں مصرع کو مصرے، نسخہ کو نسخا، درست کو درس رقم کیا ہے۔

احمد دکنی

اردو ادب کی تاریخ میں محمد قلی قطب شاہ ۹۸۸ھ و ۱۰۲۰ھ کا نام سنہری حرفوں میں لکھا جانا چاہیئے۔ وہ خود اردو اور فارسی کا زبردست شاعر تھا۔ اس کے ضخیم کلیات پر جو اٹھارہ سو صفحات پر شامل ہے ۱۹۲۲ء میں مولوی عبدالحق صاحب نے رسالۂ اردو بابت ماہ جنوری میں ایک پُرمغز اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے۔ علوم کی سرپرستی میں جس قدر حصہ اس بادشاہ نے لیا ہے ابھی ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس کے عہد کے ذہنی کارناموں کی تاریخ ابھی تک مدون نہیں ہوئی ہے۔ اختیارات قطب شاہی جو اختیارات بدیعی (ایک طبی تصنیف) کی ضخیم تنقید ہے۔ اسی بادشاہ کے حکم سے اطبا کی ایک جماعت نے تالیف کی ہے۔ جس کا اصل نسخہ راقم کے مجموعۂ کتب کے نوادرات میں سے ہے۔

احمد دکنی اسی بادشاہ کے دربار کا شاعر ہے۔ اور اس کے حکم سے اپنی تصنیف لیلیٰ مجنوں لکھتا ہے۔ احمد کے حالات زندگی سے ہم بے خبر ہیں۔ میرے مہربان اور مخدوم پروفیسر سید عبدالقادر، ایم۔ اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کی وساطت سے احمد کی لیلیٰ مجنوں کے چند اجزا مجھ تک پہنچے ہیں جن میں کل ۹۴ منتشر اوراق ہیں۔ باقی کتاب کا اکثر حصہ غائب ہے۔ ان میں چودہ تصاویر اکبری دبستان کے طرز میں موجود ہیں۔

بلکن اکثر شکستہ و خستہ۔ یہ مثنوی خطِ نسخ میں لکھی گئی ہے۔ اسکی تقطیع ۵½ × ۹ ہے فی صفحہ گیارہ اشعار جلی قلم میں مرقوم ہیں۔ رسم الخط میں بعض مقامی خصوصیات مشاہدہ میں آتی ہیں جو زیادہ تر ہندی اصوات کے اظہار کے لئے وضع ہوئی ہیں؛ چنانچہ جیم فارسی رائے ہندی اور دال ہندی اور بائے فارسی کے نیچے بالعموم تین نقطے دیئے ہیں۔ ٹائے ہندی پر چار نقاط اور کاف فارسی کے نیچے (بعض اوقات) تین نقاط دیئے گئے ہیں:۔

احمد سبب تالیف میں کہتا ہے:۔

جو منج بخت کوں فتح یاور ہؤا — سو منج بخت کا سیلوک انبر ہؤا
جو شہ آپ تھے آپ منج یاد کر — منجے غم کی بندگی تے آزاد کر
دیتے امر مجکے یو بارغ لاؤں — جو باوں لسے امریت نانوں
جو میں شہ کا امر سر پر لیتا — تدن باغ لاتے شتابی کیتا
بہوتیک پریشانی روزگار — اگرچہ منجے ہے ملامت سو بار
بہوتیک شغلاں ستیں رات دن — نتھی منج فرصت بلک یک بن
دلے اس دہر شہ کے فرمان پر — لگیا تن سنگارن بہو قصہ دہر
دہریں عشق کی باس اس بن کے پھول — جو اس باس پر جوں بھنور جگ کوں بھول
سو کچ عشق کوں اب جگت میں جگاؤں — جو گھر گھر تے لیلیٰ و مجنوں اچاؤں
جو لیلیٰ و مجنوں تھے بولوں پران — سو تازہ کروں اب انو کا پران
جو اس بن چمن پر تھے گندے پون — یوں باس نئے باس تے سرک بن

جو اس باغ پر شہ کا داغ ہے ما | سو باغوں میں یہ باغ شہ باغ ہے
دہنی باغ کا شہ ہیں باغباں | بھنور باغ کا کیوں نہ ہوئی سماں
جو اس باغ مہکار تھے جگ بھرے | سو سرمست کر قدسیاں کوں دہرے
سو کچ شہ کوں یہ بن مبارک رہو | جو اس بن تھے ہر روز نو روز ہو
شہنشہ کے ارکان دولت جیکوی | مبارک انو پر بھی یہ باغ ہوی
جکوئی باغ کی باغبانی کرے | سو اس باغ تھے شادمانی کرے
دہنی باغ کا باغباں کوں نواز | بہو مرحمت سوں کرے سرافراز
جو احمد کرے آس دہرین سنگار | سو اب شہ تھے پاے بنیں سنگار

مثنوی کے افتتاحیہ ابیات یہ ہیں :-

اس اللہ کے ناؤں سوں سب جگت | جو دائی دیا دنت اس کی صفت
سربا نا سب اللہ کوں جسم قرار | جو جگ کا دہنی ہور پروردگار
جو دنیا میں کافر مسلمان کوں | منگے من سو بخشے بہو مان سوں

شاعر نے حمد کے بعد تین مناجاتیں لکھی ہیں، میں دوسری مناجات سے کچھ اشعار حوالۂ قلم کرتا ہوں :-

جیچی سوں رحمت کرے سو رحیم | کریمی کے سب گن دہرے سو کریم
سبہ کچہ کوں بھر دے سو رحمت دہرے | سبہ جگ کوں اپڑے سو نعمت دہرے
پہلے ہور بڈے پہ کرم راکھتا | برائی چھپا کر بھرم راکھتا

گنہگار کے پاپ بھنجن کرے — گنہ بخش بخشش سوں پرس کرے
نہ وہ کچھ کسی دا ہاتھ حاجت دھرے — جو عالم سب اس کی عبادت کرے
دے سب جگہت کوں ہدایت دکھائے — کرم ساتھ اپنے عبادت سکھائے
عبادت سے آپیں تو ہے بے نیاز — سو ہوئے جن عبادت کرے گداز

کرے ایک نیکی تو دے دس ثواب
جو توڑے نیاز تہ ہے شے بے حساب

مصرع "جو عالم سب اس کی عبادت کرے" میں "جو" کاف بیانیہ کا قائم مقام ہے۔ پنجابی اور دکنی میں بالعموم آتا ہے۔ مثلاً عبدالحکیم پنجابی کہتے ہیں ؎

کہ بیچارہ اب یوں کرکے فریاد — جو یارب بھائیاں دی دیکھ بیداد

دیگر ؎

کہا یعقوب جو فرزند میرا — نساں کھاوا اچھڈو بھگڑا نئے جھڑا

اسی لیلےٰ مجنوں میں احمد ایک اور مقام پر کہتا ہے:- ؎

جو پانی سیتیں جیوتی سب جگت
جو طوفاں ہوئے سب جگت جائے گت

اسی طرح یہ شعر ؎

بولا یا لکھن ہار سکیاں کوں
جو لکھے کتابت بھوگیاں سوں

لیکن کاف بیانیہ اردو میں قدیم سے ہے۔ پرانے مصنف اس کو بشکل "کے" لکھتے ہیں۔ مثلاً شاہ علی جیوگام دھنی ؎

بے حد ثابت ہوئی جو ہے ہے اس منہ جگ بھی حد بجو رے
کے وہ لطف سب لطف تھے ہے بحر نہ آدے فہم نہ ہو رے

بعد میں فارسی املا اختیار کر لیا گیا۔ چنانچہ یہی احمد گویا ہے ؎

بھو عجز سوں آس احمد دھرے
کہ سائیں دکھنت بجز رحمت کہے

فارسی اردو سے ہندوستان کی اکثر زبانوں ہندی گجراتی وغیرہ میں لے لیا گیا ہے۔ کاف بیانیہ کی سرگذشت کا ایک دلچسپ پہلو وہ ہے جب کہ بمبئی کے فاضلوں کے ایک دبستان نے اسے سنسکرت کے ماخذ سے استخراج کرنے کی کوشش کی تھی۔

شیخ عثمان

غازی پور کے رہنے والے ہیں۔ والد کا نام شیخ حسن تھا۔ اور جہانگیر کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے چترا ولی نام کا ایک عشقیہ قصہ بزبان ہندی لکھا ہے جو دوہوں اور چوپائیوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ اور تصنیفات بھی کیں چترا ولی ایک نہایت دلچسپ تصنیف ہے۔ اور اسی پر ان کی شہرت قائم ہے۔ اس تالیف کے زوردار حصے وہ ہیں۔ جو چترا ولی کے محل اس کے حسن و جمال بیان ہجر اور بارہ ماسہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شہزادہ کی تلاش میں مصنف نے جہاں مختلف ممالک اسلامیہ کا ذکر کیا ہے۔ اس میں انگریزوں کی طرف بھی ایک تلمیح ملتی ہے۔ جو ہندوستانی ادب میں بقول مصنف کا منا کومیدی سب سے پہلی ہے۔ البسٹ انڈیا کمپنی شہر سورت میں اپنی کوٹھی ۱۶۱۲ء میں قائم کرتی ہے اور ۱۶۱۳ء کی یہ تلمیح ہم کو مل جاتی ہے۔

ذیل میں چترا ولی کے اس حصہ سے جس کا عنوان "کنور ڈھونڈھن کھنڈ" ہے۔ بعض اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:- ؎

جن پچھوں دس کنہ بیانا پچھیں کا سو دیس ملتانا
سو دیکھے سی سنگھی لوگ سبائیں مہیرا دن سب سلو ہیں سائیں

ہیرے سی ٹھٹھ نگر سو ہا وا تا   بھنگ ہرن سیلویں گنجاوا

کابل ہیبری موگل کر دیا   جہاں پوہم پتی ہوئی نریسا

دیکھے سی روم سکندر گیرا   سیام رہا ہوتی سگل اندھیرا

دیکھے سی مکہ دوہی استھانا   ہٹی اندھ تیں پا ہن جانا

حاجی سنگ ملی یکھو مدینہ   کا بھاگیۓ جو صاف نہ سینہ

گا بغداد پیر کے تیرا   جیھی نیچے تیہی سنگ ہمیرا (ابیرا)

استنبول، مصر، پونی ہیرا   کالداخ لہو کنہوسی پھیرا

دکھن ویں کرہے پگو دہارا   چلاتا کی سو لنک بھارا

پھیلے ہی گے ہیر سس گھراتا   سندرہ بنی لوگ سو کھ راتا

بیگو جام جھن کھیتی ہوئی ٹھ   اگ سروپ سوکھی سبھ کوئی

بلندیپ دیکھا انگم یہ ا   جہاں جاۓ نہیں کٹھن کریجا

ادنچ نیچ دہن پیغنت رہیرا   مدبراہ بھوجن جن گیرا

جہاں جاتی ادہن بند رساجا

دگا منگ چڈھی گیو جھاجا

شیخ بہاء الدین برناوی خاتم التارکین

آپ مخدوم شیخ فرید الدین برناوی مہاجر مکہ متوفی ۹۸۷ھ کے پوتے اور جانشین ہیں۔ مسلمانانِ ہندوستان میں صرف دو شخص فن موسیقی میں یگانۂ روزگار مانے گئے ہیں۔ امیر خسرو اور مخدوم بہاء الدین۔ امیر اس کا دیباچہ ہیں۔ اور مخدوم اس کا تمتہ ہیں۔ مخدوم کے حالات اب تک گوشۂ گمنامی میں رہے ہیں۔ حقیر اللہ نے راگ درپن میں البتہ ان کا مذکور کیا ہے۔ میری اطلاع کا ماخذ کتاب چشتیہ ہے۔ جو مخدوم علاء الدین ثانی کی یادگار ہے۔ چنانچہ یہ چند سطور اسی سے ماخوذ ہیں:۔

"قاضی عارف برناوی نے حرف شناسی اور ہجا خوانی کرائی۔ ملا نور رہتکی سے کتابی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں شیخ الہداد پانی پتی آپ کے معلم تھے۔ میراں سید عبد الشکور سے تیمناً شرح عقائد پڑھی۔ اسی زمانہ میں ایک عربی قصیدہ لکھ کر استاد کی خدمت میں پیش کیا۔ تحصیل علمی کے بعد ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ نماز صبح کے بعد شکار کے بہانہ سے جنگلوں میں نکل جاتے اور تیس تیس کوس جنگلوں میں پھر لیتے۔ ابتدا ہی تیر سے شکار کھیلتے تھے۔ بعد میں بندوق اختیار کر لی۔ ان نواح میں آپ ہی پہلے شخص ہیں جس نے بندوق سے شکار کھیلنا اختیار کیا۔ شکار پر کارہ بے حد پسند تھا۔

جدامجد کے مکہ معظمہ جانے کے بعد تمام دنیاوی اشیاء مثلاً جاگیر و قریات۔
انعامات و وظائف۔ اثاث البیت۔ اجناس و متاع۔ ہتھیار۔ مویشی۔ گھوڑے
وغیرہ کو ترک کر دیا۔ اسی بنا پر آپ خاتم التارکین کہلائے۔ سیر و سفر کے بے حد
شائق تھے۔ دکن۔ گجرات۔ کنبھایت۔ جونپور۔ پٹنہ بہار۔ پنڈوہ۔ سرہند۔
لاہور۔ پٹن۔ اجودھن۔ ہانسی و حصار وغیرہ وغیرہ کی سیاحت کی۔ ہند کے
ہر بڑے شہر میں ان کے دوست و احباب موجود تھے۔ اکبری و جہانگیری
امراء سے رسم و راہ تھی۔ ان دونوں سلطانوں سے ملاقات کی ہے۔ موسیقی
کے ساتھ ان کا تعلق عشق کی حد تک تھا جکری۔ خیال اور چٹکلا۔ قول و ترانہ
سادرہ۔ دھرپد۔ بشن پد وغیرہ میں انھوں نے اشعار لکھے ہیں۔ یوں تو تینوں
زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ لیکن ہندی میں اکثر لکھتے تھے۔ ساز خیال و ساز
کہٹرس کے موجد ہیں۔ انھوں نے گمنام رہنا پسند کیا۔ اسی لیے کوئی تخلص اختیار
نہیں کیا۔ چنانچہ ان کا کلام دوسروں کے نام سے مشہور ہو گیا۔
یہاں بعض نمونے کتاب چشتیہ سے لے کر ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں:۔
برائے بارش:۔

کاہے نے بدرا ناں برست کاہے تھی ناہن گرجت کاہے ناں جھڑ لاوت
کاہے تھی برکھا نت تیوت برمن من چھوت کاہے تھی ناں گھونگھو ستاوت
چتر دساتیر دیجے آنا ہو داتا میکھ کہاوت   گربن نیاکو تا جم گت تمیں لول بلی لے آوت

دیگر ؎

ان نینن کا یہی بسیکھ ہوں نہ دیکھوں توں منجہ دیکھ

خیال ؎

کیسیں کی سمرن توہ من چنچل نوکہوں کھو دلی اود یک یک باد کرت ہے بابہے کاج بنولی ہے

آنک للادی لکھی تو ٹیٹی جیتی دیک کا تنہو کو کھولی جے اسنہر کیسے بدہان کی سرا کلو لی

(ساورہ) جہانگیر اور خرم کی جنگ کے وقت کہا ؎

اَے اُسے بھائی جنیا مصاف ساہی تاج جس رہی تو ملا نت نت راج

خیال برائے شفا ؎

ٹھاکر گرو گجہ چیت نہ دہری جنہوں ان پہ اودہ اپرادہی گہ

مہاچھیں روگی کی بیدلن اپنی مہا چھیں کہن میں بیرے

خواجہ خضر کے لیے ؎

دائم حیات کائم کرامات ملاکات نعمت پاؤنہم ہو

ندی نیر ڈرم بھاری بہیر میہر تنامریت ہونہیا تہیا تم پیرم

رحم کیجے کرپا تمہیں دیجے کا کموں زاوری سہم ہو

تم کہواجہ کہمد روت خضر الیاس دو دیاس یاجگت میں اگم

برائے طلب لقائے سلطان الاولیا ؎

کاری کاج نماری بہوں تھکت بھیو کر بھیرہ آج بھاگ جاگ ٹرے بہا بہے کس دس بادٹ تیرہ

اندرے اندرجھا ہو دکھ سیہ مو شش گیو سو ہرو   تریت بھی تبت سب ناسی و لیا جرن الک ملتھو ہرو

بانس بند ہونے کے لیئے ؎

زب من نیہوری بدرنیلی بھانت جُرجُرآ بہو   نکی میں گھاٹی اتو نیکھیں گرج سنایو

نیکھیں نیکھیں بین توہنس ہنس جھڑ لایو

ان کے دوست داس گھنداس بیراگی نے اپنی وفات کے وقت شیخ کی

خدمت میں ذیل کا پد بھجوایا تھا ؎

دے من نام پائیں مائیں جھیں دکھ سکہ بھائے   برج کیھو کو سیٹو سو دیکھنت جائے رہے یہ جائے

جے بجن ست کیں کی ہے تی میں کہی سنائے

داس گھنوں جیوں جل ترنگن جل میں جل جو سمائے

مولانا محمد افضل جھنجانوی یا پانی پتی ؒ

میرٹھ کے قریب جھنجانہ یا جھنجھنہ ایک پُرانی بستی ہے۔ عہد ماضی میں ایک مردم خیز قصبہ تھا۔ اور بعض مشاہیر وہاں سے پیدا ہوئے ہیں۔ شیخ عبدالرزاق اور شیخ عبدالقادر متوفی سنہ ۹۴۲ھ جو مشہور اہل اللہ ہیں۔ اس بستی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور شیخ صوفی دانشمند جنھوں نے علوم ہندیہ تحصیل کرکے اُن کے تراجم اکبر کے لئے فارسی زبان میں کیے۔ اسی قصبہ کی گود میں پلے ہیں۔ محمد افضل کا شمار اسی سرزمین کے فنہالوں میں کیا جاتا ہے :۔

ہم اُن کے حالات سے قطعاً تاریکی میں ہیں بس اسی قدر جانتے ہیں۔ کہ ایک دوازدہ ماسہ یا بکٹ قصہ کے اردو میں مصنف ہیں۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں :۔

محمد افضل، افضل تخلص، از قدیم است کہ ام ہندو بچہ گوپال نام بود کہ برو عاشق شدہ حسب حال خود بارہ ماسہ عرف بکٹ کہانی گفتہ کہ اکثر کمترزیاں و گاینان مشتاق ادمی باشند نصفے فارسی و نصفے ہندی دارد۔ لیکن قبولیت دادِ الٰہی است بہ دلہا اثر میکند از دست :۔

پڑی ہے گل میں میرے ہیم پھانسی ۔۔۔ مرن اپنا ہے اور لوگوں کی ہانسی

معاف ہے جنھوں نے دل لگایا ؎ انھوں نے سب جنم رونے گنوایا

اُن کے زمانہ کی نسبت اسپرنگر نے اپنی فہرست میں محمد قائم چاندپوری کے تذکرہ کے حوالہ سے اتنا لکھا ہے کہ :-

افضل، عبداللہ قطب شاہ سے جو ۱۰۲۰ھ میں تخت نشین ہوتا ہے، پیشتر گذرا ہے۔ اس کی تعلیم معمولی حیثیت کی تھی۔ صوفیانہ شعر کہتا تھا۔ اور ایک بکٹ کہانی لکھی ہے جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتبخانہ میں محفوظ ہے ؛

"قائم نے افضل کا جو زمانہ دیا ہے۔ اس میں بظاہر ایک غلطی معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ عبداللہ قطب شاہ درحقیقت ۱۰۳۵ھ میں تخت نشین ہوتا ہے۔ نہ ۱۰۲۰ھ میں جو محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کا سال ہے۔ اس کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ یا تو قائم نے محمد قطب شاہ کے نام کے بجائے عبداللہ قطب شاہ یا ۱۰۳۵ھ کی جگہ ۱۰۲۰ھ لکھ دیا۔ یہ امر بھی تعجب خیز ہے کہ قائم محمد افضل کے زمانہ کو جو خود اُس کے اپنے بیان سے ایک ہندوستانی شاعر ہے۔ ایک دکنی بادشاہ کے عہد کے ساتھ مضاف کر رہا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ دہلی میں رائج ہونے سے پیشتر اُردو شاعری چونکہ دکن کی سرزمین کے ساتھ وابستہ تھی۔ اس لیے ہمارے تذکرہ نگار اپنے ذہن میں غیر دکنیوں کو بھی دکنی ہی تصور کر لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ شیخ سعدی کو جو ہندوستانی ہیں دکنی فرض کر لیا گیا ہے ؛

علی قلی خان والہ داغستانی نے اتفاق سے محمد افضل کا تذکرہ ریاض الشعرا

(۱) [illegible]

میں شامل کرلیا ہے۔ جو ہمارے شاعر کے حالات پر بالکل مختلف روشنی ڈالتا ہے۔ والہ کا بیان ہے کہ محمد افضل پانی پت کے باشندہ ہیں۔ جو فضائل و کمالات ظاہری و باطنی سے آراستہ اور عشق و فقر کی چاشنی سے شیریں کام تھے۔ ہندی اور فارسی میں نہایت اعلیٰ شعر کہتے تھے۔ اور نثر نویسی میں مقبول خواص و عوام تھے۔ معلمی ان کا پیشہ تھا۔ اور طلبہ کی ایک کثیر تعداد ان کے حلقۂ درس میں داخل تھی۔ بہتوں نے ان سے فیض اٹھایا۔ بڑی عمر میں آکر کسی ہندو عورت کے دام عشق میں گرفتار ہو گئے۔ اور ایسے وارفتہ ہوئے کہ تمام زہد و عبادت و تقویٰ کو خیرباد کہا۔ اور مسجد و مدرسہ کے بجائے کوچۂ دلدار کا طواف کرنے لگے۔ اس عشق و وارفتگی کے ایام میں مولانا نے عاشقانہ غزلیں کثرت کے ساتھ لکھی ہیں ایک غزل کا مطلع یہ ہے:۔

عالم خراب حسن قیامت نشان کیست
در رہ کدام فتنہ گراست در زمان کیست

شدہ شدہ مولانا کے عشق و جنوں کی خبر عورت کے رشتہ داروں کو لگ گئی۔ اور غریب عورت مفت میں بدنام ہو گئی۔ بچاری نے باہر نکلنا ترک کر دیا حتیٰ کہ تہوار کے موقعوں پر بھی گھر سے باہر قدم نہ رکھتی۔ مولانا دیدار یار سے مایوس ہو کر کوچۂ یار میں دھونی رما کر بیٹھ گئے۔ بالآخر عورت کے رشتہ داروں نے تنگ آکر اسے متھرا اپنے عزیزوں کے پاس بھیج دیا۔ جب حضرت کو معلوم ہوا۔ کہ ان کا مطلوب

متھرا بھیج دیا گیا ہے۔ رونتے پیٹتے اس طرف کا رخ کیا۔ اور متھرا پہنچ کر تلاش یار جاری کر دی۔ تقدیر سے ایک دن یہ عورت اپنی سہیلیوں کے ساتھ باہر سیر کو گئی تھی۔ سامنے سے قبلہ مولانا تشریف لا رہے تھے۔ آپ دیکھتے ہی آگے بڑھے اور یہ شعر پڑھا:-

خوشا رسوائی و حال تباہے　　　مسر راہے دو آہے و نگاہے

خدا جانے وہ عورت ان کے شعر کا مطلب سمجھی یا نہیں لیکن اس نے مولانا کو بڑی گرما گرم داد دی۔ طیش میں آ کر کہا مولوی تجھے شرم نہیں آتی کہ منہ پر سفید ڈاڑھی لگا کر ایک جوان عورت کی محبت کا دم بھرتا ہے۔ مولانا شرمائے تو بہت۔ لیکن عشق کا بھوت ان کے سر سے نہیں اترا۔ پری کو شیشے میں اتارنے کے لئے فریب کا ایک ایسا جال تیار کیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا یعنی ڈاڑھی منڈوا دی۔ زنار گلے میں ڈال لی۔ اور برہمن کا بہروپ بھر کر ایک مندر کے پجاری کے شاگرد بن گئے۔ دن رات برہمن کی سیوا کرتے۔ اور علوم ہندی کی تحصیل میں مشغول رہتے طبیعت تھی۔ اخاذ تھوڑے ہی دنوں میں ہندی میں حیرت خیز ترقی کر لی۔ برہمن نے انھیں مندر میں اپنا نائب مقرر کر لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب برہمن کا انتقال ہو گیا۔ مرتے وقت انھیں اپنا جانشین مقرر کر گیا۔ مولوی نے چند ہی روز میں عوام کے قلوب پر ایسا اثر ڈالا کہ سب ان کا کلمہ پڑھنے لگے۔ اس مندر میں سال میں ایک مرتبہ میلا لگا کرتا تھا۔ جس میں مستورات بھی خاص طور پر شامل ہوا کرتی تھیں۔ جب میلے کا دن آیا اور عورتیں

نذر و نیاز لے کر جوق جوق پوجا کے لئے مندر میں داخل ہونے لگیں۔ مولانا کی مطلوبہ بھی نذر لے کر آئی اور جب اپنی باری میں مہاراج کے قدم چھونے کے لئے جھکی۔ آپ نے اس کو روک دیا اور کہا ہمیں بھی پہچانتی ہو۔ عورت نے سر اونچا اٹھایا۔ مہاراج کو نگاہِ غور سے دیکھا اور پہچان گئی۔ لیکن یہ امر اس کی فہم سے باہر تھا۔ کہ ایک مسلمان مولوی ہندو مندر میں بیٹھ کر پوجا کرا سکتا ہے سہمی اور گھبرائی ہوئی ان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ بالآخر بولی کہ آپ نے مجھ جیسی ناکارہ عورت کے لئے بے حد مصائب برداشت کئے ہیں۔ گزشت آنچہ گزشت لیکن آئندہ کے لئے وعدہ کرتی ہوں۔ کہ میں آپ کی تابعدار بن کر رہوں گی۔ آخر وہ عورت مسلمان ہوگئی۔ اور مولانا کی اہلیہ بن گئی۔ مولانا نے ۱۱۳۵ھ میں انتقال کیا۔

میں والہ کے اس بیان کو میر حسن کے بیان پر ترجیح دیتا ہوں۔ اس لئے کہ اول تو والہ میر حسن سے اقدم ہے۔ دوسرے محمد افضل اپنی بکٹ کہانی کے خاتمہ میں یہ شعر لاتے ہیں ؎

بیادِ دلربا خوش حال می باش   گہے افضل گہے گوپال می باش

میر حسن کے نزدیک گوپال اس ہندو بچہ کا نام ہے۔ جس پر مولانا عاشق تھے۔ اس توجیہ سے یہ شعر بے معنی بن جاتا ہے۔ میری مراد آخری مصرع سے ہے۔ والہ کے بیانات کی روشنی میں گوپال خود مولانا کا نام قرار پاتا ہے یعنی ان کی زندگی کے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جب وہ برہمن بن کر مندر کے پجاری بن جاتے ہیں۔

در گویاں نام اختیار کر لیتے ہیں اس سے شعر کے معنی بالکل روشن ہو جاتے ہیں۔ قائم کا
بیان ہے کہ افضل عبداللہ قطب شاہ کے دور سے پہلے کے آدمی ہیں۔ والہ کا بیان
اس کا بھی مؤید ہے۔ یعنی عبداللہ قطب شاہ ۱۰۳۵ھ میں تخت نشین ہوتا ہے۔ اور
افضل اسی سال انتقال کرتے ہیں۔

ہمارے مورخین کا یہ عقیدہ ہے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری ولی کی آمد اور محمد
شاہی دور تک وجود میں نہیں آئی تھی لیکن محمد افضل کے دوازدہ ماہہ کی موجودگی میں
ہمیں اس عقیدہ میں ترمیم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ محمد افضل ہی پر کیا منحصر
ہے۔ اگر باقاعدہ تلاش کی جائے تو افضل کے ساتھی اور بھی ملیں گے۔ ہمارا خیال ہے۔
کہ اردو میں تالیف و تصنیف ہند کے ہر صوبہ میں کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود تھی۔ یہ امر
بحث ہے کہ وہ لوگ دلی کے روزمرہ میں نہیں لکھتے تھے یا جذبات میں فارسی کے متتبع
نہیں تھے اور ہندی طرز میں لکھتے تھے ان کے اوزان ہندی تھے۔ اور عورت کی طرف
سے خطاب ہوتا تھا۔ بہرحال ملک میں اردو میں رسائل لکھے جانے کا رواج تھا۔ غیر
تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ تالیفات مقبول تھیں۔ مذہبی مسائل تھے۔ تصوف کے مسائل۔
تعویذ گنڈے۔ اور وظائف بلکہ منتر جنتر تک اس میں موجود تھے۔ لیکن آج یہ چیزیں
ہماری نظروں سے کیوں نہیں گذرتیں۔ اسکی سب سے بڑی وجہ ہماری وہی ناقابل
معافی بے پروائی ہے جس کے اثر میں ہم نے اسلاف کے علمی و دماغی کارناموں کے
ساتھ نہ صرف بے رحمانہ بلکہ مجرمانہ سلوک روا رکھا ہے۔ شیکسپیر، اور ملٹن۔ گولڈ اسمتھ اور

ٹینی سن کی آئڈیلز نے بھی اندھا کر رکھا ہے۔ ہم انگریزی ادیبوں اور شاعروں کے حالات سے واقفیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر ناواقف ہیں تو اپنے وطن کے باکمالوں سے۔ انگریزی اور انگریزی پرستی کی لہر ہم میں اس قدر دوڑ گئی ہے کہ ہم اپنے وطن کی ہر شے سے نہ صرف احتراز کرتے ہیں۔ بلکہ نفرت کرنے لگے ہیں:۔

محمد فضل کی بکٹ کہانی درحقیقت ایک بارہ ماسہ یا دوازدہ ماہہ ہے جس میں ایک فراق دیدہ عورت اپنے خاوند کی جدائی میں اپنی سکھیوں یعنی سہیلیوں سے خطاب کرکے اپنی بیتابی اور دردِ جدائی کی داستانِ الم سناتی ہے اور جیسا کہ ہمارے ملک میں بارہ برسوں کا دستور ہے۔ ہر ہندی ماہ کے عنوان کی ذیل میں اپنا قصۂ غم ایک دلگداز پیرایہ میں دہراتی ہے۔ اس کی زبان دکنی سے بہت مختلف ہے۔ اور صاف ہے۔ اس نظم میں فارسی بندشیں اور ترکیبیں جا بجا باندھی گئی ہیں۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو دکنی سے غیر حاضر ہے ایک مصرع کی بندش آدھی فارسی میں ہے اور آدھی ہندی میں حتیٰ کہ افعال و ضمائر فارسی سے بھی بے تکلف کام لیا گیا ہے۔ بعض امثال یہاں سپرد قلم کرتا ہوں:۔

چہ سازم چوں کنم کس کن پکاروں　　جنوں کیا عشق کے غم کا بچاروں

دیگر ؎

جنوں ور ملک جان چھنڈ آگیا یا　　سمجھ ور بوجھ کا تھانا اوٹھایا

دیگر ؎ چو شد مدت پیا کے سنگ رہتے　　مرم باگیہ گر کہتے و سنتے لو

دیگر ؎ چہ می بینم کہ منگل گا رتی ہیں مرے گھر ناریاں سب آ رتی ہیں

ذرا ضمائر متصلہ کا استعمال ملاحظہ ہو :۔

یہ "نہیں جز وصل کا سو کھا نہالم" (دیگر) "کہوں کیا اب ہکا نش ما گہہ لیتا"

دیگر :۔ ملے اگر چھیٹے جانم جلن سوں

بلکہ فارسی کا اثر اس سے بھی زیادہ گہرا ہے۔ یعنی لفظ "دھوم" ہندی ہے اس پر بہ قاعدۂ فارسی شین اضافہ کر کے حاصل بالمصدر دھومش بنا لیا۔

اتما کر بکر منے دھومش مچائی متاع صبر و تسکیں دل لٹائی

فارسی کا ایسا اثر میر جعفر زٹلی کے ہاں بھی بہت غالب ہے۔ اس قدر فارسیت کے باوجود یہ نظم جذبات کے لحاظ سے بالکل ہندی ہے اس میں ہندوانہ زندگی کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ ہندو تہواروں، ہولی، دوالی، اور دسہرہ کا مع ان کے لوازمات کے مذکور ہے۔ ہولی کے گیت گائے جاتے ہیں۔ رنگ کی پچکاریاں ہاتھوں میں ہیں۔ دف اور مردنگ بجائے جاتے ہیں۔ سر منڈل بھڑک رہا ہے۔ گلال اور عبیر اڑایا جا رہا ہے۔ دوسرے اور غزلیں گائی جاتی ہیں۔ کاگا قاصد ہے کویل کوکتی ہے۔ اور پپیہا پیہ پیہ کی پکار لگاتا ہے۔ جوگن کا بھیس۔ برہمن کا پوتھی دیکھنا۔ ٹوٹکے کرنا وغیرہ یہ تمام ہندی جذبات ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ محمد افضل کی یہ نظم ہندوؤں میں جیسا کہ میر حسن کا بیان ہے۔ زیادہ مقبول رہی :۔

از دوازدہ ماہ محمد افضل

سنادں سکھیو بکٹ میری کہانی ‏ ‏ بھئی[1] ہوں عشق کے غم سوں نمانی

نہ مجھ کو سوکھ دن نہ نیند راتا ‏ ‏ برہوں کی آگ سیں سینہ جراتا

تمامی لوک مجھ بوری[2] کہیں ری ‏ ‏ خرد گم کردہ و مجنوں کہیں ری

نہیں اس درد کا دارو کسی کوں ‏ ‏ پھرے حیراں سبھی حکما، ذو فن

اری جس شخص کوں یہ دیو لاگا ‏ ‏ سیاناں دیکھ اوس کوں دور بھاگا

اری یہ ناگ جس کوں ڈنگ لاوے ‏ ‏ پناوے کا ورہ جیورا کو اوے

اری یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے ‏ ‏ کہ جس کی آگ میں سب جگ جلا ہے

کہ جس کے بیچ یہ آتش بھتی ہے ‏ ‏ دہی دن رین سلگت ہے مبر ہے

وہی جانے کہ جس کے تن لگی ہے ‏ ‏ برہوں کی آگ تن من میں دگی ہے

بوانکی نہیں جس شخص کوں پیر ‏ ‏ چہ داند درد دیگر را ارے بیر

پھئی بوری برہ جل بیراک سہتی ‏ ‏ جلے جیورا نرانت آگ سیتی

چہ سازم چوں کنم کس کن پکاروں ‏ ‏ جتن کیا عشق کے غم کا بچاروں

---

[1] بھئی [2] باولی

نہیں یکدم مجھے دن رین میں چین — اندھیری ہو چلی رو روتے مری نین

جنوں درمُلک جاں جھنڈا اگڑایا — سمجھ ار بوجھ کا تھانا اوٹھایا

اوٹھاگر گھر میں وحوش مچا ہی — متاعِ صبر تسکیں دل لوٹا ہی تو

کیا مجھ دستگیراں شاہ بیداد — چہ سازم چوں کنم فریاد فریاد

پیالا حسن کی مے کا پلایا تو — کیا بے خود مجھے مجھ سوں بھولایا

گدا ہو کر پھروں گھر گھر و بازار — کبھو ہووے کہ پانوں بھیک[1] دیدار

بہت مدت کبھی کر تنے کہا ہی — پیا کے وصل کی تب پیکھ[2] دیدار

پیا نے کر پکڑ کر سوں لگا ہی — تمامی آگ تن من کی بوجھائی تو

چہ شد مدت پیار کے سنگ رہتی — مرم با یک دگر سنتی و کہتی تو

چہ حیلہ عشق نے بدمن اوٹھایا — فلک دشمن مری بھچیہ لگایا تو

مرا سکھ دیکھ اوس کوں حسرت آہی — نہادہ بردلم داغ جدائی

بکسّ قصہ بنت مشکل کہانی — دیوانی کی سنوں سکھیو کہانی

ملن یا پھی بچھڑناں بھی کٹھن ہی — کہو اب زندگی کا کیا جتن ہی

ساون

چڑا[3] ساون بجا مارو نکارا[4] — سجن بن کون ہے سانئی ہمارا

---

۱ بھیک ۲ پیچھے ۳ چڑھا ۴ نقارہ

کہتا کاری اور مد چہاتی سون آہی　　برہوں کی فوج نے کینی چڑھاہی[1]
پپیہا پیہ پیہ نس دن پوکارا　　پوکارت داور و جھنگھہ جینگارا
اری جب کوک کویل نیں سونا ہی　　تمامی تن بدن میں آگ لاہی
اندھیری رین جگنوں جگ مگاتا　　اری جلتی اوپر تیں کیا جلاتا تا
سنی جب مور کی آواز بن مسل　　تلیبا دل شدہ آرام تن سوں
پھپی جل مغل پہپیا سر سبز عالم　　نہیں جند مس کا سو کھا تہالم
ہندہ جلی جھولتی سبہ نار پہہ سنگ　　حسد کی آگ تی جارا مرا انگ
چلا ساون وگر ساجن نہ آہی　　اری کن سوکنی تو نی چلاہی

بھادوں

سکھی بھادوں نپٹ بھوتی پریری　　تمامی تن بدن میرا جہی ری
سبہ باور پھاروں اور چہسائیں　　لیا مجہ گھیر پیہ[2] ابھوں نیائیں
بھورن پرنی لگی اور راعد[3] کرجا　　تمامی تن بدن جیو جان لرجا[4]
کہتا کاری کی اندر بیچ چمکی ہے　　جرہی جیہو رہا کن سون دیہہ لجی
اکیلی دیکھہ نس کاری دراری　　تمامی رین دن برہوں ستاری

---

[1] چڑھائی، [2] پیہ، [3] رعد، [4] لرزا۔

پیا پردیس جا ہمکوں بسارا ۔۔۔ نجانوں کیا کنہ دیکھا ہمارا

کنتا غم کی ادر چھاتی سوں آہی ۔۔۔ اری دو نین نیس برکھا لگاہی

اری نس دن بتاؤ پوچھ ہاری ۔۔۔ خبر پیہہ[1] کی نیا ہی ہای ہاری

جری پوتھی بہمن سب مرگئی ری ۔۔۔ بھیٹی کب کاک اودو نہک بی ری

کہو پیہ کی خبر پوچھوں کیسے جای ۔۔۔ لکھوں پتیاں کسی بولی ہی ہای

خدایا ای صبا ہیں حال میرا ۔۔۔ پیا کوں کہو[2] کر ہی تک ایک پیرا

دہل رحلت کا بھادوں نے بجایا ۔۔۔ اچھوں لک ساور ابر دیس چھایا

اسوج

سنوں سکھیو کہ رت اسوج آہی ۔۔۔ پیاری کی خبر اب لگ نیا ہی

کہو کیسی جیویں بہہ باجھ ناری ۔۔۔ جنھی روتی کتی ہی عمر ساری

لکھوں پتیاں ارے اے کاک بیجا ۔۔۔ سلونی سانوری سندر پیا پا

کنا کن جب پیارا پیہہ آدمی تو ۔۔۔ توجہی دیکھی مہر کر کی بولا دی تو

سلام از طرف این غمخوار کیجہ ۔۔۔ پکن کوں پرس پاتی ناتھ دیجو

ارمی یہ کاک باتیں سدکھ نمانی ۔۔۔ مرم دل دہ دمند دل کا نجانی

پیا بن سیج رہی ناگن ہیمنی ری ۔۔۔ اس کھیلن کی سب دہ بودہ کٹی ری

---

[1] پیہہ، [2] کہو؛

دہسرا[1] ایو جنی کہر کہر سکھی ری — کہ رم مہیری نجانوں کیا پری ہے ری

اری سبزک پیا کے باغ جا کر — ایسکوں[2] بیو فا سہتی لوکا کرنا

کہو اری سنگ دل زنب لکہ دکھایوں — تیری لکہ سے اگر اک نول پاؤں

کہ گھر جا برہنی کوں گل لکا دے — پکر بہاں پلنگ اوپر تہما دو

کہ تیری برہوں سیں دن رین روے — بغم یہہ جو نبا تجہ با جہد کھووے

تم اوراں سیں پیاری سوکھ کرتے ہیں — ہموں سی برہنی سو دکھ بھرتے ہیں

دیا پیہ دیس جا سو کن تمہیں راج — تمہو لایا کہر نہیں تجہ نین ہیں لاج

تو جہی ای سنگدل کیسی پری ہیں — جری جبت آہ سوں جل تھل نوا دیں

اری ظالم نہ ڈاری خوب رب کا — قیامت ہی کہری کہ فکر تب کا

ذرا کر توں نہ آہ دردمنداں — کہ می سوز و نزا ہش سنگ بسنداں

سکھی اس سوچ میں سہہ عمر جاتی — سبھو سیں غم پیاری کا ستاتی

کہوے جا کئے کو ہی اس سجن سوں — سنی دل سوں کبہی نکھی ہمن کہل

سکھی اشوج رت چلتی رہی ری
پیا بن برہی جلتی رہی ری

---

[1] دمہرہ، [2] خود کو۔

محبوب عالم عرف شیخ جیون

شمالی ہندوستان میں محمد افضل کی تحریک اُردو نظم میں کسی تنہا واقعہ کی کڑی نہیں ہے۔ بلکہ بعد میں اور لوگ بھی اسکی تقلید کرتے ہیں۔ یہ تحریک پہلے پہل ہریانی زبان میں شروع ہوتی ہے جسے جانب بانگڑہ کہتے ہیں۔ ہریانی زبان مشرق میں اردو شمال میں اردو اور پنجابی مغرب میں پنجابی اور راجستانی اور مشرق راجستانی زبانوں سے محصور ہے۔ چودادری، فتح آباد، رہتک، ہانسی، حصار، کلانور، جھجھ، گھاناما، نارنول وغیرہ شہروں میں کسی قدر اختلاف کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ اس علاقہ کا مغربی حصہ بالکل غیر آباد تھا۔ لیکن فیروز شاہ نے دریائے جمنا و ستلج سے نہریں کاٹ کر اور نئے نئے شہر آباد کر کے اس کو بہت سرسبز بنا دیا تھا۔ اس سرزمین میں جھجھر کو بھی شامل سمجھنا چاہئیے۔ ہریانی زبان اُردو کے نہایت قریب ہے۔ کیونکہ دہلی کے قرب کی وجہ سے ان اطراف میں مسلمانی اثرات ہمیشہ غالب رہے ہیں:۔

شیخ جیون گیارھویں صدی میں پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے حالات زندگی سے ہم ناواقف ہیں۔ اسی قدر معلوم ہے کہ سید میراں بھیکھ چشتی صابری متوفی ۱۱۳۱ھ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ چنانچہ ان کے خلفا کی فہرست میں شیخ جیون کا نام بھی ملتا ہے اسپرنگر نے شیخ جیون کی مصنفات کے مفصلۂ ذیل نام دئے ہیں:۔

(۱) فقہ ہندی (۲) مختصر نامہ (۳) درد نامہ (۴) خواب نامہ پیغمبر (۵) رہبر نامہ
بی بی فاطمہ نمانوں ۔ ان میں سے نمبر اوّل فقہ ہندی شیخ جیون کی تصنیف نہیں ہو سکتی ۔ اسکے مالک کوئی عیسی ہیں جو پنجاب سے علاقہ رکھتے ہیں ::

یہاں صرف درد نامہ کے مختصر سے تبصرہ پر قناعت کی جاتی ہے ۔ درد نامہ ایک بڑی کتاب ہے جس میں پونے تین ہزار کے قریب اشعار ہیں ۔ اس کی زبان رائج الوقت اردو سے بہت مختلف نظر آتی ہے لیکن جس وقت یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے ۔ اس وقت اس کی اور دہلی کی زبان میں بہت کم فرق ہو گا ::

سب سے بڑا فرق اس کی ماضی مستقبل اور مضارع کے صیغوں میں ہے جہاں یہ زبان اردو اور ہریانی دونوں زبانوں کی تقلید کرتی ہے ۔ مثلاً :۔

عرض اور بھی ہم جو تجھ سے رکھاں کہاں تا تجھ سے تو کس سے کہاں

اردو میں ایسے موقع پر رکھیں اور کہیں لاتے ہیں ۔ اور یہ شکل بھی ہریانی میں موجود ہے اسی طرح ماضی کی مثال :۔

مصرع تمہیں ہے جیسے بہت دکھ پڑاں دینے پڑے ا

ا ۔ کی لام ہریانی میں رے سے اور ڑے ڈال سے بدل جاتی ہے ۔

تلوار = تروار ، ڈل = ڈار ، پڑھینگے = پڈھانگے ، بڑائی = بڈائی ،
کڑا = گڈا ، پڑھنا = پڈھنا ، چڑھنا = چڈھنا ::

الفاظ میں حرفِ دوم علت بہت نمایاں ہے ۔

رکھ = راکھ، بکری = باکری، کل = کالھ، دکھ = دوکھ، اکھٹی = اکھیٹے،

لگا = لاگا، اترا = اوترا ؛

غنہ کثرت سے مستعمل ہے۔

نے = نیں، تو = توں، کوچ = کونچ، پچاس = پنچاس، سنی

سیں، کو = کوں، مانے = مانیں ؛

ہائے مخلوط التلفظ بہت موقعوں پر خارج کر دی گئی ہے۔

بھی = بی، ابھی = ابی، جبھی = جبی، باہر = بار ؛

دردنامہ کا افتتاحیہ ہے :-

جپوں میں پہلے نام رحمٰن کا ۔۔ بتوں گیان میں دھیان سبحان کا

سچی ایک کرتار وہ پاک ہے ۔۔ کھڑا جسکی قدرت سے افلاک ہے

وہی ہے جو کرتار عالم خدا ۔۔ نرنجن نرنکار سب سے جدا

جسے ایک پلک میں کیا یہ جہاں ۔۔ وہی توڑ دے پھر خودی اور گمان

کیا جن تکبر وہی پاک سے ۔۔ پڑا عاقبت خاک پہ ناک سے

تکبر سے شیطان رانا گیا ۔۔ فرشتے سے وہ دیو دانا گیا

تکبر خودی کی تھی نمرود میں ۔۔ براہیم نبی سے جو مردود میں

دیا مغز بیچ ڈانس جب کیا نبی ۔۔ لگی لاکھ پاپوش سر پہ گھنی

بنایا ارم بہشت شداد میں ۔۔ لگائے بہت درم بیداد میں

چلا ہشت کوں دہ بنا گز نداں　　غضب کے فرشتے ہیں کھینچے پراں

فارسی اور عربی الفاظ کے استعمال میں مصنف ان کے اصلی تلفظ کی پرواہ نہیں کرتا بلکہ مقامی لہجہ میں لکھتا ہے۔ مثلاً فاطمہ کو فاطماں اور طاق کو تاک لکھتا ہے اور پاک اس کا قافیہ ٹھہراتا ہے۔ لوک کا قافیہ شوق لایا ہے۔ عکرمہ کو عکرماں لکھ کر اکڑماں کا ہم قافیہ بنایا ہے۔ ہراول کو ہردل اور گرز کو گرج اور صبح کو صبی لکھتا ہے۔

محبوب عالم کے کلام میں خاصی چستی اور روانی نظر آتی ہے۔ جنگ احد کے چند اشعار یہاں نقل کرتا ہوں:۔

ہوئے پھر مقابل قریشیوں کے تب　　نبی اور اصحاب ایک بار سب

عکاسہ طرف داہنی کوں کھڑا　　ابوسلمہ بانویں طرف پہ پڑا

کیا سعد وقاص عیسےا ہردل　　کیا اور مقداد کوں تب چنڈول

ہوئے آپ درمیان کی فوج میں　　نبی خاص مقبول سبحان ہیں

کھڑی فوج کفار کی بھی ملیار　　لیے داہنی خالد اکر یوں کار

ہوا طرف بانوے کے جب عکرماں　　کھڑا ابر تردار ہے اکڑماں ہر

مقابل ہوا عمر سفیان شتاب　　چلا اور بیٹا ربیعہ خراب

ہوئی صف جو دونوں طرف تیار　　بولا سے چھوٹوں طرف سے مار مار

تر نگوں کی پھر تنگ کھینچی لگام　　بھی دنگ آس جنگ کی دھوم دھام

دھماندم گھماگھم ہوئی پھیر کر　　لیا ایک نے ایک کوں گھیر کر

کہیں برچھیاں ترچھیاں ہاتھ میں   ہوئے مرد کی مرد جب گھات میں

کرے پیل کی بل اوپر کھیل کر   لیا مرد نیں مرد کوں پیل کر

نیا نیپ چلتے تیر پہ تیر زور   کھیا کھب ہوئی پار سنجو ہو بھیڑ

لگے گرج بھاری گمرج شور کر   کمر توڑ ڈالی پنٹ زور کر

بہی دھار تلوار اوت آب دار   جیسے پار جاں ہوئے لوہ تار

لڑائی تھی اک قیامت اٹھی   قیامت کی اس بات جہاتی پھٹی

کہیں مست گھو میں صحابی لکڑے   کہیں گھاو کھائے قریشی پڑے سے

مسلمان اصحاب نیں تیر کر   لیا مار کفار کوں پھیر کر

گئے بھاگ کافر چلے کھائے ڈر   اوتھی الکذا آیت جب نا بیاں کا نگر

رسول اللہ کی وفات پر مصنف نے حضرت عائشہؓ و حضرت فاطمہؓ و حسنینؓ کی طرف سے مرثیے لکھے ہیں جو بالکل غزل کی شکل میں ہیں لیکن وہ انھیں دوہرے کہتا ہے چنانچہ حضرت عائشہؓ کا دوہرا حسب ذیل ہے :-

سکھ ہمیں کے گھر سو دتی لاگا کلیجہ تیر اب   دکھ میں بھر بھر وو سال بھاری پڑی ہے بیر اب

سو وہ کرموں جو نہ رہیں کس کوں سنائیں الخ   کڑا ہی لگی آب مرم کی دیکھی گئی ہے پھیر اب

جانی بنا کوئیل بھئی جر جب سبھی جوں کوئلا   تن ہل گئی ہے لوگنی دل کا گیا دلگیر اب

نس دن پیو کا ادن انکھیاں ہوئیں سبھی تن بے کلی   انسواں جھڑاں ناسی بھراں نینوں بہا نا نیر اب

نیری ہنسی بن من منت پھی لگی ہے جھانجھک   ترپھیں پڑی بیکل کھڑی جیسے ہرن بن شیر اب

پیو چاہ چاہے جیو پیو بن نہیں کچھ جیونا ۔ جیکوں نجوں پیکوں لہ دن سانچی اچھی ہے پیراب
پل پل پڑی ٹھک ٹھک گری لوٹن ناٹک ناہیں دہا ۔ محبوب عالم نیہہ کی پاؤں پڑی زنجیر اب

حضرت عمرؓ کا دوہرا یہ ہے ۔

محمدؐ یاد نا جیو کیں پڑا دن رین کر لاؤں ۔ کھڑا فریاد ماں کو کوں محمدؐ سا کہاں پاؤں
محمدؐ نیہہ کی پھانسی گئی گر مانہ سے ہانسی ۔ گئی ہے ٹوٹ کر پھانسی کسے بحال دکھلاؤں
لگن لاگی نپٹ گاڑھی محمدؐ پیت نیں باڈہی ۔ یہی ہے جیو ماں ٹھاڈی محمدؐ نانوں نت گاؤں ۲
محمدؐ کہہ محمدؐ کہہ پوکاروں میں سدا اللہ ۔ پھروں گھر گھر یہی کہہ کہہ محمدؐ نانوں مہنچاؤں
کروں ہا ہا محمدؐ بن سکھوں بھا ہا بڑا نس دن ۔ گئے سب چین ہر دم میں کسے دکھ بات بتلاؤں
زبنگی ہے نادسا تھی پھٹی اس ورد ماں چھاتی ۔ بھتی تن کی سبھی ٹاٹی محمدؐ باجھ من پاوں ۲

عجب محبوب عالم تھا نہایت خوب بالم تھا
مرا نت برت بالم تمارا ہے بیٹھ کس ٹھاؤں

میر جعفر زٹلیؔ

پچھلے تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر کیا ہے۔ اور اردو شعرا میں مانا ہے۔ لیکن حال کے تذکرہ نویسوں نے ان کے نام پر پردہ ڈال دیا ہے مولانا محمد حسین آزاد نے یہ کہکر ان سے دامن چھڑایا ہے کہ زٹل کا بھروسا کیا۔ لیکن اردو کی تاریخ میں ان کے خار دار و اغلاط مضامین کے باوصف میر جعفر سے اعراض نہیں کر سکتے اس لئے ہندوستانی اردو نگاروں میں انکا نمبر بہت پہلے ہے ان کا اور ولی کا ایک زمانہ ہے۔ اس لئے دہلی میں ولی کے متبعین سے ان کا زمانہ اقدم ہے:

میر جعفر اصل میں نارنول کے باشندے ہیں۔ اور سید عباس کے فرزند ہیں جن کا پیشہ دکانداری تھا اورنگ زیب کی تخت نشینی اور میر جعفر کی ولادت ایک ہی سال کے واقعے ہیں۔ ان سے پہلے دو بہنیں ہو چکی تھیں۔ اور بعد میں ان کے چھوٹے بھائی صفدر ہوئے۔ میر کی کم عمری میں ان کے والد کے انتقال کا واقعہ پیش آیا۔ چچا نے جن کا نام میر سرور تھا سرپرستی کی۔ مکتب میں تعلیم پانے کے بعد ملازمت کی تلاش میں نکلے اور شہزادہ کامبخش کی فوج میں سواروں میں ملازم ہو گئے چونکہ اورنگ زیب کا اکثر زمانہ دکن میں گذرا اس لئے یہ بھی کامبخش کے ساتھ وہیں رہے۔ ان کا سال وفات کسی نے نہیں لکھا لیکن ان کے کلیات مطبوعہ لکھنؤ ص ۴۸ کی ایک سرخی سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ

فرخ سیر نے ان کو قتل کر دیا تھا۔

میر جعفر فحش گوئی میں عبید زاکانی کے خلف الرشید معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ تو طبیعت کی افتاد اور کچھ ان ایام کی متبذل اخلاقی حالت نے ان کو اس رنگ میں رنگ دیا۔ ہجویں انھوں نے کم لکھی ہیں۔ اور وہ بھی ضرورتاً لکھی ہیں۔ تاہم ان کی زبان درازی اور بیباکی میں کوئی شک نہیں۔ انکے قلم سے راجا سے پرجا تک کوئی نہیں بچا۔ وہ نہ شہزادوں سے خائف تھے اور نہ خانوں سے۔ جس نے انہیں چھیڑا نقصان اٹھایا۔ مشہور تو زٹل ہیں لیکن کلام کو خداداد قبولیت حاصل تھی اسی لئے دنیا ان سے کنیاتی تھی۔ انکی زبان سے عورتیں بھی نہیں بچیں۔ عالمگیر اگرچہ نہایت ثقہ اور متین بادشاہ تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اسکی انتہائی سنجیدگی اور متانت کی تلافی کے لئے ایک ہی وقت میں دو زبردست ہزال اور فحش گو فارسی اور اردو زبانوں میں پیدا کر دیے۔ ایک یہی ان سطور کے موضوع اور دوسرے میر نعمت خاں عالی۔

قمرالنساء بیگم نے میر صاحب کو تیس روپیہ انعام دیے جانے کا حکم دیا۔ بیگم کے دیوان فتح علی خاں نے پانچ روپے دے کر ٹالنا چاہا۔ میر صاحب اس پر بگڑ گئے۔ دیوان صاحب کی ہجو الگ لکھی۔ اور روپیہ الگ وصول کیا۔ خانجہان خان بہادر کوکلتاش عہد عالمگیر کے مشاہیر امرا سے ہیں۔ میر نے ان کی خدمت میں ایک قرآن مع ایک عدد قصیدہ پیش کیا۔ اور قرآن شریف کے ہدیہ اور قصیدہ کے صلہ کے لئے عرصہ تک منتظر رہے۔ لیکن کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوا۔ آخر میر نے تنگ آ کر خان والاشان کی ہجو لکھی۔ ایک امیر نے ان کو پانچ اشرفیاں انعام دلوائیں۔ اس کے دیوان خدایار بیگ نے اشرفیاں دبا لیں۔ میر کو خبر لگی۔ خدایار پر برس

بڑے بیں ہجو کے آخر میں فرماتے ہیں ؎

جو کوئی مجھ اوپر شفقت کرے	ہگنت بیچ اس کی خدایت رکھے
نہ ایں ہجو از راہ حرص و ہواست	ولا نزار را ہجو کردن رواست
بما جعفرا کنوں شکایت مکن	زموذی و مانعی حکایت مکن

میرؔ کے قلم سے عالمگیر کے فرزندوں میں کوئی بھی نہیں بچا۔ ان شہزادوں کی اُس کی نابت نے دکن کی مہم کو ایک نہایت پیچیدہ اور کٹھن کام بنا دیا تھا۔ محمد معظم کی تعریف میں کہتے ہیں :-

نخستیں کلاں ترکہ برگشتہ گرد	ہمہ کار و با پدر بھنڈ کرد
چناں لوٹ شد بستی بھگ نگر	نہ خذ ماصفا ماند نہ ماکدر
چہ ملکے بدستِ خود آوردہ داد	مگراز بہشتش اسامے نہاد
جہاں ہوے ایسا کچھن کپوت	لگے خلق کے منہ کو کالک بھبوت

اور محمد اعظم شاہ کے حق میں کہتے ہیں ؎

دگر شاہ اعظم ہمہ کند دہ	برسوائی انداخت کار پدر
بخود شد من دخیلو رہ ساختہ	بہ تلو بتو کار در باختہ
فرستند ایناں بشب یان پھول	ملائکہ کیا کام سب خاک دھول
ازیں اختلافش کہ گیرد خراج	کہ دہنگ بھنگ گشت است تلو کاج

محمد اکبر کے لئے کہتے ہیں۔ (ع)

چہارم پسر ڈدمنی کا چنا ئو

خود شہزادہ کا منجش یہ بھی میر نے ہاتھ صاف کیا۔ خیریت اسی میں گزری کہ نوکری سے موقوف کردئے گئے۔ میر اپنی اس غلطی کو مانتے ہیں اور پشیمان بھی ہیں :۔

درماندۂ بے بال و پر کہہ جعفر اب کیسی بنی | نوجواں سلطان خود کردی پریشاں جان خود
تا حال ہم داری حذر کہہ جعفر اب کیسی بنی | با بادشہ تیں بیر لی مہر لی خدانے خیر کی
درخاک شد اُں گرد فر کہہ جعفر اب کیسی بنی | وہ ذوق ہر دم کا کہاں وہ عطر بیگم کا کہاں

عالمگیر نے "امجد خاں" کا خطاب ایک امیر کو دیا۔ میر نے اس واقعہ کی تاریخ "جھل سگ لکالی" جس سے ۱۱۱۳ھ برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ میر اورنگ زیب کا ہمیشہ نہایت ادب سے ذکر کرتے ہیں۔ اس کی زندگی میں نیز وفات کے بعد بھی اسکا احترام کرتے رہے۔ اگرچہ ایک آدھ جگہ اس کو للو کہہ گئے ہیں تاہم کوئی ہجو مقصود نہیں ہے۔ اسکی وفات پر جو ہندوستان کا نقشہ بگڑا ہے اور رعایا پر ایک عالمگیر بے اطمینانی اور بےچینی چھائی ہے۔ اس کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں :۔

مکمل اکمل دکامل دل آگاہ | کہاں ب پایئے ایسا شہنشاہ
نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے | رکت کے آنسوؤں جگ رو رہا ہے
بسر اسباب و بندوق است ہر سو | صدائے توپ و بندوق است ہر سو
بچہ در گود سر مکٹیا دھری ہے | دوا دو ہر طرف بھاگڑ پڑی ہے
جھٹا جھٹ دیکھا پھٹ ہست ہر سو | کٹا کٹ و لٹا لٹ ہست ہر سو

بھر سو بار مار، دھاڑ دھاڑ است | او چل چال و تبر خنجر کٹار است
ازاں اعظم و زیں سوے معظم | جھڑا جھڑ و دہڑا دھڑ ہر دو پایم
بہ نیم تا خدا از کیست راضی | بخواند خطبہ بہ نام کہ قاضی

محمد معظم کے دور میں میرنے ایک رسالہ اخبار دربار معلےٰ کے نام سے لکھا ہے جس میں اوّل دربار کے فرضی وقائع بیان کئے جاتے ہیں۔ اور پھر ان کے متعلق شاہی احکام صادر ہوتے ہیں۔ میرنے یہ شاہی احکام اکثر اوقات ضرب الامثال کی زبان میں ادا کر دیئے ہیں۔ اس طرح ہمیں کسی قدر اس عہد کی ضرب الامثال سے واقف ہوجانیکا موقع مل جاتا ہے۔ میں بعض یہاں نقل کرتا ہوں۔ اکثر وہی ہیں جو آج بھی رائج ہیں:

(١) جوم پھاڑ بھاری پتھرا (٢) تجھے پرائی کیا پڑی تو اپنی آپ نبیڑ (٣) ہارا حاکم نامن چاہے (٤) نا بھلے کی جورو کا تندرا رکھوارا (٥) ڈوم جب کمیڑی بھیڑ کی وار ہوا نہ پارا (٦) باندر کے ہاتھ ناریل (٧) باسی رہے نہ کتا کھائے (٨) ٹھالا بنیا بیری تولے (٩) ماں پہ پوت پتا پر گھوڑا اتنہ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا (١٠) بہرے آگیں گاونا اور گونگے آگے گل۔ اندھے آگیں ناچنا یہ تینوں ال بل (١١) دبی بلی چوہے پاس کان کترادے (١٢) گدھوں کھایا کھیت پاپ نہ پن (١٣) داتا کی ناؤ پہاڑ چڑھے (١٤) ملے منہ طباخ سے آگے دھر انکھا سے (١٥) نرت دان مہاپن (١٦) اوکھلی میں سر دیا دھمکیوں سے کیا ڈرنا (١٧) کھادیں پیویں محمود کے ادر اویں مسعود کے

(۱۸) پاسا پڑے سو داؤ راجا کہے سو نیاؤ (۱۹) آٹا نمٹا اور بوجا سٹکا (۲۰)

جیسا بو دے تیسا اوبے (کذا) (۲۱) خارشتی کتا مخمل کی گدی اور اس پہ

بانات جھول (۲۲) چار دن کا چاندنا اور پھر اندھیری رات "

اس رسالہ کے متعلق ایک حیرت خیز واقعہ یہ ہے کہ اس میں عالمگیر ثانی متوفی ۱۱۷۳ھ

اور شاہ عالم ثانی متوفی ۱۲۲۱ھ کے زمانوں کے بعض واقعات درج ہیں۔ مثلاً احمد شاہ

درانی، سورج مل جاٹ اور مرہٹوں کا دہلی میں استیلا وغیرہ۔ اب یہ نا ممکن ہے کہ میر

عالمگیر کے جلوس کے سال ۱۰۶۹ھ میں پیدا ہو کر بارھویں صدی کے اختتام تک زندہ

رہیں۔ حالانکہ ان کی عمر ساٹھ سے کچھ اوپر بتائی جاتی ہے۔ جس حساب سے انھیں فرخ میر

۱۲۱ھ کے زمانہ میں انتقال کرنا چاہیے۔ اس صورت میں یہی خیال کیا جا سکتا ہے کہ میر

کے کسی فرزند معنوی نے میر کی وفات کے بعد بھی اخبار دربار معلےٰ کو جاری رکھا:

جب میر ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ ان کا ملازم اُنکا تمام اندوختہ لے کر بھاگ

گیا۔ میر نے اپنے دل کا بخار نثر میں اس طرح نکالا :-

" درعین وقت بیکاری وچنین ناداری عنی ازلی و متفنی و بیلہ وجیر علینہ چگونہ

نفرے بے پدرے ماچہ خرے فرصت وقت را یافتہ۔ متاع کثیر و قلیل را گرفتہ

بگوشہ خزید۔ قولہ تعالیٰ یَفْعَلُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ۔

مثلہ موے پر سو درے۔ مثلہ۔ جیسے کوڑھ میں کھاج۔ مثلہ۔ بلکہ بےخرچی

میں آٹا گیلا۔ بیا جعفر مجوش و مخروش نشنیدہ کہ گفتہ اند "

جب فرخ سیر تخت نشین ہوا۔ اس کے سکہ پہ یہ شعر کندہ کیا گیا ؎

سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر　　　پادشاہ بحر و بر فرخ سیر

میر کی طبیعت بھی جولانی پر آئی۔ آپ نے اپنے انداز میں اس سکہ کو یوں سجایا:۔

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر　　　پادشاہ پشتہ کش فرخ سیر

میر تقی میر نے لکھا ہے کہ میر جعفر ایک روز میرزا بیدل کے ہاں گئے۔ اور فتوح کی امید میں یہ مصرع پڑھا ع

چہ عرفی چہ فیضی بہ پیش تو ہیچ

میرزا بہت برہم ہوئے اور کچھ دلوا کر ٹال دیا:۔

میر حسن بیان کرتے ہیں کہ میر جعفر ایک دن میرزا بیدل کے گھر گئے۔ بیدل اسوقت فکر شعر میں مشغول تھے۔ کچھ توجہ نہ کی۔ میر زیادہ انتظار نہ کر سکے پوچھا "قبلہ وہ مصرع کیا ہے جس کے دوسرے مصرع کی تلاش ہے۔ بیدل نے کہا وہ مصرع یہ ہے ع

لالہ در باغ داغ حیراں دارد

میر نے سنتے ہی بے تامل کہا ع

چو بکے سبز زیر .... دارد

بیدل بہت خفا ہوئے اور کچھ دے کر پیچھا چھڑایا:۔

میر جعفر کے کلیات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں اردو اور فارسی میں گنگا جمنی پیوند دئے جانے کا دستور تھا۔ اور زبان کی شاہراہ جو بہ تقلید

دکن عہد محمد شاہ میں قائم ہوئی ہے اسوقت تک طبار نہیں ہوئی تھی۔ ان کا کلیات اگرچہ مختصر ہے تاہم اسمیں ہم سینکڑوں عجیب و غریب الفاظ پاتے ہیں جو آج متروک ہیں۔ تقدد سنجیدہ مضامین پر انھوں نے بہت کم ہاتھ ڈالا ہے لفاظی میں نظیر اکبر آبادی سے کم نہیں ہیں۔ ان کی طباعی اور ذہانت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ زبان اردو کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے کلیات میں موجود ہے:

میر اپنے تمسخر کی لہر میں اکثر اوقات ہندی الفاظ کو عربی بندش دے دیتے ہیں۔ مثلاً:-

"چوں گھڑ گھڑاہٹ الرعد فی الغمام و کڑ کڑاہٹ البرق فی الظلام بر سر است وہنگام گھٹا اگھڑ صبح و شام شور دارد و مدر بر دوام و آوان لرزۃ العمارات وگرپڑۃ الکھنڈرات و ٹوٹ الچھپر والبد حیارۃ فی المنظر است و دل وسعت منزل علی النیچ بیچ والکیچ کھاچ کوچہات جھپی اگین اکراہ میورزد:"

یا فارسی کے مطابق ہندی افعال کی تصریف کر دیتے ہیں۔ جیسے:-

"نہ ہلد نہ تلد نہ جلبد نہ ریج (۱) اشل تو نباشد بجہاں لے نٹر (۲) ٹھکنارہ شکندہ بر نبلد جو موند"

یہ طرز اور زبانوں میں بھی موجود ہے۔ طرزی نے اسے فارسی میں اختیار کیا ہے اور سترھویں صدی کے انگریزی شعرا کے کلام میں ایسے نمونے کثرت سے ملتے ہیں جن میں انگریزی اسماء و افعال کو لاطینی زبان کی تصریف کے مطابق برتا گیا ہے:

یہاں کسی قدر کلام کا نمونہ حوالۂ قلم کیا جاتا ہے:-

نہ سو سکے سیج رحمت میں سدا روزہ و طاعت میں   اجل بھی آ یگی ساعت میں کہ آخر خاک ہو جانا

جنھوں کے لاکھ تھے گھوڑے سدا زربفت کے جوڑے   انھوں کو موت نے توڑے کہ آخر خاک ہو جانا

جنھوں گھر جھولتے ہاتھی ہزاراں ین ُن ساتھی   تنھوں کو خاک اب کھاتی کہ آخر خاک ہو جانا

کر جب موڑ کر چلتے عطر سب دیہہ پر ملتے تو   دیکھو اب خاک میں رلتے کہ آخر خاک ہو جانا

جنھوں کے لال تھے ہیرے سدا مکھ پان کے بیڑے   تنھوں کو کھا گئے کیڑے کہ آخر خاک ہو جانا

سدا جو پہنتے ململ محل میں باجتے مندل تو   گئے سو وہ خاک میں رل کر آخر خاک ہو جانا

کلغی باندھتے پاگاں محل میں رنگ اور راگاں   وہاں ہیں بیٹھتے کاگاں کہ آخر خاک ہو جانا

لذت کا کھاوتے کھانا پہرتے ریشمی بانا   انھوں کو موت نے ہمانا کہ آخر خاک ہو جانا

ہزاراں شہر کے راجا جنو مکھ چاند سے لاجا ر
نقارا موت کا باجا کہ آخر خاک ہو جانا

در بیان نوکری :-

بشنو بیان نوکری جب کا نشٹ ہووے غضو کھری   جب بھوال جلائے جو کڑی یہ نوکری کا خط ہے

ہر روز اٹھ مجرا لریں در کار یک صد گر پڑیں   بے شرم آپس میں لڑیں یہ نوکری کا خط ہے

ہر صبح ڈھونڈیں نوکری کوئی نہ پوچھے بات ری   سب قوم ڈھونڈیں لاکڑی یہ نوکری کا خط ہے

جو کی لکھیں اور حاضری کہاوں بنا دیں باجری   تسپر جلیا وے ناظری یہ نوکری کا خط ہے

راکھے سپاہی کھات کو جو کی دلاویں رات کو   کوئی نہ پوچھے ذات کو یہ نوکری کا خط ہے

صاحب عجب بیداد ہے محنت ہمہ برباد ہے   اے دوستاں فریاد ہے یہ نوکری کا خط ہے

ہم نام کو اسوار ہیں روزگار سے بیزار ہیں — یار د ہمیشہ خوار ہیں یہ نوکری کا خط ہے

یک تیر بے پیکاں نگر و روے تو سوفار و نہ پر — غوطہ نماندہ در کمر یہ نوکری کا خط ہے

دربار دیکھا خان کا بیڑا نہ پایا پان کا [illegible] — زر کا تو پھر امکان کیا یہ نوکری کا خط ہے

انقلاب زمانہ:-

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے — ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے

نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھاؤں میں وفاداری — محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے

نہ بولے راستی کوئی عمر سب جھوٹھ میں کھوئی — اتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے

خوشامد سب کریں زر کی جو بیگانہ جو زن گھر کی — ملاوے بات سب ہر کی عجب یہ دور آیا ہے

نفر کی جب طلب ہووے نفر باہر کھڑا رووے — میاں گھر میں پڑا سووے عجب یہ دور آیا ہے

یہ واضح رہے کہ اشعار بالا میں ردیف پر قناعت کی گئی ہے۔ اور قافیہ کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ مجذوبِ عالم کے دوہروں کی بھی یہی خصوصیت ہے۔ نظموں کا یہ دستور پنجاب میں بہت عام تھا:-

سیّد اٹل نارنولیؒ

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ میر جعفر زٹلی کے بھائی ہیں اگرچہ سگے بھائی نہیں ہیں تو روحانی ضرور ہیں۔ ان کا ایک رقعہ کلیات جعفر زٹلی میں محفوظ ہے اس رقعہ کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اور میر جعفر کا مذاق ایک ہی رنگ کا ہے۔ اور زٹل اور اٹل میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ وہو ہذا:

"رقعہ سید اٹل کہ از نارنول نوشتہ بمیر جعفر در دکن فرستادہ بود"

"پناہ بڑائی وچڑائی میر جعفر زٹلی بڑے بھائی ہر روز یاد حق سکھی باشند۔ از سیّد اٹل بعد از یک جہار بسیار و رمنوہار بیشمار و جھل و مخفی نماند کہ پیر پریت ہموطن وادمنگ ملاقات و اشتیاق آں از حد پرے گھٹ نپٹ بیروں و از جہت اندیشہ بنہایت فزوں لیک بموجب آں کہ کُلُّ اَمرٍ مَرہُونٌ بِاَوقَاتِہَا حوالہ نمودہ۔ دوانچھری نگارد کہ بعضے بدبختاں کافر کشہ دلی بوجہ مزید غشہ در جوی خودی چوں غوک اندمی ٹرٹر می کنند و انکھاڑ پچھاڑ کردہ در نارنول ٹھیکا ٹھاہ بودم و بعضے ٹرتوں وچرچوں از برائے ایں نپٹ مہرباں از وہاں . . . . نشان بجل . . . . پڑپڑ بر زباں می آوردند۔ نظم ؎

زٹل تیری جعفر جہانگیر شد   زٹل گفتن اندر توئی میر شد

امید کہ خود دریں بیتہ ہادی بودہ از خط و کتابت بھول جانا روا نباشد۔ بیت ؎

نام حق روز و شب پکارا کر   خط کتابت کو بھی بیچارا کر

اس رقعہ کا جواب میر جعفر نظم ہیں دیتے ہیں، جو یوں شروع ہوتا ہے:۔

سنو اے سخنداں برادر عزیز   اٹل نار نولی توئی باتمیز

اسی جواب میں زٹل ذیل کا شعر بھی لکھتے ہیں:۔

منم کمترین بندہ شاگرد تو   شب و روز در یاد در ورد تو

جس سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں زٹل اور اٹل ایک ہی بھروپ نہ ہو:

غزل ذیل بیدا ٹل کا نمونہ کلام ہے جو ایک بیاض نوشتہ عہد محمد شاہی سے نقل کی جاتی ہے

رخسار پر بہار جوں رونق چمن   یا گل گلاب کا کھوں یا لالہ یاسمن

یا حقہ جواہر دیا درج در کھوں   یا غنچۂ گلاب کہوں یا کھوں دہن

کیسوئے تابدار ہیں یا ناگ ہے بھونک   یا زلف مشک رنگ ہے یا نافہ ختن

با قد خوش خرام چلے جب لٹک لٹک   شمشاد اور صنوبر خم کھاویں در چمن

چون ماہتاب دیئے او کرتا ہے جھمک جھمک   یا آفتاب گشتہ درخشندہ در گگن

بیدا او گر ستمگر ظالم عجب عجب   گہ مہربان و گاہ غضبناک خندہ زن

بر توسن کرشمہ سوار است نازنین   بیدا اٹل زبادۂ دیدار او مگن

(از بیاض پرتاپ سنگھ ساکن موضع آور عملہ پرگنہ راہوں دو آبہ بست جالندھر بست و نہم شہر جمادی الاولی سنہ جلوس والا محمد شاہ بادشاہ غازی)

فارسی لغات سے اُردو کی قدامت کی شہادت

اکبر اعظم کے عہد میں فارسی خوانی کا رواج از سر نو تجدید پاتا ہے۔ اس عصر میں علوم و فنون نے وہ ترقی کی جو گذشتہ ایام میں نامعلوم تھی۔ فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد ۷۹۰ھ سے لیکر اکبر کے جلوس ۹۶۳ھ تک کا زمانہ ہندوستان میں فارسی کے لئے عہد تاریک کا حکم رکھتا ہے۔ اس زمانہ میں بہت کم تصنیفات ہوئیں اور نہ کوئی چوٹی کا مصنف یا شاعر پیدا ہوا۔ یوں تو فارسی کا ستارہ اس زمانہ سے پیشتر بھی گہنانے لگ گیا تھا۔ خلجیوں میں علاء الدین محمد شاہ ۷۱۵ھ کا زمانہ انقلاب خیز ہے۔ اس کا عہد زمانہ ماسبق کے اثرات کی بنا پر اگرچہ علم و فضل کے علمبرداروں سے خالی نظر نہیں آتا۔ اور علما و فضلا، ادیب و شعرا کا جمگھٹا پایۂ تخت میں موجود ہے لیکن بادشاہ بذاتِ خود جاہل مطلق تھا۔ اور پرستاران علم سے اس کو کوئی الفت نہ تھی حتیٰ کہ اس نے اپنی اولاد تک کو جاہل رکھا اور محل میں ان کی پرورش ہوتی رہی۔ اس کے قواعد و ضوابط جاسوسی کی سختی نے رعیت کے دلوں میں پڑھنے لکھنے سے نفرت پیدا کر دی تھی۔ لوگ نویسندوں کو چٹھی دینا تک ناپسند کرتے تھے۔ شاعروں، مورخوں، ادیبوں اور عالموں کی اس کے دربار میں آمد و رفت رہی۔ لیکن بادشاہ کو اس جماعت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ یہ لوگ اُسکے نزدیک دربار کی رونق اور نمائش و نمود کے سوا کسی مصرف کے نہ تھے۔ اسکا تجربہ

نکلا کہ آخر عہد علائی سے تعلیم یافتہ طبقہ کی تعداد گھٹنے لگی۔ اور عوام الناس میں تعلیم کا ذوق و شوق کم ہو گیا۔ علوم کی بے رواجی کے ساتھ ساتھ فارسی پر بھی زوال آگیا۔ تغلقوں نے کسی حد تک اس تنزل کی روک تھام کی۔ لیکن فیروز شاہ کی وفات پر کامل اندھیرا چھا گیا۔ فیروز شاہ کے جانشینوں خضر خانیوں۔ لودھیوں اور سوریوں کا زمانہ فارسی کے لئے نہایت بدفال تھا۔ بالخصوص پٹھانوں کا جو فارسی کے دشمن مطلق تھے شیر شاہی عہد کے پٹھانوں کے ذکر میں اخوند درویزہ اپنے مرشد سید علی ترمذی کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں:۔

"بحکم آنکہ جہل و بختی بر افغاناں غالب است تا ہر کہ بزبان فارسی نطق و تکلم کند او را دشمن میگیرند"۔

ان ایام میں دیسی زبانوں کی طرف عام توجہ ہو گئی تھی۔ مذہب و تصوف اور شاعری کا سب سے زیادہ چرچا تھا۔ برج، اودھی اور قنوجی کے بعض مشہور شاعر اسی زمانہ میں پیدا ہوئے۔ دنیا مذہب و تصوف کے پیچھے دیوانی ہو رہی تھی اور ہر قسم کے شیاد بشرطیکہ ان میں لسانی و طباعی موجود ہو ایک نیا فرقہ اور نیا مذہب بنانے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ مداری و جلالی فرقے۔ مہدویوں کی تحریک۔ کبیر پنتھی۔ دادو پنتھی۔ ستنامی اور نانک پنتھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ قصہ مختصر نئے مذہب بنے۔ نئے فرقے اٹھے اور تصوف پھلا پھولا۔ لیکن فارسی ہندوستان میں ٹھٹھر گئی۔

علمی لحاظ سے ان ایام میں اگر کوئی کام ہوا ہے تو یہ ہے کہ طبیبوں نے طب

یونانی کو ہندوستانی فضا کے مطابق ڈھالا۔ عربی و فارسی ادویہ کے اسما کو ہندی اسما کے ساتھ مطابقت دی۔ درحقیقت یہ ایک نہایت مفید کام تھا جو اس عصر کے اطبا نے کیا۔ اس کے ماسوا جیسا کہ دورِ تنزل میں دیکھا جاتا ہے۔ شرح نگار پیدا ہوئے اور اسی ضرورت نے فرہنگ نگاروں کی جماعت پیدا کی۔ یہاں چند الفاظ انہی لغات نگاروں کی بابت کہنا چاہتا ہوں:۔

ہندی فرہنگ نگاروں میں سب سے مقدم مولانا فخرالدین مبارک غزنوی قواس باکمال گزرے ہیں جو علاء الدین خلجی ۶۹۵ھ و ۷۱۵ھ کے عصر کے مشہور و معروف شاعر ہیں۔ ضیاءالدین برنی اور فرشتہ دونوں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ ہندوستان میں ان کا فرہنگ نامہ فارسی لغات کا سنگِ بنیاد ہے۔ ہماری نظر میں اس کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ فارسی الفاظ کی تشریح کرتے وقت بعض موقعوں پر مصنف نے ہندی الفاظ بالخصوص دواؤں اور دیگر اشیا کے نام بھی دے دئے ہیں۔ میں یہاں بعض الفاظ نقل کرتا ہوں:۔

اظفار الطیب کے لئے کہتے ہیں:۔

"ہندش وکہ ولہ گویند" دوسرے معنی لکھتے وقت کہا ہے: "بیارسی ناخن پریاں۔ ہندش نکھ نامند"

ابریسان کے واسطے کہتے ہیں:۔

"اہل ہند ایں بارش را سوانی نامند و آں ابتدائے زمستاں و انتہائے برشکال است"

پوسنو: مرغیکہ ہندش بھگراج گویند:
تاک: ہندش چیکا نامند:
چغوک: قبرہ یعنے مانور کہ بہندوی عترہ گویند!
کت: تخت ہندواں باشد میان بافتہ!
قاقلہ: سیاہ پہ در کہ ہندش نیری گویند:
ہفوش: چیزیست خوردنی کہ برنج تر کردہ میگویند در جامہ بستہ بالائے آب گرم
در آوندے مہر کردہ ومقدارے دراں سوراخ کردہ میدارند۔ از بخار آں
پختہ میشود۔ ہندش بھاکہ نامند۔ (منقول از مؤید الفضلاء)

مَیں انہی نمونوں پر اکتفا کرتا ہوں جن میں سے نصف آج ہم نہیں سمجھتے۔ مولانا کی تحریک اسقدر مبارک ہوئی کہ ان کی تقلید میں اور لوگوں نے بھی فرہنگیں لکھنی شروع کیں چنانچہ مولانا رفیع المعروف بہ حاجب خیرات نے ۷۴۳ھ میں دستور الافاضل اور ملا رشید برادر رجب جامع شرف نامہ منیری نے زفان گویا۔ قاضی بدرالدین محمد دہلوی نے ۸۲۲ھ میں ادات الفضلا۔ ۸۳۷ھ میں محمد بن داؤد شادی آبادی شارح خاقانی دانوری نے مفتاح الفضلا۔ مولانا ابراہیم بن قوام فاروقی نے رکن الدین باربک شاہ ۸۶۴ھ و ۸۷۹ھ کے زمانہ میں شرف نامہ منیری۔ مولانا محمود بن شیخ ضیا نے ۹۱۶ھ میں سکندر لودھی کے نام پر تحفۃ السعادت وغیرہ تصنیف و تالیف کیں۔ ان کے علاوہ طب حقائق الاشیا۔ قنیۃ الطالبین از قاضی شاہ۔ موائد الفوائد لسان الشعرا۔

نوادر الفضلا۔ لسان الشعرا بھی اہم تالیفات ہیں جن کے زمانوں اور مصنفین سے ہم ناواقف ہیں۔ ہماری دلچسپی کا سامان جوان فرہنگوں میں ہے یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مصنفین نے فارسی الفاظ کی شرح کے وقت ان کے ہندی مرادفات بھی دیدئے ہیں۔ اور یہ التزام قریب قریب تمام مصنفین نے کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ ان ایام میں ہندی کی طرف ایک عام رجحان ہو گیا تھا۔ وہ ہر غیر معمولی لفظ کا ہندی مرادف دیدیتے ہیں۔ اگر موجود نہیں ہے تو وضع کر لیتے ہیں۔ یہ عمل طبی تالیفات میں زیادہ تر مشاہدہ میں آتا ہے۔ میں اس کو کسی قدر واضح کرنا چاہتا ہوں۔ زبان کی ارتقائی تعمیر میں ایک اصول یہ بھی ہے کہ وہ دوسری زبان کے الفاظ کو یا تو بعینہٖ لے لیتی ہے۔ یا ان کا ترجمہ کر لیتی ہے۔ اس کی مثال میں لفظ "اذان الفار" ہم لیتے ہیں۔ اذان الفار ایک بوٹی ہے جس کے پتے زمین پر پھیلے ہوتے ہیں شاخیں باریک ہوتی ہیں۔ اور پتوں کی شکل چوہے کے کانوں کے مشابہ ہوتی ہے۔ اس مشابہت کو دیکھ کر حکما نے اس کا نام اذان الفار رکھدیا۔ فارسی والوں نے اس کا ترجمہ مرزنگوش کر لیا۔ فارسی میں مرزن چوہے کے معنی میں آتا ہے جب حکما کو ہندی میں اس لفظ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو انھوں نے وہی اصول اختیار کر کے اس کا ترجمہ "موساکنی" کر لیا۔ اب موساکنی جو سے پانسو سال پیشتر ہندی میں مستعمل ہو رہا تھا۔ متاخرین یا تو یہ ترجمہ بھول گئے یا کسی اور مصلحت کے زیر اثر موساکنی کو میچ مرکنی کہنے لگے۔ اسی طرح اظفار الطیب ہے جسے فارسی میں ناخن پریاں اور ہندی میں چنڈیہ کھر اور نکھ کہتے

ہیں۔ یہاں ناخن کی رعایت تینوں زبانوں میں موجود ہے اسی قیاس پر بصاق القمر کا ہندی
ترجمہ "چندر کانت" کیا گیا۔ بصاق لعاب، کف دہن کو کہتے ہیں۔ کانت کے معنے مجھے
معلوم نہیں لیکن قیاس چاہتا ہے کہ بصاق کا ہم معنی ہوگا۔ اسی قیاس پر "منزو گربہ"
اور "حادر گربہ" کا ترجمہ "بلائی لوٹن" اور "بلی لوٹن" کیا گیا ہے۔ زبد البحر فارسی میں کف
دریا، ہندی میں سمندر پھین اور پنجابی میں سمندر جھگ اسی اصول پر مبنی ہے۔ اس
قسم کی بیسیوں اور مثالیں بتائی جا سکتی ہیں۔

یہ امر یاد رہے کہ یہ فرہنگ نگار جس چیز کو ہندی کہتے ہیں وہ نہ برج ہے نہ پنجابی۔
نہ راجستانی اور نہ بنگالی و گجراتی۔ ہندی سے ان کی مراد یہی اردو ہے۔ جو اس عہد کے
مسلمانوں میں بالعموم رائج تھی۔ اس نے ان بعیدہ ملکوں میں بھی اس قدر ترقی اور وسعت
اختیار کر لی تھی کہ پنجاب، بنگالہ، گجرات اور ہندوستان میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی
تھی۔ اس کی دلیل ہمارے پاس یہ ہے۔ کہ مذکورہ بالا فرہنگ نویس باوجودیکہ مختلف
مقامات ہند سے تعلق رکھتے ہیں۔ کوئی مالوہ کا ہے۔ کوئی بنگالہ کا۔ اور کوئی پنجاب کا
جہاں مختلف زبانیں بولی جا رہی ہیں۔ اور ان لوگوں کا اپنے اپنے وطن کی زبانوں سے
واقف ہونا بھی لازمی ہے۔ لیکن اپنے لغات میں وہ وطنی زبانوں کے الفاظ نہیں دیتے
بلکہ اسی عام زبان کے جو تمام ملک کے مسلمانوں میں مشترک ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ
یہ الفاظ ان تمام لغات میں عام ہیں۔ یہ خیال نہ کیا جائے۔ کہ چونکہ فرہنگ نویس ایک
دوسرے سے نقل کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ الفاظ ان لغات میں عام

ہو گئے ہیں۔ اس خیال کی تردید نہایت آسانی سے کی جا سکتی ہے۔

ان ہندی الفاظ کے ذخیرہ میں بعض ایسے الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ جو اگرچہ اصلاً فارسی ہیں۔ لیکن فارسی والوں نے ان کو متروک قرار دیدیا ہے۔ مگر چونکہ اردو میں برابر استعمال ہوتے رہے ہیں۔ اس لئے فارسی خوانوں نے انکا شمار ہندی الفاظ میں کر لیا ہے۔ یا بعض وجوہ سے ہندی میں انھوں نے دوسرے معنی پیدا کر لئے ہیں۔ بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو فارسی خوانوں نے ہندوستان میں ایجاد کئے۔ لیکن فصحا نے ان کو تسلیم نہیں کیا۔ اور فارسی سے خارج کر دیے گئے۔ مگر چونکہ عام رواج میں تھے اس لئے انھیں ہندی تسلیم کر لیا گیا۔ یہاں چند مثالیں دی جاتی ہیں:۔

انگشتانہ لازمی طور پر فارسی لفظ ہے۔ جو انگشتوانہ سے بنا ہوگا۔ وہ لوہے کی ایک ٹوپی ہے جس کو درزی سوئی کے زخم سے محفوظ رہنے کی خاطر سیتے وقت انگلی میں پہن لیا کرتے ہیں۔ ایرانیوں نے اس کے لئے اور لفظ وضع کر لئے۔ مثلاً "انگشت دان" اور "آہن آشیان" وغیرہ۔ اب آخری لفظ کی تشریح میں صاحب مؤید الفضلا کہتے ہیں۔

"در ہندی انگشتانہ گویند"

ظاہر ہے کہ اس ہندی سے مصنف کی مراد بھاشا دادھی زبانیں وغیرہ نہیں ہیں۔ بلکہ اردو جس کا قدیم نام ہندی ہے گویا اردو بولنے والوں میں یہ لفظ اس کثرت کے ساتھ استعمال ہو رہا تھا کہ فارسی خوانوں نے اس کو ہندی تسلیم کر لیا۔

لفظ "کماس" کی شرح میں مصنف مذکور کہتے ہیں:۔

"کوزہ گرد و پہن بر مثال کشتی از چوب و سفال و جز آں کہ بر بغل آویزند۔ اکثر

درویشاں و نسباناں دارند"۔

وہ اس تشریح پر قناعت نہیں کرتے بلکہ آخر میں اضافہ کرتے ہیں کہ:۔

"اہل ہند آنرا کچکول گویند"۔

ہم جانتے ہیں کہ کچکول فارسی لفظ ہے۔ وہ فارسی میں جب بھی مستعمل تھا اور اب بھی لیکن چونکہ کچکول ان کے زمانہ میں اردو بولنے والے کثرت سے استعمال کرتے تھے اس لئے انہوں نے اس کو اردو کا لفظ مان لیا:۔

یہی مصنف "بارگیر" کے معنے بیان کرتے وقت کہتے ہیں:۔

"در قینۃ الطالبین بمعنے ہودج است کہ آنرا عماری نیز گویند و ہند انباری"

عماری عربی لفظ ہے۔ جاہلوں نے بگاڑ کر اس کا انباڑی بنالیا اردو میں آج بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے:۔

ایک اور لفظ "قلاب" کی شرح میں تحریر کرتے ہیں:۔

"کنیزک۔ ہندش بندہ گویند"۔

مصنف موصوف بددل کے معنے ہندی میں "کاہل" بتاتے ہیں حالانکہ کاہل عربی میں سست کے معنی دیتا ہے لیکن اردو میں وہ بزدل اور نامرد کے مفہوم میں آنے لگا۔ اس کی تائید دکنی ادبیات سے ہوتی ہے۔ جس میں کاہل فی الواقع

بزدل کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ محمد امین دکنی:۔

توہم اک باگ کو ماریں بہ دس جل　　　　ہموں کو کیا تمھیں لو جیسے ہو کاہل

صاحب موید الفضلا خیزران کے ذکر میں لکھتے ہیں:۔

"چوبے ست ہندش بیت گویند۔"

بیت در حقیقت فارسی بیدہ کی بگڑی شکل ہے جس طرح بلیدہ سے اور ملدہ سے مدنت بنے ہیں غلطی اہل الفاظ روپاک ہے۔ جیسے اردو میں رومال کہتے ہیں اس لفظ کی ترکیب فارسی ہے مگر ایرانی اسے تسلیم نہیں کرتے۔ یہی حالت ننگی کی ہے۔

اب جس زبان میں انگشتوانہ کو انگشتانہ۔ کاس کو کچکول۔ عماری کو انباڑی۔ روپاک کو رومال۔ کنیز کو بردہ۔ خیزران کو بینت۔ پلیدہ کو پلیت۔ مدکو مدت۔ اور ننگ کو ننگی کہا جاتا ہے۔ اردو کے سوا وہ کوئی اور زبان نہیں ہو سکتی اس لئے یہ بھی یقین کر لینا چاہئے کہ اردو ان ایام میں موجود تھی۔ اور ہندوستان کے ہر صوبہ میں جہاں جہاں مسلمانی اثرات تھے بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اور تغلقوں کے دور سے بیشتر ہی مکمل ہو کر ایک حالت پر قائم ہو گئی تھی۔ سیدوں اور پٹھانوں کے دور میں جب دیسی زبانوں میں شاعری کا چرچا ہوا۔ اردو میں بھی گجرات و دکن میں شاعری شروع ہو گئی۔ ان ایام میں جو اس زبان کی ترقی کی رفتار دیکھی جاتی ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ اگر مغلوں کا حملہ ہندوستان میں خلل انداز نہ ہوتا تو وہ بہت جلد سرکاری اور درباری زبان بن جاتی اور اس میں تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ جیسا کہ دکن و گجرات میں دیکھا جاتا ہے۔ شروع ہو جاتا

لیکن مغلوں کی آمد نے اس زبان کی بڑھتی امیدوں کو ڈھائی صدی کے لیے ملتوی کر دیا۔ ایرانی عنصر جو امرا اور عمال کی صورت میں پھیل گیا۔ اس نے ایک مرتبہ اور فارسی کے ٹمٹماتے چراغ کی بتی اکسا دی اور تیل ڈال دیا۔ اور ملک میں ایک مرتبہ اور فارسی کا دور دورہ ہو گیا۔

میں یہاں مذکورۂ بالا لغات سے ان ہندی الفاظ کے نمونے سپرد قلم کرتا ہوں۔ لیکن یہ یاد رہے۔ کہ میں نے ان کتابوں کو شرف نامۂ احمد منیری کے سوا بچشم خود نہیں دیکھا ہے۔ کیونکہ یہ تمام کتابیں قلمی اور نایاب ہیں۔ اور اسلاف کے ذہنی و عملی کارناموں سے ہماری بے خبری ایک ایسا پردرد افسانہ ہے۔ جس کے دہرانے کی مجھ کو یہاں فرصت نہیں۔ ملک میں ایک بھی کام کا کتب خانہ نہیں۔ ہمارے محترم معاصر جب کہ لاکھوں روپیہ انگریزی کتب خانوں کے بنانے میں صرف کر دیتے ہیں۔ مشرقی کتابوں اور مشرقی کتب خانوں پر ایک پیسہ خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ جن بزرگوں کے ہاں بدبختی سے یہ کتابیں مقید ہو گئی ہیں۔ وہ زر و زاری کی پروا نہیں کرتے۔ اور ان کے دکھانے تک کے روادار نہیں۔ نہ خود ان سے فائدہ اٹھانے کے اہل ہیں اور نہ دوسروں کو ان سے افادہ کا موقع دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ہمارے بزرگوں کی یادگار ہیں۔ لیکن جس مجرمانہ غفلت سے بزرگوں کی یہ یادگاریں رکھی جاتی ہیں۔ ناگفتہ بہ ہے دیمک اور چوہے ان کو چاٹ جاتے ہیں۔ اور جب وہ چیزیں دنیا کے کسی مصرف کی نہیں رہتیں۔ کنوؤں میں پھینک دی جاتی ہیں۔ دریاؤں میں بہا دی جاتی ہیں۔ یا نذر آتش کی جاتی ہیں اور یہ

آخری حشر ہونا ہے ان بزرگوں کی یادگاروں کا۔ خدا رحم کرے ہماری اس جہالت پر جس کے طفیل ہزاروں نسخے سالانہ برباد ہو رہے ہیں؛

اگرچہ اصل لغات میری نظر سے نہیں گذرے ہیں۔ لیکن کتاب مؤید الفضلا ۹۲۵ھ جس کو نولکشور نے چھاپ دیا ہے۔ میرے زیر نظر ہے۔ اسی کی سند پر میں نے فرہنگ نامۂ قواس کے بعض الفاظ گذشتہ سطور میں نقل کیے ہیں۔ اور اسی کی سند پر اداۃ الفضلا۔ زفان گویا اور قنیۃ الطالبین سے استفادہ کیا ہے۔ شرف نامۂ احمد منیری اور ریاض الادویہ سے براہ راست استفادہ کیا ہے۔ لیکن مجھ کو شبہ ہے۔ کہ مؤید الفضلا میں کسی غیر مصنف نے ہندی الفاظ کی قدیم شکلوں کو بدل کر موجودہ یا اس کی قریب شکلوں میں لکھ دیا ہے۔ مثلاً گھرگیت کا گرگٹ یا گکھری کا ککڑی بنا دیا ہے۔

اداۃ الفضلا از قاضی بدرالدین دہلوی تالیف ۸۲۲ھ

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
اسکوب	چھت	آفتاب پرست	گھرگیت
ادیخ	لہسورہ	آزخ	ماسہ
ابد	بھالی	آونگ	علگنی
اداث	مور	تابول	تنبول
تخم کتاں	السی	تلی	بھانڈی
دراسے	گھنٹی		

زفان گویا از مصنفات ملا رشید پدر ابراہیم برادر رشید جامع شرف نامۂ منیری ؛

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
آہن ربا	کانک	ارنب	بہیین	اظفار الطیب	جٹھیہ کھر
اسرب	سیسا	آبرود	باچھڑ	آس	مورلر
استرش	پھال	تختۂ استرش	رل	بادبر	بھرکی
بوق	بھبر	بادرو	بہری	پیازک	لونہ
پرنگ	پنیل	پالاذان	ہانکہ	پنجپایہ	کیکرہ
جوزبوا	جاپہل	جہبلیں	اونٹنی	پھندہ	ڈھیلی
جارمغز	اکروٹ	چکاچک	چکر	حرزدلن	سنکہ
خیارچنبر	باندرلری	خرچکوک	بھنٹیل وبکری	درخت سغتہ	بھنورہ

قلمۂ الطالبین قاضی شنہ این باب

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
اسیبب	دہکہ	اسفاناخ	پالک	الہد	بندی
انجارہ	ساجی وکھار	انبیر	سنداسی	اہل	ہوبیر کنکول مرچ
ام غیلان	جونسہ	اسفان	نرمژا	آذرگول	سورج مکھی
اویش	سانتہ	بحلب	پیٹھا کھندہ	نج	بنج دہانورہ
بوزیجار	تکہ وبکہ	بیدانجیر	ارند	بادرنگ	بادبھرنگ

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
باطن (کذا)	سہجنہ	بلطان	چرالائی	بیبل	بلیس و مرچ
بوچل	سپاری	بابدام	باسی	برازده	بیرا
تغاره	کھترہ	تختہ گردی	شوبھونیر (بھوا)	تنجب کافور	کاکڑا سنگی
جمرج	جاکلا	جبود	تمارخ	جاڑہ غوک	کائی
جحده	بھنکرہ	جبہ	جگ دریب	جنبہ	کتاری
چتپیره	پچنچنہ	خلد چرب	کردال	خراد	کویل
خر	گدھا	خنزیر	بھوبعل	خرفہ	نکمہ بھونری
خربق	سرسوں	خار مغیلاں	لگر	دابل	ہلہلہ
دولمہ	ٹٹو یکھورہ	دبہ	کوپا	۔	۔

شرفِ نامۂ احمد منیری ۸۶۴ھ و ۸۷۹ھ از ابراہیم قوام فاروقی

یہ کتاب قنیۃ الطالبین مذکورۂ صدر سے اقدم ہے۔ اس کے مؤلف مولانا ابراہیم فاروقی بنگالہ کے رہنے والے ہیں۔ اس فرہنگ کی تالیف میں انھوں نے زفان گویا۔ اداۃ الفضلا۔ فوائد الفضلا۔ اصطلاحات شعر۔ لسان الشعرا۔ لغت فرس اسدی۔ موائد الفواد۔ صحاح۔ تاج الاسلامی۔ تبیان عجائب البر و البحر۔ عجائب بلدان۔ تاریخ طبری۔ تحفۃ العراقین۔ رسالۃ التعبیر۔ برمک نامہ۔ روضۃ الانوار۔ نفحۃ الریحان۔ فاتحۃ القلوب۔ دیوان الادب۔ اجمال حسینی وغیرہ

سے امداد کی ہے۔ اس کے علاوہ زندہ لوگوں سے بھی استفادہ کیا ہے مثلاً امیر زین الدین ہروی المخاطب بہ فتح خان جو اس عہد میں ملک الشعرائے بنگالہ تھے۔ اور محمد شیرازی اور شیخ واحدی وغیرہ:-

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
آسا	جھنجھوائی	آہن ربا	چمبک	الوا	گھوکنوا
ابلس	دبکہ	آفتاب پرست	گھراگیت	آہن جفت	بھالہ
اردی بہشت	چیت	اترنج	اسورہ	آزرخ	مسّا
اسپاناخ	پالک	انگزد انگوزہ	ہینگ	اشترخوار	جواسہ
اکار (باغبان)	کوبری	آبکنہ	چونہ	اشترنگ	لکھمنان
آونگ	لٹکنی	ارزن	چینہ	دنستہ	مونہہ
بنانج	سدکن	بادبرہ بادفرہ	نشوہ	بلادر	بھلاوہ
بندش	گالہ	بوماش	منک	بنلغ	گگھری
برگ (بیستان)	جلیبی	بساگ	سہرو (سہرا)	بورک	کھنکھنی
بہرک	کرہ (گرہ)	بشنگ	نہالی	بان	سہجنہ
بکران	گھرچلنی (گھرجن)	باخہ	کچھوا (کچھوام)	تنکہ	گمن
پنج پایک	کنگرہ	پنگان	تھال	پاتلہ	کڑاہی
پلہ	پلاس	بیچہ البلابہ عنقنفہ	اکاس بیل	تختہ بند	پھٹی

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
تنتریک	ممولا	تورک	لولی	تسمہ	پاتی
تشتی	ساہی	جامہ غوک	سوال	جوال	لمن (گون؟)
جالی	ہیلو	چغندر	گانگو	چارمغز	اکھروٹ
جلانک	کیرورہ	چوبچین	اونتی	چچہ یہ	بلائی
جغانہ	سرمنڈلی	چچہ	بیلن	خاکستر	راکھ
خشکانار	جلندھر	خربوز	گادر	خردوک	کیرورہ
خیک	پکھال	خردل	رائی	خفتان	انگہ (انگا)
خرزہرہ	کنیر	خرفہ	لونگ	خرہ	کھمل
وردک	گرہی (گرہ)	دولنگ	دسابل	درخت سنبہ	کھتورا
دغدغہ	گدگدی (گدگی)	دبوچہ	جوک	درابہ	گھانتی
روناس	مجیٹھ	راسو	نیول	رشاشہ	بھوبھوی
ردے	بھنکار	زرنٹ	جوار	زرنباد	کچور
زغبر	اسی	زاک	پھٹکری (پھٹکری)	زغنک	بجلی
زلہ	جھیکہ	نوالہ	پیرو	سرتیج	کھالہ
سنج	گجھالہ	سراغوچ	گونجی	سربند	سوال
سوسمار	گوہ	سلبکہ	گھٹن	سنبل	جھر

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
سندان	نہالی	سارہ	رسوت	سفتہ	ہندی
شکرہ	کلوزن	سفلی	کڑاہی	شبہ تاب	جگنی
شنبلیت	میتھی	شکنج	بدھ	شود	شعلی
شب بارہ	جواسہ	شمار	ساجی	شخک	ہچکی
شیردان	کھیری	تتمہ	بلائی	طلق	ابھر
غلیج	کرکٹ، گدگدی	عشک	اودوس	غنک	لانھ
فلہ	پیوسی	قولنج	باسور	قرامنہ (فلاوز)	پچکی
قرصک	برسولہ	کیبلا	کھیلا	کن	کھٹ (کھاٹ)
کشک انجیر	گولہ	کنار	بیر	کشنیز	دھنیہ
کاغ	جکال	کاکل	کانس	کان	کھان
کلتبین	سنداسی	کاتربرہ	کرر	کامہ (تبسد)	سوالی
کلادہ	اتی	غلولہ (حلوی)	لدوپندی	کلونہ	گونیجی
کلوندہ	نگدری	کمان گریہ	غول (غلبل)	کورہ	بھنتی
کوفتہ	بلہری	کامنی	کسنی	گولانج (حلوی)	لاپیہ
کندر	گاجر	گز	جھاؤ	گوشخارک	گنلالی
گردول	گدری	کبیرہ	جکری	لہفدت	گذمی

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
اسقبل	کندا	اسارون	بنڈکو	اشلان	مورسوکھا
اشنہ	چلوہ	اجمودہ	جوائن	اسمانہ	چھمنہ
املہ	آنولہ	اسپارنہ	تالو	افجہ	دھوکہ
ایلہ انہ	ایلاچی۔الاچی	امرع	ہیرادکھی رنگیات	افرع	گنجہ
انبارغ	سوکن	آک	آک۔مدار	اکلیل الملک	اسپرک۔گھموی
اکس	سکاوسیسہ	اراک	پیلو	انارشنک	ناگیسر
انجرک	مروا	انجلگ	کھبلا	اربیان	چھینگا(مچھلی)
اشنان	چوکہ	امبو	چھوہارا	انگور سیاہ	کالی داکھ
اشترشبہ	چھپینگ	الوسیہ	جامن	انستہ	موتھہ
آہنجہ	ہاتھ	انیجرہ	انگلی کے بیچ	بارنب	موبیا
بابونج	ایرم سار پھلی	بازنج	پٹینگہ	بخار	بھاپ
بازیار	کسان	بلادر	بھلانواں	بزیار	جاوتری
بندش	گالہ	بنوماش	مونگ	بساک	سہرہ
بکوک	چیچہ	ببانگ	گوندہ	بشنک	نہائی
باورنگ	رام طسی	بلدل	کاہل	برہمن	مونیا کا ساگ
بلکھان	کلتھی	بیخ سول	ملٹھی جلیٹھی	بروزن	بازرہ

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
باقلہ	باکلہ	ہلیلہ	بہیڑہ	بوبیہ	دونامروا
بوی	گندہ	بھارنگی	سونڈہاکھر	تنبک	گھمن
باتلہ	کراہی	باخرہ	ادنبہ	پشہ خانہ	کھٹ چھپر مسہری
تنگار	سہاگا	تبر	کری	ترنزک	ممولہ
تساتیزک	بالم چند سور	تورزک	لوبیا	تقویم	پترہ
تشمہ	بابتی	تالکی	دھنیہ	ثغاء	راتی
جدجد	جھینگر	جلبیہ	جمدھر	جوخا	گنتھا
		چقندر	گنگلو		

ریاض الادویہ ۱۲۷۶ھ از حکیم یوسفی۔

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
ابل	اونٹ	شغال	سیال	راسو	نول
سرب	سکہ	اترج	بجورہ	سرگین گاو	گوبر
اذخر	گندھیل	نسیج العنکبوت	مکڑی کا جالا	برنج	چاول
خرگوش	کرمہ	آزاد درخت	درخت نیم	اسفاناج	پالک
آس	مورپوں	آلک	جھلرہ	اظفار الطیب	نکھ
اشنان	لانی	املج	آنولہ	انبہ	انب

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
بذر کرفس	اجمود	بذر الفرفخ	لونیہ کا بیج	بذر الجزر	گاجر کا بیج
بذر القثد	کھیرے کا بیج	تخم خیار	ککڑی کا بیج	بذر الریحان	تلسی کا بیج
بذر الشبت	سوئے کے بیج	بسد	مونگا	بستان افروز	کلگا
بسباسہ	جیوتری	ہندوانہ	کلندہ	بلیلج	بہیڑہ
بلادر	بھلاوہ	بندق	ریٹھہ	بیض	انڈہ
تربد	نسوت	تمر ہندی	املی	تونبیائے ہندی	ہریا تھوتھہ
پستان	چوچک	ثوم	لسن	جاورس	کنگنی
جدوار	نربسی	ملح	نمدی	جذر	گاجر
جزمازج	مائیں	جوز بوا	جعفل	جوز الماثل	دھتورا
جوز القی	بن پھل	حب النیل	عشق پیچاں کا بیج سمندر سوکا	حب القطن	بنولہ
حب الملوک	جمال گوٹہ	خارخسک	گوکھرو	حضض	بنکرہ
حلبہ	میتھی	انگوزہ	ہینگ	نخود	چنا
حمام (کبوتر)	پریوہ	حمار	گدھا	حنظل	تمان
حنا	مہندی	گندم	گیہوں	خبازی	سونچل کا بیج
خبز	روٹی	خروع	ارنڈ	خراطین	کیچوہ
خشاش	چمگودری	خیار	کھیرا	خیارزہ	کھنکھری
بذر البنج	خراسانی اجوائن	بذر الفجل	مولی کا بیج	بذر الکتان	السی کا بیج

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
دارچینی	تج	ماکیان	کوکڑی	دخان	دھواں
خون	لوہو	روغن کنجد	میٹھا تیل	مگس	ماکھی
طلا	سونا	بادیان	سونف	رازیانج	رال
مسکہ	مکھن	زرنیخ	ہڑتال	زرنب	سینتی
زعفران	کیسر	زنجبیل	سونٹھ	سیماب	پارہ
ساذج	پترج	ساج	سال	سپستان	لسوڑہ
کوکنارہ	ببر	سرطان	کیکڑہ	سعد	موتھہ
سلخ الحیہ	کانچلی	سنگ پشت	کچھوا	ماہی	مچھری
سنبل الطیب	بچھر	گربہ	بلائی	موی	بال
شونیز	کلونجی	صدف	سیپ	صمغ	گوند
صندل ابیض	اوجلا چندن	صندل احمر	رکت چندن	پسخول	سیبہ
غوک	مینڈکی	طاؤس	مور	طباشیر	بنسلوچن
سپرز	تلی	سم بز	بھیڑ بکری کے کھر	عدس	مسور
کنجشک	چڑیہ	عظم	ہاڈ	عفص (مازو)	ماجو پھل
عقرب	بچھو۔ انھومہ	عنب الثعلب	مکو	عود	اگر
غزال	ہرن	فاختہ	فندکی	موش	چوہیہ (چوہا)

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
ترب	مولی	فصہ	رنبا	تخم کرفس	اجمود
فلفل اسود	مرچ	فوفل	سپاری	فوہ	مجیٹھ
فیل	ہاتھی	قاقلہ	الاچی	قرنفل	لونگ
قسط	کٹھ	نیشکر	گنّا	قصب	بانس
قطن	روئی	زاک زرد	کاہی	قلط	کالنہ، مونڈھ
اشخار	ساجی	خارپشت	جنگلی چوہا	کبریت	گندھک
جگر	کلیجا	کرفس	اجمود، کلاوہ	کراث	گند
کرکی	کونج	کرک	گینڈا	کرش	اوجھڑی
کشنیز	دھنیا	کلیہ (گردہ)	بوکہ	کہربا	کپورہ
شیر	دودھ	گوشت	ماس	قوچ	مینڈھا
مروارید	موتی	الماس	ہیرا	آب	پانی
مرزنجوش	مروہ	زہرہ	پت	مقل ازرق	کوگل
نمک	لون	موز	کیلا	جوز ہندی	ناریل چلپری
نخالہ	بھوس، بور	نمل	چیتی، چلینہ	نیلوفر	کنول پھول
		ورد	پھول		

پنجاب میں اُردُو

"پنجاب میں اُردو" اردو زبان کی تاریخ میں ایک نیا باب ہے جس کا اب تک کسی نے مطالعہ نہیں کیا ہے خود اہل پنجاب بھی عموماً اس سے بے خبر ہیں۔ اور اسی ناواقفیت کی بنا پر فی زمانا پنجاب میں یہ عقیدہ لوگوں کے دلوں میں قبولیت حاصل کر رہا ہے۔ کہ پنجاب پر اردو کا کوئی حق نہیں ہے۔ سکھ گردی کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور آیا۔ کمپنی کے انگریزی اور ہندوستانی عہدہ داروں نے اس اجنبی زبان کو مدارس و دفاتر میں داخل کر کے رواج دے دیا۔ یہ رائے ان نوجوانوں کی ہے جن میں اور اوصاف کے علاوہ وطن پرستی کے جذبات بیدار ہیں۔ یہ خیال کس حد تک غلط ہے۔ اوراق آئندہ کے مطالعہ سے کافی واضح ہو جائیگا:

حقیقت یہ ہے کہ اردو جس طرح ہندوستان کے اور صوبوں میں اسی طرح پنجاب میں برابر بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے۔ پنجاب سلطنت اسلامی کا ایک جزو تھا۔ اور سلطنت کا صوبہ ہونے کی حیثیت سے اردو کو یہاں اسی قدر دخل حاصل تھا۔ جیسا سلطنت کے اور صوبوں میں۔ قدیم زمانہ سے یہ زبان اس صوبہ میں کم و بیش رائج رہی ہے:

اردو کے لئے اہل پنجاب کی طبعی مناسبت اور قدیم اردو پر پنجاب کا اثر دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اردو پنجاب کے کسی خطےّ یا ضلع کی زبان تھی۔ اس سوال کا کوئی قطعی جواب ہمارے پاس موجود نہیں۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ پنجابی اور اردو میں ہندوستان کی دیگر زبانوں کے

مقابلہ میں قریب ترین مماثلت موجود ہے۔ اُن کی صرف و نحو اہم قواعد و مسائل میں باہم مطابق ہے۔ اور ساٹھ فی صدی سے زیادہ الفاظ ان میں مشترک ہیں۔ مزید برآں جن امور میں یہ زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں ہمیں اضافت کو بھی محسوب کرنا چاہیے۔ مثلاً اردو کی اضافت "کا۔ کے اور کی" کے بجائے پنجابی میں "دا۔ دے اور دی" آتا ہے۔ اگرچہ تصریف میں دونوں زبانیں متفق ہیں۔ گویا کاف اردو کے ساتھ اور دال پنجابی کے ساتھ مخصوص ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اردو کی اضافت ایک زمانہ میں پنجاب میں رائج تھی۔ اس کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم دستاویز موجود نہیں۔ لیکن جب ہم پنجاب کے دیہات و قصبات پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بیسیوں موضعوں اور قصبوں کے نام کے ساتھ وہ جزو کلمہ بن رہی ہے۔ مثلاً ڈسکا، فاتح کا، امرو کا، نمبر کا، ٹھٹھہ کا، وریہ کا، جلکے، جنڈ کے، کھانکے، کالے کے، کامون کے، ہجن کے، ہیوکے، باجھی کے، منجھ کے، مریدکے، سادھو کے، دھرکے، جیجے کی ملیاں، تتہ مو کی، دور کی، پنڈ کی، تار کی، خان کی، جھام کی، کیمو کی، رحیم کی جوہڑی وغیرہ۔

اس قسم کے نام پنجاب میں کثرت کے ساتھ ملتے ہیں۔ یہ امر ظاہر ہے کہ جس تیزی سے زبان بدلتی ہے۔ اس تیزی کے ساتھ ملک کے جغرافیائی نام نہیں بدلا کرتے۔ اس لئے ان مقامات کے ساتھ اردو کی اضافت کا موجود ہونا۔ اس امر کی دلیل ہے۔ کہ یہ اضافات پنجاب میں قدیم الایام سے ہیں۔ اور ایک وقت استعمال میں آ رہی تھیں۔ لیکن جب موجودہ پنجابی کی لہر آ کر ملک پر چھا گئی۔ پرانی زبان کا شیرازہ بکھر گیا۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ اضافات

نہ صرف جغرافیائی اسماء میں ملتی ہیں بلکہ اور الفاظ میں بھی موجود ہیں مثلاً پیکا = باپ کا گھر اس کا مرادف پیکا جس کی ترکیب بھی وہی ہے ۔ اردو میں مستعمل ہے ۔ نانکا = ننھیال، دادکا = ددھیال ۔ ان میں تصریف بھی ہوتی ہے ۔ یعنی پیکے ، نانکے ، دادکے ۔

ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم اردو زیادہ تر پنجابی اثرات میں ہے ۔ یعنی آج جن باتوں کی تشریح سے اردو عاجز ہے ، پنجابی زبان آسانی کے ساتھ ان کی تشریح کر سکتی ہے ، اس قسم کی متعدد مثالیں گزشتہ اوراق میں دی جا چکی ہیں ۔ یہاں ایک اور مثال دیتا ہوں ۔

رسالہ معراج العاشقین مولانا عبدالحق صاحب بی ۔ اے ، آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو نے تاج اردوئے قدیم میں شائع کیا ہے ۔ یہ رسالہ حضرت صدرالدین سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز متوفی ۸۲۵ھ کی طرف منسوب ہے ۔ اور اردو کا غالباً قدیم ترین نمونہ ہے ۔ اس رسالہ میں ایک فقرہ آتا ہے :-

"دوسرا تن ممکن الوجود ۔ اس کا نگہبان امر غیبی ، نفس لوامہ ، حواس خمسہ ممکن کی آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو ، غفلت کے کان سوں غیر نہ سننا سو ۔ وسواس کے نک سوں بدبوئی نہ لینا سو ۔ بخلی کی زبان سوں غیر نہ بولنا سو ۔ مغروری کی شہوت کوں غیر جاگا نہ دوڑانا سو ۔ غفلت ہور غضب ان پانچ خواص کا مراقبہ کرنا ۔ پیر کے ممکن کا مشاہدہ قائم کرنا ۔ ذکر قلبی کہ شریعت کے کانسے میں بلایا ۔"

اس فقرہ میں مصادر کے آخر میں سو کا استعمال نہایت عجیب ہے اور اردو زبان اس کی تشریح سے قاصر ہے ۔ اب اسی "سو" کا استعمال پنجابی میں آج بھی موجود ہے ۔

جو ضمیر غائب کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ مثلاً "جاناسو" = اسے جانا (ہے)۔ "کیتوسو"
اس نے کیا ہے ایسی مفہوم مذکورۂ بالا فقرہ میں ہے۔ ان امور سے ظاہر ہے۔ کہ
پنجابی اور اردو کے تعلقات ایک دوسرے کے ساتھ بہت گہرے ہیں؛

شمالی ہندوستان میں جس میں دہلی بھی شامل ہے۔ اردو کی قلمی یادگاریں گیارھویں
صدی ہجری سے زیادہ قدیم نہیں ملتیں۔ اور تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ پنجاب میں بھی
اسی صدی سے تالیفات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پنجاب میں مولانا عبدی کی
تصنیف رسالۂ فقہ ہندی سب سے قدیم ہے۔ جو [illegible]ھ میں بعہد اورنگ زیب عالمگیر
لکھا جاتا ہے۔ عبدی کی تحریک ہمارا خیال ہے برابر جاری رہی ہے۔ لیکن محمد شاہی
دور تک کسی اور تالیف کا سراغ نہیں چلتا۔ ان ایام میں قصبہ بٹالہ میں شیخ محمد فاضل الدین
کے ہاتھوں اس تحریک کو بہت تقویت ملتی ہے۔ ان کے فرزند غلام قادر مثنوی
رمز العشق کے مصنف ہیں۔ صوفی حلقوں میں یہ مثنوی بہت مقبول رہی ہے۔ نہ صرف
اس کی شرح لکھی گئی ہے۔ بلکہ اس کی تقلید میں فقیر اللہ مثنوی در مکنون ۱۲۰۴ھ میں لکھتے
ہیں۔ اور میاں نور محمد المعروف بہ میاں بھبیل ولد میاں نتھو مثنوی فتح الرمز ۱۲۵۰ھ میں
تصنیف کرتے ہیں؛

ریختہ کی طرز کی نظموں میں سب سے قدیم ریختہ شیخ فرید الدین گنج شکر متوفی ۶۶۴ھ
کی طرف منسوب ہے۔ علاوہ بریں ان کے بعض اردو فقرے بھی ملتے ہیں۔ ان کے
بعد شیخ عثمان اور شیخ جنید اور منشی ولی رام کے ریختوں کی باری آتی ہے جو گیارھویں

صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ بارھویں صدی ہجری کی متفرق نظموں میں زیادہ تر صوفیانہ نظمیں داخل ہیں۔ جن میں سے اکثر حضرت غوث الاعظمؒ کی شان میں ہیں۔ ایسی نظمیں چونکہ کثیر تعداد میں ملتی ہیں۔ اس لیے میں نے صرف چند انتخاب کرلی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان زیادہ تر خانقاہ نشینوں کی گود میں پلی ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان بزرگوں کا تعلق زیادہ تر عوام الناس سے تھا۔ دیسی اور بدیسی ان سے فیض کے طالب تھے۔ لوگ دور دور سے اپنی مرادیں لے کر ان کے پاس جاتے تھے۔ اس لیے ملکی زبان کا جاننا اس میں بات چیت کرنا ان کے لیے ضروری تھا۔ دوسرے صوفی پیشہ لوگ اکثر سیاح اور جہانگرد ہوا کرتے ہیں۔ اور اردو ان ایام میں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بولی جاتی تھی۔ اس لیے سیاحوں صوفیوں اور سپاہیوں کے لیے اس زبان کا جاننا ازبس ضروری تھا:

دیکھا جاتا ہے کہ یہ نظمیں اکثر اوقات الم خیز اور فریادمندانہ ہیں اور مصرع

سنو پکار دکھی کی ایا شہ جیلاں

کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ ان زبانوں کے سیاسی انقلابات میں مضمر ہے جو پنجاب میں رونما ہو رہے تھے۔ ان کے اوزان بسا اوقات ہندی ہیں یا ایسے ہیں جو قدیم سے ہندی خوانوں نے فارسی سے لے لیے ہیں۔ قافیہ ان میں چنداں ضروری نہیں ہے۔ اور مربع و مخمس کی شکل میں ہیں:

تغزل۔ دہلی مرکز کے قیام کے بعد پنجاب میں دیر سے پہنچتا ہے جس کے اثر

ہیں فارسی بحور و جذبات پنجاب کی نظموں میں روشناس ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایہام گوئی
جس پر دہلی کی ابتدائی شاعری کا دار و مدار تھا۔ یہاں کبھی کامیاب نہیں ہوئی پنجاب
نے اپنے ادبی تعلقات دہلی و دکن سے سیاسی مصائب کے باوجود برابر قائم رکھے ہیں۔
سید بلاقی، ولی اورنگ آبادی، سراج دکنی، شاہ آبرو، فغان، اشرف وغیرہ سے یہاں
کے باشندے نہ صرف واقف ہیں بلکہ انھیں اسی شوق و ذوق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔
جس طرح نظامی، سعدی اور حافظ کو پڑھتے ہیں۔ اس عہد کی بیاضیں ان شعرا کے کلام
سے پر ہیں۔ سید بلاقی کا مولود نبی بحد مقبول تھا۔ اس کے کئی نسخے میری نظر سے گذرے
ہیں۔ محمد افضل کا بارہ ماسہ کمال شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ اور ولی کا کلام بڑے
اشتیاق کے ساتھ لوگ پڑھتے تھے۔

۱۸۰۱ء میں رنجیت سنگھ کا دادا چڑت سنگھ بسنتی ندی کی جنگ میں اپنی بندوق
کے پھٹنے سے مارا جاتا ہے۔ اور ہمیں سخت تعجب ہوتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں۔
کہ نامدار خاں وٹ اس کا مرثیہ اردو زبان میں لکھتا ہے۔ سکھوں کی تاریخ میں
اردو صرف اسی موقع پر نمودار نہیں ہوتی بلکہ اس تاریخ سے دس سال بعد جب جے سنگھ
(کنہیا مثل) کا اکلوتا فرزند گور بخش سنگھ عین میدان جنگ میں گولی کے زخم سے ہلاک
ہوتا ہے (اس کی بیوی سدا کور نے اپنی بیٹی بعد میں رنجیت سنگھ کو بیاہ دی) ہم دیکھتے
ہیں کہ محمد غوث بٹالوی گور بخش سنگھ کا مرثیہ اردو میں لکھتا ہے۔
پنجابی شاعروں اور ناظموں کے متعلق جو اطلاع آئندہ اوراق میں درج ہے۔

زیادہ تر عام تذکروں کی بیاضوں سے حاصل کی گئی ہے۔ اس لیے یہ اطلاع مختصر، ناکافی اور غیر متعین ہے۔ ان کے زمانوں کے متعلق بھی ضرورتاً قیاس و احتمال سے کام لیا گیا ہے ان کے تقدم و تاخر کی بابت بھی نکتہ چینی کی گنجائش ہے۔ اور یہ خامیاں اس لیے ہیں کہ اس خاص مضمون پر اطلاع حاصل کرنے کا بظاہر کوئی ذریعہ نہیں معلوم ہوتا۔ پنجاب میں بدقسمتی سے اس وقت کوئی جامع کتب خانہ موجود نہیں ہے اور نہ اب تک اہل پنجاب کو مشرقی کتب خانہ بنانے کا احساس ہوا ہے۔

آخر میں چند کلمات ان بزرگوں کی زباندانی کے متعلق بھی کہنے ضروری معلوم ہوتے ہیں ان کے کلام کو جانچتے وقت ہمیں اپنے زمانہ کے معیار تنقید سے کام نہیں لینا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ یہ لوگ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں جہاں اردو مادری زبان نہیں ہے اور اب سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے خود اردو کا معیار مختلف تھا۔ میں مانتا ہوں کہ ان کے خیالات بلند نہیں ہیں اور نہ زبان بامحاورہ ہے اور اکثر حالات میں پنجابی لہجہ غالب ہے۔ تاہم ان کے مطالعہ سے ہمارا مقصد شاعری سیکھنا نہیں ہے بلکہ صوبۂ پنجاب میں اردو کی نشو و نما اور اس کی ترقی کا مطالعہ کرنا۔ خود اردو کے قدیم اساتذہ میں آج جو ہم دلچسپی لیتے ہیں وہ محض علمی اور تاریخی نقطۂ نظر سے ہے۔ ان بزرگوں کے واسطے بھی ہمارا نقطۂ نظر یہی ہونا چاہیے۔ اس تمہید کے بعد پنجاب میں اردو کا تبصرہ شروع کیا جاتا ہے۔

شیخ فریدالدین گنج شکر متوفی ۶۶۴ھ

ساتویں صدی ہجری میں شیخ فریدالدین مسعود ایک عجیب و غریب ہستی ہیں ملتان کے قصبۂ کوتوال میں پیدا ہوئے اور ملتان میں تعلیم پاتے رہے ممالک اسلامیہ میں سیاحت بھی کرتے ہیں مشہور صوفیوں سے ملاقات کرتے ہیں اور دہلی جاکر قطب الدین بختیار کاکی اوشی کے مرید ہو گیا پاک پٹن میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں اور ۶۶۴ھ میں اسی مقام پر وفات پاتے ہیں۔ شیخ فارسی و پنجابی کے شاعر ہیں اور کچھ حصہ ان کے کلام کا اب تک محفوظ ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ شیخ اردو بھی بولتے تھے۔ اس قسم کے ان کے کئی فقرے ان کے سوانح نگاروں نے اتفاقیہ اپنی تصنیفات میں نقل کئے ہیں چنانچہ:۔

مولانا برہان الدین صوفی ابھی خرد سال ہی تھے کہ ان کے والد شیخ جمال الدین ہانسوی مرید شیخ فریدالدین کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی بیوی "مادر مومناں" شوہر کی وصیت کے مطابق اپنے فرزند خواجہ برہان الدین صوفی کو لے کر حضرت گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ شیخ نے خواجہ برہان الدین کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی خرد سالی کا لحاظ نہ کر کے اپنی بیعت میں لے لیا۔ اس پر مادر مومناں معترض ہوئیں۔ اور ہندی زبان میں بولیں:۔

"خوجا برہان الدین بالا ہے"

یعنی کم عمر ہیں۔ شیخ فریدالدین نے ہندوی زبان میں جواب دیتے ہوئے کہا:۔

"مادر مومناں! پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے"۔

یہ واقعہ میں نے سید محمد بن سید مبارک کرمانی متوفی ۷۷۰ھ کی تصنیف "سیر الاولیاء" سے نقل کیا ہے جس میں مذکورہ بالا ہندوی فقرات بلفظہ درج ہیں۔

ایک روز شیخ فریدالدین اپنے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو وضو کرا رہے تھے۔ اتنے میں حضرت کی نگاہ اُن کے چہرے پر پڑی۔ دیکھا کہ آنکھ پر پٹی بندھی ہے۔ آپ نے دریافت کیا۔ بابا آنکھ پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟ بابا فرید نے ہندی زبان میں جواب دیا:۔

"آنکھ آئی ہے"

شیخ نے جواب دیا:۔

"اگر آئی ہے ایں راچرا بستہ آید"

(جواہر فریدی ص ۲۰۹)

جن ایام میں بابا فرید گنج شکر سرسہ میں حضرت خواجہ عبدالشکور کے مزار پر آتے جاتے تھے۔ ایک دن سرسہ کے لوگ جنھیں یہ معلوم کرنے کا اشتیاق تھا کہ بابا مزار پر جا کر کیا کیا کرتے ہیں۔ اُن کے راستہ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب آپ کو معلوم ہوا ناراض ہوئے اور ہندی زبان میں فرمایا:۔

"سرمہ سرسہ کبھی سرسہ کبھی نرسہ" (جواہر فریدی صفحہ ۲۷۵)

ان فقرات سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان ساتویں صدی ہی میں اپنے امتیازی خط و خال نمایاں کر چکی ہے۔ یعنی اس میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو اسکو ایک طرف برج سے اور دوسری طرف پنجابی سے تمیز کرتی ہیں: "ہوتا ہے" نہ پنجابی ہے نہ برجی اس سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اہل پنجاب ان ایام میں اردو بول اور سمجھ سکتے تھے؛

ذیل کی نظم بھی حضرت بابا فرید گنج شکر کی طرف منسوب ہے جس کے لیے میں جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی اور سید عبد الحکیم صاحب ناظم کتب خانہ الاصلاح۔ دسنہ ضلع پٹنہ کا ممنون بذیرہ ہوں۔ یہ نظم سید اشرف صاحب نے دسنہ لائبریری کے بعض بوسیدہ اوراق قدیم سے حاصل کی ہے۔ جن پر حضرت بابا کے اقوال فارسی بھی درج تھے۔ اور ناظم صاحب نے ایک نقل نہایت مہربانی کر کے میرے پاس بھیج دی ہے۔ وہو ہذا ؎

وقت سحر وقت مناجات ہے	خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا	خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
با دم خود ہمدم ہشیار باش	صحبتِ اغیار بُری ذات ہے
با تن تنہا چہ روی زیں زمیں	نیک عمل کن کہ وہی سات ہے
پند شکر گنج بدل جاں شنو	ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے۔

پنجاب میں نظم سب سے بیشتر لکھی گئی ہے اور نثر نسبتاً کم ملتی ہے ۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس سلسلہ میں بہت کچھ ذخیرہ تھا۔ لیکن موجودہ نسلوں کی عدم اعتنا سے اکثر حصہ جو قلمی تھا برباد ہو گیا ہے ۔ اور جو کچھ باقی ہے، وہ بھی عنقریب برباد ہو جانے والا ہے ۔ مشیر قیامت سے اہل پنجاب کی عام بے پروائی نے ہماری تلاش کے کام کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے ۔ پنجاب اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت پر نازاں ہے ۔ لیکن یہاں کوئی ایسا کتب خانہ موجود نہیں ہے ۔ جو مسلمانی مخطوطات اور ان کے ذہنی و دماغی کارناموں کا صحیح معنی میں جامع ہو ۔ ذیل میں جو مواد پیش کیا جاتا ہے ۔ وہ اندکے از بسیار کا مصداق ہے ۔

شیخ عثمانؒ

پنجاب میں اردو شاعری دکن سے بعد اور دہلی کے معاصر شروع ہو جاتی ہے ابتدائی نمونے بہت کم ملتے ہیں اور جس قدر ملتے ہیں ان میں تخلص موجود نہیں۔ یہ تمام نمونے زیادہ تر ریختہ کی شکل میں ہیں اور ان میں فارسی بہت غالب ہے اور مقامی اثر بھی حاضر ہے۔ ان نظموں کی بعض خصوصیات بھی ہیں۔ مثلاً اکثر مسمط طرز کی ہیں۔ قافیہ کی پابندی سے آزاد ہیں۔ اور ردیف پر قناعت کی گئی ہے۔ جیسا کہ میر جعفر زٹلی اور شیخ جیون کے کلام میں مشاہدہ ہو چکا ہے۔ یہ نظمیں ہندی اوزان میں لکھی گئی ہیں اور فارسی اوزان میں بھی۔ الفاظ بعض اوقات پنجابی لہجہ میں تلفظ کئے گئے ہیں:۔

ابتدائی نمونوں میں جو کم از کم گیارھویں صدی ہجری کی ابتدا سے تعلق رکھتے ہیں تمام غزل فارسی ہے صرف ردیف اردو ہے مثلاً ذیل کا ریختہ:-

عاشق و دیوانہ ام آؤ پیارے حبیب — از ہمہ بیگانہ ام آؤ پیارے حبیب

اے نظرت آفتاب بر من مسکیں بتاب — جان و جگر شد کباب آؤ پیارے حبیب

اے دل و دیں جان من درد تو درمان من — ذکر تو سامان من آؤ پیارے حبیب

زاں لب شیریں شکر بار دو درد گہر ٹو — ساز مرا بہرہ ور آؤ پیارے حبیب

چند کشی کشتہ را عاشق آشفتہ را — بیدلم دے بے نوا آؤ پیارے حبیب

دمبدمم انتظاریک نظرم دا گمار ۔۔۔ جاننتم خستہ دار آؤ پیارے حبیب

اے تو کس بیکساں تو نس بچارگاں ۔۔۔ غمخوار آوارگاں آؤ پیارے حبیب

حکم ترا بندہ ام نزد تو شرمندہ ام ۔۔۔ زار و سر افگندہ ام آؤ پیارے حبیب

وقت شبابم گذشت کار نیامد زدست ۔۔۔ پشت زغمہا شکست آؤ پیارے حبیب

دربدر و کو بکو نعرہ زناں سو بسو ۔۔۔ دیدن تست آرزو آؤ پیارے حبیب

روز و شبم انتظار و م بادمم بے قرار ۔۔۔ دیدہ چو ابر بہار آؤ پیارے حبیب

بر دل عثمان غریب رحمت خود کن قریب ۔۔۔ زانکہ تو ہستی مجیب آؤ پیارے حبیب[1]

اس غزل میں ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو نے صرف انگلی پکڑی ہے آئندہ چل کر وہ پہنچا بھی پکڑ لے گی۔ یہ ریختہ حضرت مجدد الف ثانی سرہندی علیہ الرحمۃ متوفی ۱۰۳۵ھ کے پیر بھائی حضرت شیخ عثمان جالندھری کی یادگار ہے خزینۃ الاصفیا میں شیخ عثمان کا ضمناً ذکر آجاتا ہے لیکن ان کا سن وفات نہیں ملا۔ اسی طرز کا ایک اور ریختہ ہے جس کے مصنف کے حالات سے ہم واقف نہیں ہیں:۔

منم مشتاق دیدارت تاری ٹک دور کن گھونگٹ ۔۔۔ بجان و دل خریدارت تاری ٹک دور کن گھونگٹ

نہ لگتی نیند مجھ آوے نہ تجھ بن بات مجھ بھاوے ۔۔۔ ترے کارن رات دن جیوے اری ٹک دور کن گھونگٹ

اگر تو یوسف ثانی دگر تو ماہ تابانی ۔۔۔ اگر تو شاہ خوبانی اری ٹک دور کن گھونگٹ

عجب رفتار تو داری عجب گفتار تو داری ۔۔۔ چہ حسنت نادرے داری اری ٹک دور کن گھونگٹ

---

[1] بوساطت مولانا عبد اللہ صاحب بالقابہ۔

شیخ جنید

اسی قرن کے ایک اَور بزرگ ہیں۔ ان کا اسم گرامی جنید ہے۔ اور جماعت صوفیہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کے حالات زندگی نامعلوم ہیں۔ آیندہ نظم ان کی ہے:-

دلا غافل چہ می خسپی کہ اپنی میح تھیں ڈیہیے — جو روز مرگ در پیش است اتنی نیند کیوں کہیے

چو دنہ دلند رکمیں باشد کرے جو نیند بنجارا — نباشد سود یک حبّیل گوادے مول بھی سارا

بدین دنیائے دہ روزی بڈائی کائی کیوں کہیے — اگر صد سال عمرت شد نہایت ایک دن مرہیے

چہ مغروری بدیں دنیا سدا اس جگ نہیں بسنا — ہمیں راہے کہ در پیش است سبھی اس پنتھ ہے چلنا

کجا رفتند آں ساہاں کہ جن کی بار تھی بستی — گر فتند جائے در صحرا گئے سب چھوڑ کر بستی

کجا رفتند آں مرداں کہ بانکاں ٹوپیاں بہرے — ہمہ در خاک خسپیدند جنہاں تھیں سبھی تھیں ڈریے

کجا رفتند آں بازاں جنہاں تھیں جیدنی تیرا — چناں رفتند زیں عالم کہ کلھونا کیا پھر تیرا دکدا

کجا رفتند آں حیداں جنہاں کے نین تھے بانکے — چناں بگذاشتند خانہ نہ پھر گھر بار دہر جھانکے

کجااں ماہرو خوباں جو مور کند لے تے پائے — نہ نام و نے نشان ماندہ سبھی گل گل بہے جاتے

کجا سوداگراں منعم جنہاں کے بار تھے مانیے — کلالاں خاک شاں بردند گھڑے مکھ پار زنس بھانیے

دراں رفتنگ تو میری نہ دنیا کام تجھا آوے — کسے کو داد و بخشندہ وہی کچھ ساتھ بھی جاوے

نہ اینجا خویش کس باشد نہ کرسی یار کو یاری — نہ کس مونس بود دیگر نہ بھائی باپ مہتاری

بیفتد با خدا کارت نہ کوئی آوے پھر کاوے تو اور گور بسیار نہ پھر کر لوگ گھر آوے

دراں درگاہ بے رشوت نجانوں کیوں تے پردا

جنید امرواں باشد کہ اس سیسار تھیں ڈردا

ہندوستان کی طرح پنجاب میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو مشائخ کی خانقاہوں میں سب سے پہلے پرورش پاتی ہے اور گھٹنوں چلنا سیکھتی ہے ؛؛

منشی ولی رام

شاہجہان کے دور میں منشی ولی رام صاحب عربی و فارسی و ہندی میں شعر کہتے تھے۔ اور ولی تخلص کرتے تھے۔ دارا شکوہ کے منشیِ خاص تھے۔ ان کی مثنوی ملقب بہ شش وزن مطبع نادر العلوم میں چھپ چکی ہے۔ غزل ذیل اُن کا نمونۂ کلام ہے :-

چہ دل داری بریں دنیا کہ دنیا سے چلانا ہے چہ دل بندی دریں عالم کہ سر پر چھوڑ جانا ہے

چو ہنگام اجل آید بکارت کچھ نہ آید بچھائی گاہ کی تیری وہی تیرا بچھانا ہے

قباو چیرہ رنگیں ہمہ از تن تو بکشانید دہینگے کفن کی چادر جو تیرا خاص بانا ہے

ہزاراں کھانا گر واری پر از حلوا پلا رنگیں دیویں دو مشت ارداد جو تیرا خاص کھانا ہے

بمادر پدر فرزنداں برادر ہا کہ می نازی ۔۔۔ وہی تجھ کو جلائیں گے جناں پر بیت ٹھانا ہے
تو مہماں آمدی ایں جا شدی خود خانہ خاوند ۔۔۔ تو اپنے آپ کو بھولا کسی کو نا پچھانا ہے
شراب سرخ می نوشی اجل کردی فراموشی ۔۔۔ مرن کو دور مت سمجھو عجب یہ ٹک بہانا ہے

طبیب دیدار میدارم کہ روزاول تشفا عتہا
بسا رومت ولی را ما کہ آخر رام رانا ہے

(خزینۃ العلوم ۔ درگا پرشاد نادر ۔ مفید عام ۱۸۷۹ء)

مولانا عبدی

سنہ ۱۰۷۷ھ میں "فقہ ہندی" نامی ایک رسالہ بعہد عالمگیر پنجاب میں لکھا جاتا ہے اسپرینگر نے فہرست کتب خانہ اودھ میں اس کو محشر نامہ کے نام سے موسوم کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کتاب کا نام محشر نامہ نہیں ہونا چاہئے ۔ بلکہ فقۂ ہندی ۔ اس کا یہ خیال بالکل درست ہے ۔ لیکن وہ اس رسالہ کے ناظم کا نام محمد جیون عرف مجذوب عالم متوطن جھجر بیان کرتا ہے ۔ اور خاتمہ سے دو شعر نقل کرتا ہے :۔

فقہ ہندی کو مومناں انو زبان ہر باد ۔۔۔ مسلہ آوے دین کا مول نہ ہووے فساد
سن ہزار چہ تھے بیچ رمضان (کذا) ۔۔۔ اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

اور شعر افتتاحی حسب ذیل نقل کرتا ہے :۔

اللہ مولا پاک ہے جو جگ سرجن ہار　　　جن دیا یار صدق سوں سمجے اتُمے پار

میرے زیر نظر فقہ ہندی (مملوکہ پروفیسر سراج الدین آذر۔ ایم۔ اے) ہے۔ جو ۱۲۲۲ھ کی نوشتہ ہے۔ اس میں خاتمہ کا پہلا شعر اسپرنگر کے منقولۂ بالا شعر کے مطابق ہے اور شعر دوم یوں ہے :۔

سنہ ہزار چوہتر بیچ ماہ رمضان تمام　　　اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا انظام

مگر شعر افتتاحی یوں ہے :۔

حمد ثنا سب رب کوں خالق کل جہان　　　لایق حمد ثنا کے اور نہ کوئی نہ بجان

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسپرنگر کے سامنے دو مختلف رسالے ایک ہی جلد میں ساتھ بندھے ہوئے تھے جن میں فقہ ہندی کا نمبر دوم تھا۔ اسپرنگر نے دونوں رسالوں کو ایک سمجھا۔ اس لئے ابتدائی شعر پہلے رسالہ کا دیا۔ اور خاتمہ فقۂ ہندی سے نقل کر دیا۔ اسی لحاظ سے اس نے مصنف کے نام میں بھی غلطی کھائی ہے۔

فقۂ ہندی کا مصنف عبدی ہے نہ کہ محمد جیون۔ عبدی کا نام اس شعر میں آتا ہے :۔

کیتے مسلہ دین کے عبدی کہے ایمن　　　فقہ ہندی زبان پر بوجھو کر و یقین

اس کے علاوہ رسالہ کی زبان اس قدر پنجابی آمیز ہے۔ کہ اس کو ہریانی زبان میں کسی طرح داخل نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کا صحیح نام پنجابی اردو ہے۔ ذیل کے

اشعار سے ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں:۔

حمد ثنا سب رب کوں خالق کل جہان   لائق حمد ثنا کیے اور نہ کوئی جان تو
علم شریعت نال کے بھیجا پاک رسول   جو کچھ بھیجا رب نیں سب ہم کیا قبول
یارب اپنے فضل سوں بےحد بھیج درود   نبی محمد مصطفےٰ تجھ سوں ہو خوشنود
بھیجوں اوسکی آل پر اور اصحاب تمام   تس بھیجوں احباب پر بہت درود سلام
کیتے مسلہ دین کے عبدی کہے آمین   فقہ ہندی زبان پر بوجھو کرو یقین
مطلب مسلہ بوجھنا فرض عین کے جان   عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان
علم شریعت بوجھنا فرض عین کے جان   بالغ عورت مرد کوں جو ہوئے مسلمان
چار علم سب فرض ہے بوجھو کرو قیاس   علم توحید نماز ہے روزہ حیض نفاس
تس کے پیچھے سو منا تہتر فرقہ جان   بہتر فرقہ دوزخی سو تعبہ شیطان
رافضی خارجی جبریہ مرجیہ بھی جان   جبریہ قدریہ ہر یکے سو بارہ فرقہ مان
فرقہ بہشتی مصطفےٰ اور اصحاب تمام   یہ فرقہ اسلام کا سنت جماعت نام
تس پر چار امام ہے چار رکن اسلام   ابوحنیفہ شافعی مالک احمد نام تا
سنی ہو وس چیز سوں یہ مسلہ کر یاد   تفضیل دے دو شیخ کوں دو ختنی دو داماد
دو امام پیچھے نماز کر دو قبلہ کو جان   دو جنازہ پر نماز کر مسح دو موزہ آن
دونوں عید نماز کر اطاعت دو سلطان   راضی ہو تقدیر پر دو کو اہی جان
گناہ کبیرہ بوجھنا لازم کرکے جان   اشتراک باللہ اور مارنا ناحق مسلمان

سحر کرنا اور بھاگنا بیچ غلبہ کفار   عاق کرنا ماباپ کا جو ہیں مسلم پندار

کھانا مال یتیم کا بیاج کھانا جان   نو ہیں کبیر متفق اور زنا خمر پچھان

دو ہاتھ نکلے ہاتھ سول جب آکھے تدبیر   سرنہ جھہائی رفع کرائے صاحب تدبیر

چار انگلی کے فرق سوں جدہ می دھرے دو پانو   جونوں کھڑا نماز میں دیکھ سجدہ کی ٹھانو

دیکھ رکوع میں پانو کو سجدہ ناک تمام   قعدہ بیچ کنار کو کاندھا وقت سلام

حی علی الفلاح تھہ قائم ہووے امام   قد قامت الصلوٰۃ شروع کرے امام

طرف قبلہ کر انگلیاں سجدہ کر بیچ ہاتھ   موڈھا برابر بیٹھے کے رکھ رکوع کے ساتھ

گھٹنہ دہر پھی ہاتھ سر سجدہ کوں لیا ؤ   سر دہ بھاؤ بھی ہاتھ کوں پچھوں گھٹنہ اٹھاؤ

اس تصنیف کی ایک خصوصیت یہ ہے۔ کہ اس میں بعض فارسی افعال کا استعمال دیکھا جاتا ہے۔ جیسے :-

لب بینی کے بال بے سارے ناخن چین   ختنہ چھوٹی ازار کر سنت جان یقین

دیگر ؎

استنجا سنت خاک سوں ڈھیلہ پتھر ساتھ   چوب روئی اور برف سوں جوتہ نمد روا ست

دیگر ؎

عیدگاہ کی راہ میں پکار کہے تکبیر   پچھوں دوگانہ عید کے قربانی واجب گیر

عبدی پنجابی میں بھی ایک شاعر گذرا ہے۔ جو رسالہ مہندی کا مصنف ہے۔

اب رسالۂ مہندی اور فقہ ہندی کی زبان میں قرابت قریبہ موجود ہے ۔ جس سے میرا خیال ہے ۔ کہ دونوں رسالوں کا مصنف ایک ہی شخص ہے ۔ مثلاً

فقہ ہندی سے

مسلے آوین دین کے مول نہ ہووے فساد

دیگر سے

کیتے مسلے دین کے عبدی کہے امین

رسالۂ مہندی سے

آکھاں وقت سوال دے مول نہ ہندے فساد

دیگر سے

واجبات نماز دے عبدی کہے امین تو

دونوں رسالوں کا وزن بھی ایک ہے ۔ اور جملوں کی ترکیب اور بندش بالکل پنجابی طرز میں ہے ؛

ناصر علی سرہندی

آبِ حیات میں مذکور ہے کہ استاد ولی نے ناصر علی کو لکھا تھا ؎

اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں
اچھل کر جا پڑے جوں مصرعِ برق

ناصر علی نے جواب میں لکھا ؎

دلی ہرگز نہ پہنچے گا علی کوں
باعجاز سخن گر اڑ چلے وہ

پنجاب میں علی کی غزلیں ایک وقت میں بہت مقبول تھیں۔ اور اب بھی پرانی بیاضوں میں مل جاتی ہیں۔ یہاں علی کے اردو کلام کا نمونہ ایسی بیاضوں سے دیا جاتا ہے۔ جو محمد شاہ کے عہد میں یا اُس سے چند سال بعد نقل کی گئی ہیں۔

نین کے ساغر تمن کے جھیتے چھوں لبالب سٹں بل پڑیگا
ہوویگی نرگس خجل چمن موں کلو کلی کھبا میں گل پڑیگا

دو نین کا رنگ نہیں کی جانی حیران کرتی لوگن کے تئیں
خراب ہوگا تمام عالم جب ان نین موں کجل پڑیگا

تمن کے ابرو کمان وستی پلک ہے حاضر جو تیر ناوک
نظر غضب کی نہ دیکھ ساجن کوئی بیچارا وو تھل پڑیگا

علی ملاحت ترے سجن کی گر زلیخا سنے گی کبھوں تو
مصر میں سودا دگر ہوویگا درم نہ یوسف کا مل پڑیگا

(از بیاض پرتاب سنگھ۔ نوشتہ سنہ ۹ جلوس محمد شاہی)

سجن کے حسن کا قرآن پڑھیا ہے ہیں نظر کر کر
نہیں پائی غلط اوس میں دیکھا زبر و زیر کر کر

ترے غم کا مجھے سرجن ہویا ہے کافیہ کافی تو ۔۔۔ شرح ملاں درس میں سوں سنتی ہے بس بلا کر کر
معانی اور بیاں بھینبر بدیع اس کو سمجھتا ہوں ۔۔۔ پڑھی ہے حسن زیرے کی مطول جس نکو کر کر
کلام العشق ہمنا کوں سُنا حکمت سوں منطق موں ۔۔۔ وگرنہ اس مطول کوں رکھا مختصر کر کر
اصول اور ہندسہ کب لک پھر قرن تکمیل ہے یاراں ۔۔۔ ہدایہ عشق کا غالب ہویا مجھ پر اثر کر کر
بگر ردی سلجن کے ہویا پیدا خطِ مشکیں ۔۔۔ لیا ملک سلیمانی مگر موراں مکر کر کر
جرس تجھ کارواں کا سن علی آں شوخ بے پروا ۔۔۔ کیا ہے بار ہستی کا دے عزم سفر کر کر

(از بیاض نوشتۂ محمد شاہ مرقومۂ ۱۱۶۱ھ)

دیگر ؎

چندر مکھ پر یہ خال مشکیں نپٹ بشوخی فتنہ رہا ہے ۔۔۔ عجب ہے یاراں کہ ایک زنگی بملک رومی اٹک رہا ہے
بُتِ فرنگی بقتل ہمنا رکھے جو رہ چلیں جبیں دمادم ۔۔۔ ہوا ہے جیونا جگت میں مشکل کہ تیغ ابرو سرک رہا ہے
علی تفقر بمقام جس کوں ہوا ہے حاصل وصل جاناں ۔۔۔ پہ چو چشم ترگس ہوا ہے حیراں بوصل دلدار چھک رہا ہے

(از بیاض پرتاب سنگھ نوشتۂ ۹ جلوس محمد شاہی)

علی کا کلام فارسی ترکیبوں کی بنا پر محمد شاہی عہد کے شعرا کے کلام سے ممیز ہے۔ بگر ردی ساجن۔ آں شوخ بے پروا۔ بُتِ فرنگی بقتل ہمنا۔ چو چشم ترگس۔ چو تیر ناوک ایسی بندشیں ہیں۔ جو قدیم شعرائے دہلی کے ہاں کمیاب ہیں۔ برخلاف اس کے پنجاب کے شاعر ایسی ترکیبیں لانے کے عادی ہیں۔

شیخ ابوالفرج محمد فاضل الدین بٹالوی متوفی ۱۱۵۱ھ

بٹالہ سرزمین پنجاب میں ایک مردم خیز شہر ہے۔ میرزا نور العین واقف، فارسی کے مشہور شاعر کا مولد و منشا یہی شہر ہے۔ بارہویں صدی ہجری میں اس شہر میں مشائخ کا ایک مشہور خاندان ظہور میں آیا جس کے جد اعلےٰ شیخ ابوالحسن علی بغدادی معروف بہ بدیع الدین شہید حسینی جیلانی ہیں۔ آپ بسلسلہ سیاحت عراق سے ہندوستان وارد ہوئے اور یہیں رہ پڑے۔ عوام الناس میں عربی لباس کی بناپر آغا کے نام سے مشہور ہو گئے۔ آپ کا مزار موضع سہاری من مضافات پنجاب ہے۔ آپ کے احفاد میں شیخ ابوالفرج محمد فاضل الدین بٹالوی نے خاص شہرت حاصل کی۔ آپ شیخ محمد افضل لاہوری کے مرید ہیں۔ بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر تلاش معاش کی غرض سے شاہی لشکر کی شمولیت کی امید میں وطن سے نکلے جب بٹالہ پہنچے۔ کچھ ایسے موانعات پیش آئے کہ شرکت لشکر کے ارادہ کو ترک کر کے یہیں رہ پڑے اور تصوف میں ذوق لینے لگے۔ آپ نے چالیس کتابیں اور رسالے اپنی یادگار چھوڑے[۱] ایک روایت ہے[۲]

---

[۱] تذکرۃ الابرار غلام محی الدین بن عبدالکریم قادری پشاوری۔

[۲] بدر محی الدین صاحب کا خط (بحوالہ شرائف غوثیہ) از درگاہ فاضلیہ بٹالہ۔

کہ تصانیف کی تعداد ایک سو سے زائد ہے۔ اُن میں سے قصیدۂ خمریہ حضرت غوث الثقلین پر آپ کی عربی اور فارسی شروح اور ترجمۂ مواعظ الرحمٰن کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔ ۷ رجب ۱۱۵۱ھ میں بہتر برس کی عمر میں انتقال فرماتے ہیں "عَلَم عالم" تاریخ وفات ہے۔ آپ کے والد کا نام سید محمد عنایت اللہ ہے۔ جو عہد شاہجہان و عالمگیر میں سیالکوٹ۔ کشمیر۔ کابل وغیرہ مقامات میں متفرق اوقات پر قاضی القضاۃ رہے ہیں۔ اور خان بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔ آپ نے عربی اور فارسی علوم کی تحصیل مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی کے نواسہ ابوالحسن فتح محمد اور میاں محمد غوث لاہوری سے کی ہے[۱]؁

حضرت محمد فاضل بھی اُردو میں شعر کہتے تھے۔ ان کا اور سید ولی اورنگ آبادی کا زمانہ تقریباً ایک ہے۔ یہاں میں آپ کی ایک مناجات جو عربی اور اردو میں ہے۔ درج کرتا ہوں ؎

ہے رین دن غفلت بڑی نظر بحالی یا نبی	ناہیں مرا چھٹ تم کوئی انظر بحالی یا نبی
فریاد کرتا ہر گھڑی نظر بحالی یا نبی	اس فضل سوں رکھو مجھے من غول سجان لصفا
اس غم ستی چھاتی سڑی انظر بحالی یا نبی	ہیں ہوں خرابی میں پڑا الطفل سوء الخلق حیف
ہے مرگ بھی سر پر کھڑی نظر بحالی یا نبی	اس شرم سوں مجھ کو نہیں حتیٰ اری نور الصفا
اس عشق سوں کر پھل جڑی انظر بحالی یا نبی	بُر قع شریعت سوں سکھو حتیٰ کون بنور کم

---

[۱] بد محی الدین صاحب کا خط (بحوالہ شرائف غوثیہ) از درگاہ فاضلیہ۔ بٹالہ؁

روز رو لکھوں رو رو بھروں قصاً بقصاً عاصیا افواج عصیاں سوں جھڑی انظر بحالی یا نبیؐ

رکھو نہیں رکھو نہیں لی لیس غیرک یا ملاذ نا ہیں مرا جیسے تم سنتی انظر بحالی یا نبیؐ

بھولا ہوں میں بخشو نہیں لاتا خذنی یا نورؐ جب محی دین بخشش کری انظر بحالی یا نبیؐ

فاضل پکارے رین دن اشفع شفیع المذنبین

فریاد کرتا ہر گھڑی انظر بحالی یا نبیؐ

(از بیاض مملوکہ پروفیسر اذر)

شیخ محمد نور

شیخ محمد فاضل کے پیر بھائی شیخ محمد نور ہیں۔ جو شیخ محمد افضل کے مرید ہیں۔ اُن کی ایک اردو مناجات یہاں نقل کرتا ہوں :۔ ؎

بھر خدا تو اے صبا بغداد جا فریاد کر دربار میراں شاہ کے کہہ منتی مجھ سر بسر

ڈوبا ہیں غم کے چاہ موں کر فضل مجھ بہر خدا تم بن مرا کو ہو نہیں ہیں دست عاصی کا پکڑ

رونا ہیں اپنے حال سوں غفلت ستی حیراں ہوا زحمت موجھے مضطر کیا دیو دشفا خود کرم کر

ؔ فارسی کا ترجمہ ہے جیسے فوجے از گلنگاں :۔

تیرے مرید جو خاص ہیں انکے سگاں کا ہوں ہیں سنگ — بہر خدا اور مصطفےٰ کر لطف کی مجھ پر نظر

حق نے تو جھے سرور کیا ولیاں میں تم سرتاج ہو — ہو یا نہ کوئی نا ہوئے تیرے جیہا تا دن حشر

صد حیف مجھ عاصی نا ہیں تم سا ہوئے میرا سائیں — دل کی سیاہی نہا دھو عالم کے تم ہو راہبر

بختاں کے جس رکنا ملے ہوئے وہ باتیکے آگمے — مجھ اس لئے تجھ نام کی ہے ورد دل میں جاں بہتر

تم سا رکا جس پیر ہو دو سکوں نہیں پرواہ کچھ — پاوے وو جگ میں عافیت تیری نظر سوں سنگ و زر

چاہو اگر مرنے نا ہیں زندہ کرو اک پل منے — تم کی صفت منہ کیا کروں تم سا نہیں کوئی دگر

خوابیک منہ کوں داب موں فکراں ستی مجنوں ہو یا — مرنے میں کچھ باقی نہیں جتیا ہیں تم کی آس پر

نت کھی مجھ صبر کی ہے بیقراری روز و شب — تم سیں طلب آرام کی بدو ہم مجھ کے دور کر

تم کی محبت دل مرا لیا ہے اپنے دام سوں — حق سوں عجاد انق مجھے پاؤں میں نیادیاں میں فر

دیوے خدا توفیق گر یکا اسم ہر دم پھر وشن — تجھا اسم اعظم اسم ہے مشہور ہے عالم بھر

پوچھیا ہے کر تحقیق میں عالی تری درجات ہے — صدقہ علی حسنین کا اوفق مجھ کے قدم دھر

دامن پکڑی لاج تجھ سن عاجزی مجھ کی شہا — محفوظ کر دل جان سوں دو جگ کو امید خطر

دارد مبارک رب ستی مجھ کا کہو خود فیض سوں — دل کی فسادت سب گوا روشن کر و سینہ جگر

عصیاں میں ہیں غرقاب ہوں نیکی نہیں مجھ ہوئی — تجھ بار ہی ہیں آگرا ہوں ناتواں بے بال و پر

کر کر تصدق نافوکے باطن ہو گی بے خبر — رکھ شاد دنیا دیں موں مجھ نفس شیطاں کا نہ ڈر

حق کی حضوری بخش مجھ مجلس محمد مصطفےٰ — وہ قرب انبیا کر مجھے دو جگ جہاں میں شاد تر

سه مجھ وسته جیسا بنده کچھ بسته ہیں ؛ شت گئی ؛ سه پڑھوں بدھے ہووں ؛

بن دیکھنے تجھ سے شہا زندگی میری برباد ہے ۔ چہرا مبارک مجھ دکھا تجھ سوں فدا دل جان و سر
غم کی تباہی سے چھوڑا کر دفع مجھ سیں بر بلا ۔ توں پادشاہ دو سر مشکل مری آسان کر
افضل ساہیں نائب تمے میرے ہو سے نے دستاجی ۔ برکت اونہوں کے نام کی مجھ میں گواہر شوودتر

ہیں نور عاجز رات دن ہے ورد تیری مدح کا

واصل خدا کر مجھے بے رنج بے محنت ضرر

یہ خالقاہی اردو کے نمونے آج ہمارے کانوں کو نہایت عجیب معلوم ہوں گے۔ لیکن ہمیں تاریخی دلچسپی کی رُو سے اُن پر نگاہ ڈالنی چاہیئے۔ یہ تبرکات ایسے عہد کی یادگار ہیں جب کہ ابھی دہلی میں بھی سناٹا تھا۔ اور میر و سودا کی غزل خوانی شروع ہونے میں ایک عرصہ درکار تھا۔ ہمیں اس نظم کی بعض خصوصیات کو یاد رکھنا چاہیئے:۔

کر فضل مجھ = مجھ پر فضل کر۔ میرا کوئی نہیں = میرا کوئی نہیں۔ دلیاں میں = دلیوں میں۔ تیرے جیہا = تیرے جیسا۔ تجھ نام کی = تیرے نام کی۔ مجھ کے اوپر = میرے اوپر۔ تم سارکا = تم سرپکا۔ تم کی صفت میں کیا کروں = تمہاری صفت میں کیا کروں۔ تم کا اسم ہر دم پھڑوں = تمہارا اسم ہر دم پڑھوں۔ بن دیکھنے تجھ = تیرے دیکھے بغیر۔ مجھ دیکھا = مجھ کو دکھا۔ بعض الفاظ کا جو غلط تلفظ دیا ہے۔ مثلاً کرم۔ قدم وغیرہ پرانی اردو میں اسی طرح بولے جاتے تھے:۔

ﻪ بکڑے ؛۔

موسٰی

اسی عہد کا ایک ترجیع بند دیا جاتا ہے۔ جس کے مالک موسٰی ہیں۔ اُنکے حالات معلوم نہ ہو سکے ؎

هم چرنوں لاگے آن تیرے ۔ جو پادیں درسن دان تیرے ہا
دو جگ پر احسان تیرے ۔ سب بندہ ہیں سلطان ترے
سب وحش طیور انسان ترے ۔ لاگے ہیں دھیان و گیان ترے
دہائے ہیں عرش نشان ترے ۔ ہیں صدقہ ارقربان ترے
کر دل کوں بدر منیر میرے ۔ یا غوث الاعظم پیر میرے

دو جگ میں شکر شیر ہو تم ۔ یا داتا حضرت پیر ہو تم
رتبہ موں عرش منیر ہو تم ۔ دکھیا کے دہیرج دہیر ہو تم
سب دلیاں بیچ امیر ہو تم ۔ ہرادل اور اخیر ہو تم
قادر بر ہر تقدیر ہو تم ۔ ہر شے موں بلا نظیر ہو تم
کر دل کوں بدر منیر میرے ۔ یا غوث الاعظم پیر میرے

تم محی الدین جیلانی ہو ۔ تم سانچے قطب ربانی ہو
تم سچے محبوب سبحانی ہو ۔ تم بر حق غوث صمدانی ہو

تم حوض کوثر کے بانی ہو — ہر مشکل کی آسانی ہو
کر دل کوں بدر منیر میرے — یا غوث الاعظم پیر میرے
میں عاجز تجھ دربار کھڑا — کہتا تیرے دوار کھڑا
تجھ نام کا لے اوہار کھڑا — کرتا ہوں یہ ستار کھڑا
رنجیدہ دل لاچار کھڑا — کاندھے پہ غم اسوار کھڑا
تجھ سا تھ کا کھیوا پار کھڑا — یا پیر میں یاپی دار کھڑا
کر دل کوں بدر منیر میرے — یا غوث الاعظم پیر میرے
تم صحی پیراں سر پیراں جی — تم سانچے حضرت میراں جی
تم مکھو تو بندا بیراں جی — مجھ دکھ کی کاٹ زنجیراں جی
تم اکھیں دیت بصیراں جی — تم خوشی دیت دلگیراں جی
تم دہیرج دیت ادھیراں جی — کیا ہند دکن ایراں جی
کر دل کوں بدر منیر میرے — یا غوث الاعظم پیر میرے
نہیں حرصی مال منال کا ہوں — آشفتہ تیرے جمال کا ہوں
مزدی تجھ جاہ جلال کا ہوں — نیدا تجھ قیل اور قال کا ہوں
میں بھوکا[2] تیرے وصال کا ہوں — دیوانہ اسی خیال کا ہوں ؎

---

[1] انکھیں ؎ [2] بھوکا ؎

ہیں منگتا اسی سوال کا ہوں — میں عرضی اس احوال کا ہوں
کر دل کوں بدر منیر میرے — یا غوث الاعظم پیر میرے
تو ہادی راہ ہدایت کا ہے — تو منبع فیض کی آیت کا
حامی ہیں روز عنایت کا — کافی ہیں کرم کفایت کا
ہیں داعی فضل رعایت کا — والی ہیں عین عنایت کا
ہے سایہ تیرے رایت کا ہے — یہ شوق مجھے بغایت کا
کر دل کوں بدر منیر میرے — یا غوث الاعظم پیر میرے
تجھ ہجر کی کنتھا سیتا ہوں — کٹ سیں کپڑے لیتا ہوں
تجھ یاد کی بھکیا کیتا ہوں — اور خون جگر کا پیتا ہوں
تجھ نام لے سیں جیتا ہوں — ہیں نیک عمل سیں رہتا ہوں
تجھ در کی مائی لیتا ہوں — مکھ پر یہ خاک رہتا ہوں
کر دل کوں بدر منیر میرے — یا غوث الاعظم پیر میرے
تم غم مجھ دل سیں دور کرو — یہ بات میری منظور کرو
مجھ دشمن جگنا چور کرو — آتش ہیں دل منور کرو
سینہ کو پر نور کرو — عشق اپنے سوں معمور کرو
مے اپنی سوں مخمور کرو — یہ یار ہمارا پور کرو
کر دل کوں بدر منیر میرے — یا غوث الاعظم پیر میرے

ہم بیکس دکھین اور تیرا — مشہور جگت موں شور تیرا

ٹکی موں باندھا چوڑ تیرا — وہ چور تیرا میں دچور تیرا

القاب ہے بندہ چوڑ تیرا — رکھتا ہوں ڈھیر اور زور تیرا

ایمان ہے شکر معمور تیرا — ....

کر دل کوں بدر منیر میرے — یا غوث الاعظم پیر میرے

سر پوٹ اوگن کی بھاری ہے — مجھ لاگی آس تمہاری ہے

تجھ نام پہ پوٹ اتاری ہے — دیکھ ایسی شکل ہماری ہے

موٹی تجھ درس بیکھاری ہے — تں دستگیر نستاری ہے

مجھ سوخت رین اندھاری ہے — یا پیر مرے اب یاری ہے

کر دل کوں بدر منیر میرے

یا غوث الاعظم پیر میرے

(از بیاض ۔ پروفیسر آذر)

یہ نظم اگرچہ ہم مصنف کے عقائد سے متفق نہیں ۔ سادگی جذبات و ادائے بیان کے لحاظ سے بلند پایہ رکھتی ہے ۔ پنجاب میں حضرت شیخ عبدالقادر کے نام پر ایسی ہزاروں مناجاتی نظمیں لکھی گئی ہیں ۔ بارہویں صدی میں پنجاب کی سیاسی ابتری نے اور بھی ان کو فروغ دیا ہے ۔ عالمگیر کی وفات کے بعد وہ دور شروع ہو جاتا ہے ۔ جس کو ہم پنجاب کی تاریخ کے سیاہ ورق کے نام سے

موسوم کرتے ہیں۔ اس عہد میں اس سرزمین پر آفتیں ٹوٹیں۔ بلاؤں پر بلائیں نازل ہوئیں۔ سکھوں کی تاخت و تاراج۔ نادر کی آمد اور احمد شاہ درانی کے حملے ایسے واقعات ہیں۔ جنہوں نے یہاں کے باشندوں کے قلوب کو یاس اور ناامیدی کے جذبات سے معمور کر دیا۔ قاعدہ ہے۔ کہ مصیبت میں خدا یاد آتا ہے۔ لیکن خانقاہی اثرات میں پنجاب نے صرف حضرت غوث الاعظم کو یاد رکھا۔ اور انہی کا کلمہ اکثر پڑھا۔

حضرت غلام قادر شاہ متوفی ۱۱۷۶ھ

شیخ محمد فاضل کے فرزند اور جانشین حضرت غلام قادر شاہ ہیں۔ جو علم و عمل زہد و تقویٰ۔ ریاضت و مجاہدت اور حال و قال میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ آپ کا لقب اہل اللہ ہے۔ تصوف میں متعدد تصنیفات آپ کے قلم سے نکلی ہیں۔ جن میں سے صفات المرات کا ہم تک نام پہنچا ہے۔ شب یکشنبہ ۵۔ ربیع الثانی ۱۱۷۶ھ میں رحلت کی۔ نوت مخدوم آپ کی تاریخ وفات ہے۔ اور غلام تخلص ہے؂

اُن کی اُردو مثنوی رمز العاشقین اُن کے والد بزرگوار کی زندگی ہی میں تصنیف ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس میں انھوں نے اپنے والد کو خطاب کر کے بعض شعر لکھے ہیں

یہ مثنوی میر اثر کی مثنوی خواب و خیال سے جو ۱۱۵۹ھ کی تصنیف ہے ۔ اقدم ہے
اس مثنوی کے دو نسخے میرے پاس ہیں ۔

(۱) محمد جان کے قلم کا نوشتہ ہے ۔ جو مصنف کے مرید اور ہمسایے ہیں ۔ اور
مصنف کی زندگی ہی میں اس کی کتابت کرتے ہیں ::

(۲) ۱۱۷۲ھ کا نوشتہ ہے ۔ عنوان کتاب پر سنہری اور رنگین گلکاری ایرانی تقلید
میں ہو رہی ہے ۔ خاتمہ میں یہ عبارت درج ہے "نسخہ متبرکہ رمز العشق تصنیف
حضرت غلام قادر شاہ قدس سرہ ساکن بٹالہ تمام گردید ۱۱۷۲ھ" دونوں نسخے خط
نسخ میں ہیں ۔ بارھویں صدی سے پیشتر قرون کی اردو تالیفات بالعموم خط نسخ میں لکھی
ہیں ، اور مسلمانوں نے گویا اس خط کو ہندی زبانوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا ۔ آج
بھی پنجابی ۔ سندھی اور پشتو زبانیں خط نسخ ہی میں لکھی جاتی ہیں ۔ اگرچہ اردو نے فارسی کی
تقلید میں نستعلیق بعد میں اختیار کر لیا ::

اس مثنوی کا وزن عروضی خالص ہندی ہے ۔ پنجابی لہجہ کی تمام خصوصیات
اس میں موجود ہیں ۔ اس مثنوی کی شرح شیخ کے پوتے شیخ ابو احمد محمد شاہ المتوفی
۱۲۲۳ھ نے لکھی ہے ۔ اس کے متعلق صاحب تذکرۂ الابرار لکھتے ہیں :-

"در رمز العشق تصنیف جد بزرگوار خود بغایت شرح مرغوب و پسندیدہ
نوشتہ و در کشف حقائق تصوف و بیان اسرار و اصطلاحات حضرات صوفیہ
... عمق فراواں و تحقیق بسیار نمودہ"

رمز العشق میں عربی الفاظ کا استعمال کثرت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے ایک وجہ تو اس کی یہ ہے، کہ تصوف کی تمام اصطلاحات عربی ہیں۔ دوسرے حضرت غلام قادر شاہ صاحب خود عربی کے فاضل ہیں۔ اور اس زبان سے زیادہ مزاولت رکھتے ہیں ذیل میں مثنوی کا نمونہ عرض ہے:

المناجیہ سے

وہی وہی نہ دوجا کوی ہ — پڑھتے ہو یا محمد ہدی
احد محمدؐ ایک سمجھا نوں — ایک ہی دیکھو ایک ہی جانوں
حمد کہو اور بہت درود — فھوالحامد والمحمود
اوّل آخر باطن ظاہر — ناہیں اس سے کوئی باہر
نامن نوره سنو جیان — والکل نوری دہر دو جہان
سمجھ لیو اور بوجھو بات — ایک ہی ذات ہے ایک ہی ذات
سب بڑیائی اسے مسلم — صلی اللہ علیہ و سلم
صلی اللہ علیہ و آلہ — ومن اشتاق بنورجمالہ
سیما شیخی عبدالقادر — نعم المولیٰ نعم الناصر
فاضل شاہ کالے کر نام — مندحقیقت کہے غلام
دیسوں سنوں حقیقت ساری — ایک حقیقت سب موں ساری
آپ سنے ار آپ سناوے — کیا کہے کچھ کہا نہ جاوے

نہی سمیع البصیر و علیم   ناہیں اس کا کوئی سہیم و

کان ولم یکن معہ شیئاً   وھو الآن کما کان کہیا

غیر کہاں ہے دیکھو پیارے   آپ ہی آپ ہے ہر ہر جانہ ہے

سات مراتب بوجھ پیارے   ہر ہر کے ہیں حکم نیارے

ست گر سوں نوں کر تحقیق   ناں ہو ملحد ناں زندیق و

فرق اور جمع موں فرق پچھان   پھر دونوں کو ایک ہی جان

بوجھ بھو تنزیہ کیوں خوب   ناں ہو ملحد ناں محجوب

بھی تشبیہ کوں جانوں نیک   پھر دونوں کوں مانوں ایک

ظاہر موں ہے وحدت کثرت   باطن موں ہے کثرت وحدت

قدم وجوب کے سب اسماء   جانوں فاعل فی الاشیاء

ازلی ابدی ہیں در کار نا   نانہ معطل ناں بے کار

اس مشہد موں ہے مسجود   فھو القاصد والمقصود

یوں ہے سب اسماء کیانی   حادث جانوں اور نقصانی

اس مظہر ہیں راکع ساجد   فھو الطالب وھو العابد

بندے کا ہے طاعت کام   واعبد ربک سنوں کلام

کرو عبادت دن اور رات   ترک اشکال سوں ہووے نجات

کرو عبادت شرع آئین   حاصل ہووے نور یقین ر

جس کوں ناہیں شرع گواہ   جانوں اس کوں تم گمراہ

حق نے کہیا نور مبین ۷   شرع کوں بیچ کتاب متین

جس کوں حاصل ناں یہ نور   طمع ہوا کا ہے مغرور

ناں ہو اس کوں قرب وصال   شرع بنا ہے قرب محال

از خاتمہ ۵

دین دنی کا پشت پناہ   والی میرا فاضل شاہ

قطب حقیقت شمس یقین ۸   نائب سید محی الدین لا

عارف کامل دل آگاہ ۸   نور محمد سر اللہ ۷

اول آخر ظاہر باطن   ہاتھ ہمارے اس کا دامن

ناہیں اس بن کو یو میرا   اس کا ہوں میں اس کا چیرا

ناں کسی سوں مجھ کوں کام   وہی ہے مولا وہی غلام

اپنے شہ کا لے کر نام   کہیا رمز العشق تمام

رمز العشق کوں جس نے جانا   بیشک حق کوں دیکھ پچھانا

حمد کہوں ار بہت سلام   اوّل آخر نیک کلام

یارب صل علیہ و آلہٖ   واجعلنی فی حبہ و آلہٖ

اللّٰھم بجود جمالہٖ   شرفنی بالحال و قالہ

آیندہ نعتیہ غزل حضرت غلام قادر شاہ کی تصنیف ہے۔ میں اس کے صرف چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں؛ ؎

سب دیکھو نور محمدؐ کا سب دیکھو نور محمدؐ کا ہو — سب بیچ ظہور محمدؐ کا سب دیکھو نور محمدؐ کا

وہ نقطہ علم ازل کا ہے وہ اصل ہر اول کا ہے — وہ مجمل ہر مجمل کا ہے سب دیکھو نور محمدؐ کا

وہ منشا سب اسما کا ہے وہ مصدر سب اشیا کا ہے — وہ مظہر ظہور خفا ہے سب دیکھو نور محمدؐ کا

کہیں ظاہر ہو مشہور ہوا کہیں باطن ہو مستور ہوا — کہیں ناظر ہو منظور ہوا سب دیکھو نور محمدؐ کا

کہیں کلمہ حق کا نوراللہ کہیں بیچ بنگوڑے عبداللہ — سبحان اللہ سبحان اللہ سب دیکھو نور محمدؐ کا

کہیں شمع کہیں پروانہ ہے کہیں دانا کہیں دیوانہ ہے — کہیں یار کہیں بیگانہ ہے سب دیکھو نور محمدؐ کا

وہ آپ ہی آپ عیاں ہوا کہیں کثرت کا ساماں ہوا — ہر شان ہو وہ ہر شان ہوا سب دیکھو نور محمدؐ کا

کہیں غوث تمام کہایا ہے کہیں مولا نام دھرایا ہے
کہیں عبد غلام کہایا ہے سب دیکھو نور محمدؐ کا

شیخ نصیر الحق

شیخ فاضل الدین کے مرید شیخ نصیر الحق ہیں۔ یہ فارسی۔ ہندی۔ پنجابی اور اُردو کے شاعر ہیں۔ اُردو میں انہوں نے خصوصاً بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ نصیر اور نصیر تخلص کرتے ہیں۔ مناجاتیں۔ تو تا برہی اور دھرولی اکثر لکھتے ہیں۔ ان کا کلام بہت ہے۔ میں صرف بعض مثالیں یہاں دیتا ہوں:-

اے نصیر او وقت ہے یہ وقت پھر نا پایئے	سر کاٹ لے کر ہاتھ پر آگے پیا کے جایئے
عورت نہ سیرت مجھ منے کس راہ پیا کوں پایئے	فاضل سائیں ہے بو الفرج اُن کے تصدیق جایئے
آتش پڑی یہ پیٹ مرے اس عشق دھندو کار کی	بھتہ تن جلا کو لا گیا صورت بھی اُنگار کی
بجلی پڑی مجھ غیب میں اس ابر آتش بار کی	فاضل سائیں کو جا کہو یہ خبر اس بیمار کی
جھانکی دکھا او پیو کی کر کرم اس آزار پر	قربان کر سب جان و تن اس غوث قطب ابدال پر
جو نام سُن سُن کانپتے تھے یہ دہا مجھ آئیاں	ہے رے حیا اب کیا کروں جیاں پر کیاں دہائیاں
نوار جمد ہر سار کی بے تیز ترکش آئیاں تو	تجھ بن مرا اب کو نہیں اے شاہ فاضل سائیاں

جو گن بھئی ہیں اے پیا جو ہر تیسد ہی پکار تی

فاضل سائیں پیہا دیہو نیں اتہہ بازی ہار دی

دیگر۔ مناجات تصنیف حضرت نصیر الحق؎

باغوث سید محی الدین لیتے خبر اس زار کی — کر کر تصدق پانوں کا جھانکی دیکھو دیدار کی

بیٹھے پڑے برہوں اگن جلتا پڑا مجھ بن دن — مجھ کوں بتا دو دہ سجن دیوے خبر دلدار کی

راکس برہوں جب آ ٹیا اس ماس سب جن کھا ٹیا — اب ہاڑ کھاون غشا ٹیا جو کسب ہے اس خونخوار کی

دیکھے بناں پیارے سجن کیونکر کٹھوں اس رین دن — لیاؤ مجھے دیو ڈکفن ہو دے مکھ جنجال کی

دیو و دکھائی اے پیا تم بن سکوں کیونکر جیا — برہوں مجھے بیکل کیا طاقت نہیں اس بہار کی

فرقان مجھ ہے رو دنا و روہ مجھے جی کھودنا — یہ دکھ ہو سیں تصور نا نشتر لگی ہے سار کی

کب تک میں اس دکھ مون جل ناب نہ چخریں گزن — سر کاٹ کر آگے دھروں کر بیٹھ اس دلدار کی

دہ بیو پیر زادہ ہے سب جگ کا شاہنشاہ ہے — رہ محی الدین دلخواہ ہے ہو خاک اس دربار کی

فاضل سائیں کرنا کرم چرنوں لگی کی کر شرم — لیاؤ مجھے دیو و حرم جہاں کی دیلادیار کی

کہہ اے نصیرا کیا کروں برہوں کی چکھ میں جر مروں
جرتے نہ ہرگز دم بھروں یہ تصور نا گفتار کی

شاہ مُراد

شاہ مراد غالباً اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیں اُن کے حالات سے واقف نہیں۔ نمونۂ کلام ذیل میں عرض ہے ؎

اب کیا کہے کوئی مرے پیا جب انکھوں سے پیا دور ہویا — تن لکڑی ہو جل راکھ بھیا یہ سینہ گرم تنور ہویا

وہ نور سجن کوں جس نے دیا یہ چاند چہرے کا حق نے دیا — یہ سورج ہے وو آپ پیا پر نور چہرہ یا مشہور ہویا

وہ قد پیا کا قامت ہے یا شعلۂ نور کرامت ہے — یہ قد نہیں ہے قیامت ہے وہ دھوم پڑی جگ شور ہویا

تیرے مکھڑے پر اک خال پیا جس دیکھا گھر پامال کیا — یہ نقطہ ہے بسم اللہ کا جو مصحف پر مسطور ہویا

وہ خال لبوں پر سو رہا جیوں مہل پر عاشق بھوڑا — یا زہر پڑا گر جو پڑا یا قند شکر پر مور بڑ یا

بن پانی چاہ معمور نہیں بن جانی دل مسرور نہیں — بن درد عمل منظور نہیں جو عاشق ہے مغفور ہویا

اس خاکی تن کوں چار کروں سر صدقہ تیرے ار کروں — تجھ باج نہ دوجا یار کروں یہ نازک تن منظور ہویا

جس مرنا الحق جان لیا اس خون جگر کا چھان لیا — سر کھکر جیو قربان کیا وہ جیو سولی منصور ہویا

وہ مجنوں آپی لیلیٰ ہے وہ یوسف آپ زلیخا ہے — وہ وامق آپے عذرا ہے مشتاق ہو خود مغرور ہویا

دن رات پیا بن سوتی ہوں تنہائی میں جیو کھو رہتی ہوں — مکھ لعل ترے بن تھوتی ہوں نت رونا مجھ دستور ہویا

ترے درسن لی مدہ ماتی ہوں ترے کارن سیج پر جاتی ہوں — ترے گن کی مالا گاتی ہوں لگ تار اُن تن طنبور ہویا

دن رات جو تیری چاہ مجھے پیا اگ برہ کی ناؤ ہے — نت جلنے میری ماں مجھے جل مرمن تن کوہ طور ہویا

یہ شعر عجب استاد سوں ہے یہ دلبر جس آباد سوں ہے

یہ ریختہ شاہ مراد سوں ہے مقبول ہو یا منظور ہو یا

یہاں ایک ضروری امر کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اوپر میں نے جس قدر پنجابی اُردو نظموں کے نمونے دیئے ہیں وہ اس تحریک سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ جو بارھویں صدی کے ربع دوم میں دہلی میں دلی اورنگ آبادی کے دیوان یا خود دلی کی آمد سے تعلق رکھتی ہے۔ میر حسن کا بیان ہے۔ کہ دلی عہد عالمگیر میں دہلی آئے۔ لیکن آزاد ۲ سنہ جلوس محمد شاہی اس کی آمد کا سال بتاتے ہیں۔ میں آزاد کے بیان کو ترجیح دیتا ہوں۔ کیونکہ ولی کا محمد شاہ کے عہد میں دلی میں موجود ہونا خود دلی کے ایک شعر سے جو مولانا آزاد نے آبِ حیات میں نقل کیا ہے ثابت ہے ؎

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین جا کہو کوئی محمدؐ شاہ سوں

گویا بقول آزاد ولی ۱۱۳۵ھ میں دہلی میں وارد ہوئے۔ اور اس عہد سے دہلی میں اُردو غزل گوئی عام رواج پا گئی ورنہ اس سے پیشتر شعرا کے لئے فارسی یا بھاشا کا میدان کھلا ہوا تھا جس میں وہ اپنی طبیعت کی صنعت گری کی بہار دکھاتے تھے۔ اردو میں غزل گوئی کی بنیاد اگرچہ دلی کے عہد سے بہت قدیم ہے۔ لیکن ہندوستان میں اولیت کا تاج ولی کے سر پر ہی رکھا گیا۔ چنانچہ ہمارے قدیم تذکرہ نگاروں نے اسی کو اُردو شاعری کا آدم مانا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ کہ ہندوستان میں ولی کے

طفیل اس قسم کی شاعری جو قدرتاً مسلمانوں کی طبیعت اور رجحان کے زیادہ مناسب تھی رواج میں آئی ۔ اور یہی وجہ ہے ۔ کہ یہ تحریک بڑی سرعت کے ساتھ اس عہد کے تعلیم یافتہ طبقہ کے قلوب میں گھر کر گئی ۔ کیونکہ اس شاعری کا دارو مدار زیادہ تر فارسی جذبات پر تھا ۔ اور فارسی خواں گھر گھر میں موجود تھے درحقیقت اردو شاعری فارسی کا پرتو ہے ۔ فارسی کے تمام قواعد و ضوابط عروض و اقسام شعر کو اس میں منتقل کر لیا گیا ہے ۔ وہی بحریں ہیں ۔ وہی ردیف و قافیہ کی پابندی ۔ وہی خیالات و جذبات ۔ صنائع و بدائع تشبیہات استعارات و تلمیحات وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن پنجاب کی نظموں کے گذشتہ نمونے کئی امور میں مختلف ہیں ۔ اول تو ان کی بحریں زیادہ تر مقامی ہیں دوسرے ان میں اگرچہ ردیف کی پابندی کی جاتی ہے ۔ لیکن قافیہ کا لانا لزوم مالا یلزم مان لیا گیا ہے ۔ پھر وہ جذبات میں فارسی سے مختلف ہیں ۔ ہندی میں عاشق اکثر عورت ہوتی ہے ۔ ان نظموں میں بھی یہی خصوصیت موجود ہے ۔ وہ فارسی صنائع و بدائع و تشبیہات سے بالکل عاری ہیں اور اس شاعری کا مدار ایہام پر نہیں ہے ۔ جیسا کہ ہم ولی اور اس کے پیروؤں میں دیکھتے ہیں ۔ ہم کو تعجب آنا چاہیے کہ اردو کے لئے دو مختلف مرکزوں میں دو ایسی تحریکیں ایک ہی وقت میں مصروفِ کار ہیں ۔ لیکن ایک کو دوسری کی خبر نہیں ہے ؟

اس صدی کے تیسرے ربع میں دہلی کی تحریک پنجاب میں پہنچ گئی ہے ۔ اور مختلف نظموں میں ہم اسکا اثر دیکھتے ہیں ۔ سب سے بیشتر جذبات میں اور زبان میں

تبدیلی محسوس ہوتی ہے پرانے الفاظ اکثر متروک کر دیئے جاتے ہیں۔ اور تکلف رفتہ رفتہ مذاق میں غالب آنے لگا ہے۔ قدیم سادگی برطرف ہو جاتی ہے۔ اور طبائع میں میلان زیادہ تر تصنع کی طرف پیدا ہو گیا ہے بحریں فارسی اختیار کر لی جاتی ہیں اور ردیف و قافیہ کا التزام ضروری مان لیا جاتا ہے ؛

محمد جان

محمد جان حضرت غلام قادر کے مرید و رسالے ہیں۔ تصوف میں ہم صاحب تصنیف اور فارسی و اردو میں شعر کہتے ہیں۔ یہی محمد جان مثنوی رمز العشق کے کاتب ہیں۔ جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ میں اپنے عزیز شاگرد نسیم ذکاء اللہ متعلم دائرہ اسلامیہ کالج کا ممنون ہوں کہ انھوں نے چند اوراق محمد جان کی نظموں کے بہم پہنچائے محمد جان سے پنجاب کی نظموں میں دہلی کا پرتو نظر آنے لگتا ہے۔ اور فارسی بحروں کا رواج ہو جاتا ہے۔ نمونہ کلام :-

بلبل کی طرح دل کے بہلانے کوں کیا کہیئے ۔ زنجیر میں سلسل کی بھس جانے کوں کیا کہیئے

رو رو کے غبث دل کے جلجانے کوں کیا کہیئے ۔ بسمل ہو تڑپتا ہے مر جانے کوں کیا کہیئے

کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیئے ۔ سر اپنے کوں ہر صبح پتھر سوں ٹپکتا ہوں

کر یاد پری رو کی رو رو کے سسکتا ہوں   دو نین دو دریا کر بن بن پھر گنتا ہوں

کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیے   کچھ کرتے ہو اے یارو مجھ زار کی اب کاری

پلکوں کی خدنگوں سیں و تیر ہے ستمگاری   دلبر کے جفا سیتی ہر وقت گہر باری

ہر صبح کا وہ رونا ہر شام کی یہ زاری   کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیے

کر یاد تیری صورت جی وارنے کرتا ہوں   سر کاٹ کے گردن سیں تجھ پاؤں تے دھرتا ہوں

تجھ تیغ تلے اگر دم ایک نہ پھرتا ہوں   ہنستا ہوں خوشی سیتی پھر شوق سیں مرتا ہوں

کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیے   تجھ تیغ تلے کہ تو سر اپنے کوں دھر دیجے

خونابہ آنکھوں کا ہر شام و سحر پیجے   مرنا ہے لکھا سر پر کیا اور یہ دھر دیجے

قسمت میں لکھا جو ہے دنیا میں تم بھر لیجے   کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیے

آ ذبح نہ کر ہم کوں ڈر اپنے خدا سیتی   کیا قتل غریبوں کوں کرتا ہے حیا سیتی

تن پر زرہ ہی پہنے ہے تجھ جور و جفا سیتی   رو رو کے پڑھتا ہوں ہجراں کی بلا سیتی

کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیے   کیا پوچھتے ہو مجھ سیں غم یار کا کھاتا ہوں

کر لخت جگر اپنا آنکھوں سے بہاتا ہوں   محبوب کے ہجراں میں دن رین لکھاتا ہوں

گذرے ہے جو کچھ مجھ پر دلبر کوں سناتا ہوں   سنتے ہو اے یارو کچھ چشم مروت ہے

مرتا ہوں میں غم سیتی کچھ تجھ میں نخوت ہے   خوں آنکھوں سیں جاری ہے کچھ مجھ پیں نفقت ہے

کچھ میری کم و کاری کیا ایسی اخوت ہے   کیا کام کیا دل میں دیوانے کوں کیا کہیے

سنتا ہے محمد جان کیا گریہ و زاری ہے   خاموش صفت ہونا کیا بات پیاری ہے

وہ فضل کرے اپناں یہ بات نیاری ہے   مغرور عبادت پر احسان شماری ہے

کیا کام کیا دانت دیوانے کوں کیا کہیے تو

یہاں ایک نامعلوم شاعر کی غزل کے چند اشعار دیئے جاتے ہیں ۔ جن کے لئے گویا انشا اللہ خاں نے مصرع "بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے" لکھا ہے اس میں پہلا شعر بحر رجز میں ۔ دوسرا رمل و رجز میں ۔ تیسرا رمل میں اور چوتھا رمل و رجز میں ہے ۔ چنانچہ ؎

اس شمع رو کوں دیکھ کے دل جل کے دیوانہ ہوا   تیری گرہ کا کیا گیا میں سب سیں بیگانہ ہوا

ہے تجھے میوہ کی خواہش چل توڑ لینگے باغ میں   تیری تو تماطر باغ میں انگور پیدا نہ ہوا

ہو فدائی منت کر رہے لیلئے صاحب جماں   مثل مجنوں کے معاصر مست دیوانہ ہوا

اے صنم تم مت نہ پوچھو بات میرے حال کی   تیرے کناں کو دیکھ کر میں آپ دردانہ ہوا

اس نقص کے باوجود زبان میں بے حد اصلاح ہوگئی ہے ؛

میاں احمد

غزل ذیل ایسی بیاض سے منقول ہے۔ جو ۱۱۶۱ھ میں لکھی گئی ہے ؎

چوں شب گذشت صبح ہوئی تب سمجھ پری ۔۔۔ جاگن نہ ہوا ایک گھری تب سمجھ پری

جب مرگ کا پیالہ پیا آنکھ کھل گئی ۔۔۔ جب کھاٹ پر چڑھ دیہ دھری تب سمجھ پری

نوشک نہالیوں سے مجھے فکر نا ہوا ۔۔۔ جب اینٹ زیر سیس دھری تب سمجھ پری

جس وقت یار چھوڑ چلے ہم رہے نکو ۔۔۔ منکر نکیر پوچھ دھری تب سمجھ پری

حساب کا جو وقت ہوا آنکھ کھل گئی ۔۔۔ جیتی عمل کی آپ پڑی تب سمجھ پری

عمر اتمام گذر گئی عمل نا ہوا ۔۔۔ جب عمر کی دوپہر ڈھلی تب سمجھ پری

احمد کوں (کذا) طرف کوئی نہیں جز خدا رسول
جب فضل پر امید دھری تب سمجھ پری

محمد بارہویں صدی کے منتصف دوم سے علاقہ رکھتے ہیں ۔ مرزاع آئندہ انھی کا کلام ہے ؎

قربان خدا کے ہوں جس راہ دکھلا ہے
اور ہوش دیا مجھ کوں جس سینے یہ مجالا ہے

محبوب مرا سندر سب جگ کا اوجالا ہے
اور عرش و فرش کے بیچ سب چیز میں بالا ہے

دل تپتا ہیں خوں کو کر آنکھوں سے بہاتا ہوں
اور خون جگر تائیں ہر آن میں کھاتا ہوں

فریاد و فغاں سیتی اک دھوم مچاتا ہوں ۲
پھر بار نہ پہنچتا ہے یہ کون سا پیالا ہے

آہوں سے مری بدری افلاک اوپر چھائی
سینے سے ملس آتش ہو برق عجب دھائی

نیننوں سے برس بوندیں ہر نہر ابل آئی ۲
اس عشق کی شورش کا کچھ راہ نرالا ہے

دن رات تڑپتا ہوں اس یار کی صورت کوں
آرام گیا تجھ سوں پہنچا ہوں مہورت کوں

تا جاں سیں فدا کر کر پیارا کی مورت کوں
سر کاٹ دھروں آگے یہ طور سکھالا ہے

بن یار کے اب جینا دشوار نظر آوے
تا جان نکس جاوے یا اس کی خبر آوے

محبوب نہیں آتا کس طور صبر آوے
لاچار اگن لاگی جیو جان کو جالا ہے

اے شاہ مرے والی مرتا ہوں بناں تیرے
تجھ سار کے تجھ در پر کتنے ہی پڑے جیرے

الفت میں تیری بریں رہتی ہیں مجھے گھر سے پھر ہاتھ میں گل لائے گردن پہ بہالا ہے

تم غوث جہاں کے ہو سکھ بخش تمہارا ہے دیکھیا ہوں پر ابر نا تجہ آگے پکارا ہے

دیدار دوا پنا تم ہجران نے مارا ہے نوکر ہوں تیرے در کا تیرا ہی تجھالا ہے

تیہ طرف براد دیکھوں شاید کہ کرم ہووے اس جینے سیں چھٹ جاؤں جاں میری تن سکلے تو بہے

دل لاتی سیں نکس آوے اور مکھ کو سیج دھووے دنیا کے تعلق سوں یہ دیس نکالا ہے

بس کرتوں محمد اب اس قصہ عجائب سیں کس کس نے کیا ورک اس بات غرائب سیں

پیر اپنے سیں تو جا کر دو در نوائب کہوں گا
جن پیر کی صورت سوں سب جگ کا اجالا ہے

(از بیاض پروفیسر آذر)

بدھ سنگھ کا زمانہ بارھویں قرن ہجری کے نصف ثانی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی غزل ایسی بیاض سے نقل کی جاتی ہے۔ جو ۱۱۹۱ھ سے قبل کی نوشتہ ہے۔

و ہو ہذا :-

ڈھونڈا بہت سجن پر میں پایا نہیں ہنوز — ملیار قیب ساتھ جو آیا نہیں ہنوز

ہر یک نگاہ ترچھی ہوا خاک سار دل — دامن کے اُس کے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز

شمشیر چشم کھینچ ڈرانے ہو کیا سجن — سرمہ کے سنگ سوں آب دوایا نہیں ہنوز

اس زلف پیچدار کیا پیچ بیچ دل — مار سیہ کوں ہاتھ لگایا نہیں ہنوز

بدھ سنگھ نہ ہو تو بیدل از اغماض دلفریب
گر ہے جواب صاف خط آیا نہیں ہنوز

بارھویں صدی کے ایک پنجابی سکھ سے اس سے بہتر نمونہ شاعری کی توقع کرنا غالباً ہماری زیادتی ہو گی۔

خفیہ بیگم

ایک دلچسپ پہلو اس عہد کا یہ ہے۔ کہ عورتیں بھی اردو میں شاعری کرنے لگی ہیں ان میں خفیہ بیگم خفیہ تخلّص والدہ میر صاحب ہیں۔ ذیل کی غزل انہیں کی یادگار ہے ؎

ہتا سخن بے دل میں سمائی ہو جاوے گی | جہاں منہ سے بات نکلی پرائی ہو جاوے گی

اب پھول سے جدا نہ کرو عندلیب کو ال | فصل خزاں میں آپ جدائی ہو جاوے گی

اس آرسی سے دور کرو زنگ کینہ کا تو | تب تو دلوں میں انکے صفائی ہو جاوے گی

یا تو فغاں کرے گی مری کوچہ او سے اثر | یا آہ میری تیر ہوائی ہو جاوے گی

میرے بلانے سے ترا کوچھ گھٹ نہ جاویگا | پر عاشقاں میں میری بڑائی ہو جاوے گی

میرا خیال لوگوں نے پکڑا ہے آکے کیوں | ناحق کسی سوں میری لڑائی ہو جاوے گی

اس دعوی میں تو خفیہ خدا کوں پکھو گے میں | اس کی طرف تو ساری خدائی ہو جاوے گی

ہ ایک دن سودا کے ہاں میر سوز تشریف لائے۔ ان دنوں شیخ علی حزیں کی ایک غزل کا چرچا تھا۔ سب کا یہ مطلع ہے ؎ میگرفتیم بجاناں سر راہے گاہے - او ہم از لطف نہاں داشت نگاہے گاہے
میر سوز مرحوم نے اپنا مطلع پڑھا ؎ نہیں نکلے ہے مرے دل کی اپاہے گاہے ؛
اے فلک بہر خدا رخصت آہے گاہے ؛ مرزا سن کر بولے کہ میر صاحب بچپن میں ہمارے ہاں پشور کی ڈومنیاں آیا کرتی تھیں یا تو جب یہ لفظ سنا تھا۔ یا آج سنا ہے۔ میر سوز بچارے ہنس کر چپکے ہو رہے ؛
(آبحیات)

میر صابر

میر صابر نے اس کا جواب دیا ؎

کب جانتے تھے تجھ سیں جدائی ہو جاوے گی
غم کی مناوی دکھ کی دہائی ہو جاوے گی

ہونے دے مجھ کوں اپنا سدق اب ایک بار
کوچے میں تمہیں پیارے تیری بھلائی ہو جاوے گی

گر سینہ صاف ہو کھلے بند ان گلے لگو
تنتے میں دل کی کامروائی ہو جاوے گی

ابرو کی چین دور کر آخر سنو گے تم
یہ ترشی ایک روز مٹھائی ہو جاوے گی

دیکھو نگاہ قہر سوں گر اے اگر رقیب
دس بیچیا کوں چشم نمائی ہو جاوے گی

صابر یہ بات جس نے کہی آفریں اوسے
جہاں منہ سی بات نکسی پرائی ہو جاوے گی

مخمس ذیل بھی اسی عہد کا معلوم ہوتا ہے ؎

رات پر خوف ٹھگ لگا ہیگا   راہ میں چور کا دبا ہیگا   تو رین اندھیار موں دغا ہیگا
یہ تجھے سودنا خطا ہیگا   جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

جاگدے پو نہیں پڑے کوئی چور   جاگدے پو نہیں کرے کوئی زور   جاگنے کا نفع ہو ہیگا زور
جاگن خوب ہے خصوصاً بھور   جاگیو جاگنا بھلا ہوگا

اے بناؤ تو تجھے نہیں سونا   سودنا پونجی ہاتھ سوں کھونا   پونجی پھرنا ہاتھ میں ہونا
بے خبر اس مرا موں نہیں سونا   جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

اے مسافر تجھے ہے جانا دور   ماندہ ہو کر تھکا ہیں چلنا جور   اس سرا بیچ توں نہ ہو مغرور

نیند کے ہاتھ مارے گئے ہیں سور   جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

کون اس تھانہ میں رہا ٹھیرا   ڈاکہ ہے ہاتھ موں دیں سحرا   باہر و پر نہ بھول وہ لہیرا

ماہر و ہو نہنا اپنا گھیرا   جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

نیں جو کو جہ کرنا ہے سو کر علاج   پھر نہ لہر دے گا یہ تیرا راج   او لٹ ماریں گے تیرے سر سوں تاج

اس وقت کیا رہیگا تیرا لاج   جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

کچھ سمجھ بوجھ لے میرے ناداں   اپنی غفلت سوں تمس نہ ہو ناداں   رات کوں سنتا ہیں تو اپنے کان

دمبدم بولتے ہیں گشتی بان   جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

ساتھ تیرے رہیں فرشتے دو   نیک و بد کرتا ہیں سو لکھیں او   قبر میں پوچھوں گے فرشتے دو

اس وقت کیا جواب دیگا او   جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

رحمٰن

اگر مجھ باغ میں دیکھے تو بلبل در چمن لرزے   میرے غم کی اگن سن کر سعد دوزخی اگن لرزے

جنیئو پہن کر گل میں کروں پھر بت پرستی میں   مرا تا بت کفر دیکھ کر یکایک برہمن لرزے

اگر مجنوں کی تربت پر گذر جاؤں دیوانہ ہو   جو میرے حال کو دیکھے تو مجنوں در کفن لرزے

اگر رحمٰن کہیں جگ میں سخن خوبی نزاکت سوں   عجب کیا ہے غزل سن کر ملک سارا دکن لرزے

(از بیاض پروفیسر آذر)

نعمت اللہ

جس دل میں ہے غمِ یار کا عشرت کے تئیں کہہ کیا کرے
جو تشنۂ لبِ یار کا شربت کے تئیں کہہ کیا کرے

جو عشق کی آتش میں جل طالب ہوا دیدار کا تو
دوزخ سیتی وہ ڈرتا نہیں جنت کے تئیں کہہ کیا کرے

جو عشق کے بازار میں بدنام اور رسوا ہو یا
طالب نہیں وہ نام کا عزت کے تئیں کہہ کیا کرے

اسبابِ دنیا ترک کر جو بے سر و سامان ہوا
حاجت اسے کیا مال کی دولت کے تئیں کہہ کیا کرے

نقمان و افلاطون جیسے دنیا سیتی جاتے رہے
دارو نہیں کوئی موت کا حکمت کے تئیں کہہ کیا کرے

جب عشق خوباں از ازل ہے نعمت اللہ کے نصیب
تقدیر پھیرے کس طرح قسمت کے تئیں کہہ کیا کرے

(از بیاض پروفیسر آذر)

بارہویں قرن کا ربع آخر پنجاب میں بے شمار شعرا دکھاتا ہے۔ جو کثرت کے ساتھ اردو میں شاعری کرتے ہیں۔ زبان صاف ہو جاتی ہے۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں۔ کہ ان کے کلام میں اور ہندوستانیوں کے کلام میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس عہد کے شعرا میں ان لوگوں کا شمار ہونا چاہیئے۔ نامدار خان دت محمد غوث بٹالوی۔ دلشاد پسروری (پسروری) خوش دل۔ فدوی۔ شاہ مراد۔ رام کشن وارث شاہ وغیرہ لیکن سب سے بیشتر بعض ایسی نظموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جو سکھوں کی تاریخ سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ اور ان کی تاریخ تصنیف ہم کو معلوم ہے:

نامدار خان دتؔ

رنجیت سنگھ کا دادا چڑت سنگھ سکرچکیا مثل کا بانی ہے۔ جو امیر سنگھ کی بیٹی سے شادی کر کے بہت طاقتور ہو گیا۔ ابتدا میں اُس نے ایمن آباد کے مغل فوجدار کو قتل کر کے شہر کو لوٹ لیا ۱۷۵۶ء میں اس نے گوجرانوالہ میں ایک قلعہ تعمیر کیا جس پر

ؔ دت موہیال برہمنوں کی ایک شاخ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بھاردواج رشی کا لڑکا درونؔ تنگدست تھا۔ اور اپنی محنت اور زور بازو سے کما کر کھانا چاہتا تھا جب افلاس سے مجبور ہوا تو اُس نے سپہ گری سیکھی اور اس فن میں ماہر ہو گیا۔ اس کا نام درون اچارج تھا یہی بعد میں کوروں اور پانڈوں کا اتالیق مقرر ہوا اور مہابھارت کی جنگ میں سپہ سالار تھا۔ درون اچاریہ کی اولاد نے سپہ گری کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ چنانچہ دت بھی اسی کی اولاد میں محسوب ہے۔ یہ لوگ بہادری اور سخاوت میں مشہور ہیں اور خیرات لینے کے بجائے خیرات دیتے ہیں۔ چنانچہ ؎ دت دانے دان کے بورے۔ ہاتھ کے سخی تیغ کے صورے۔ کئی دت حسینی کہلاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت امام حسین کی مدد پر دشمنوں سے لڑتے ہیں، کہتے ہیں کہ ملک عرب میں بھی اُن کا راج تھا۔ رہب ۲ جو عرب کے تخت پر بیٹھا دت تھا۔ بعض ایسے واقعات کی بنا پر کہا جاتا ہے۔ دت سلطان آدھے ہندو آدھے مسلمان (گلشن موہیالی از گوری شنکر) یہ اطلاع مسٹر کنہیا لال ایم۔ اے نے بہم پہنچائی ہے؀

حاکم لاہور نے اس کی بڑھتی طاقت کو پست کرنے کے لیے اس پر چڑھائی کی۔ لیکن
جرت سنگھ اور اس کے اتحادی جان توڑ کر لڑے۔ اور حاکم کو شکست دی۔
اس فتح نے جرت سنگھ کے حوصلوں کو اور بھی بلند کر دیا ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۲ء میں احمد شاہ کے
ہندوستان آنے پر جرت سنگھ نے اپنے اہل و عیال کو جموں بھیج دیا۔ اور آپ افغانی
فوجوں کے دائیں بائیں لگا رہا۔ احمد شاہ کی واپسی کے بعد جرت سنگھ نے وزیرآباد کو
لوٹ لیا۔ اور وہاں کے مغل فوجدار کو نکال کر خود شہر پر قابض ہو گیا۔ اسکے بعد احمدآباد
پر قبضہ کر لیا۔ روہتاس اس نے نورالدین خاں بامیزئی سے چھین کر دہنی۔ چکوال
جلالپور۔ پنڈ دادن خاں پر قبضہ کر لیا۔ صاحب خاں عامل پنڈ دادن خاں نے بھاگ
دم دے کر اپنی جان بچائی ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء کے قریب جموں کا راجہ رنجیت دیو اپنے فرزند
ور دلی عہد برج راج سے سخت ناراض تھا۔ اور چاہتا تھا کہ برج راج دیو کے
بجائے اپنے دوسرے فرزند دلیل سنگھ کو ولیعہد بنا دے۔ برج راج دیو نے جرت
سنگھ کو اپنی امداد کے لیے بلایا۔ جرت سنگھ۔ حقیقت سنگھ اور جے سنگھ (کنہیہ مثل)
کے ساتھ مل کر ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں ایک بڑی فوج کے ساتھ جموں کی طرف روانہ ہوا۔
رنجیت دیو نے مقابلہ کے لیے چمبہ، کانگڑہ، نورپور، بسیہر سے اور بھنگی مثل سے
امداد منگوائی۔ بسنتی ندی کے قریب مقابلہ ہوا اور ایک غیر فیصلہ کن جنگ ہوئی۔
جس میں اتفاق سے جرت سنگھ اس کے کسی ہمراہی کی بندوق کے پھٹنے سے ہلاک ہوا[1]

---

[1] تاریخ پنجاب (انگریزی) از سید محمد لطیف۔

ہو جاتا ہے ۔ اس وقت نامدار خاں ولد چترت سنگھ کا مرثیہ لکھتا ہے :-

افسوس ہے جہاں کے ثبات اور قرار پر — اس باغ بے وفا کی خزاں اور بہار پر
اس پیر زال عروس نما کے نگار پر — دو دن کی زندگانی بے اعتبار پر
دلبستگی نہ کر دم بے اعتبار پر

احوال چترت سنگھ کا لکھتا ہوں فی المثل — پہونچا جب اس کا حکم قضا سیں دم اجل
آیا ولایت اپنی سے لے کر ہجوم دل — فرصت نہ دی تعمانے چلا چل ہیں ایک پل
آیا اجل کا تیر ہرن کے شکار پر

آیا ہجوم فوج میں تی کو کے اضطراب — جیوں صبحدم جلال سوں چڑھے ہے آفتاب
تنہا ہوا اپنی فوج سوں کر جنگ پر شتاب — ہنگامہ ہجوم مخالف نہ کر حساب
یکبارگی چلا کارزار پر

دل موں غرور اپنی شجاعت کا دھر چلا — گویا کہ رخصت اپنے رفیقوں کو کر چلا
تقدیر کے حساب سیتی گرچہ مر چلا — لیکن خیال مرگ سیتی بے خبر چلا
پوچھا نہ کچھ جو کھیل ہے دم کے شمار

جیدھر سوں توپ ہلکہ چلتی تھی بے شمار — آیا اسی طرف سے صدا کرتا مار مار
تھی ہاتھ میں تفنگ ولایت کی برق وار — کر جاتی گوں چاک پیالہ پتہ ہی تمرار
کندھے سوں ٹیکی جلد گئی سر کو مار کر

اور کر لگی تفنگ کی چھپر دماغ میں تو — چون تند باد یوں کا جھکا چراغ میں

تھا منتظر نہنگ اجل کا سراغ میں — عالم کے دلموں داغ لگا اور دماغ میں

افسوس ایسے مرد کا مرنا دیار پر

تیری قضا سوں چیڑ بندوق تیز تھا ہا — یک لخت دور کا سنہ سر ریزہ ریزہ تھا

ہر سو صدائے کوچ دم تیز خیز تھا — وہ وداں نہ تھا جہان کو مگر رستخیز تھا

عالم کے دلموں داغ لگا یادگار پر

دنیا میں چند روزہ جو ہے زندگی مراد — اس مرد کو بخوبی و نیکی کرینگے یاد

دنیا میں نیک نام تھا عقبیٰ میں ہوئے شاد — لکھتا ہوں مجمل اس کی تاسف کا یاد داد

تقریبات فرض تھی یہ نامدار پر

(از بیاض پروفیسر آذر)

یہ نظم اس کی معاصر نظموں سے جو دہلی اور لکھنؤ میں ان ایام میں لکھی جا رہی تھیں۔ زبان کے لحاظ سے کم نہیں ہے۔ بیان حقیقت اور جذبات کی ادائگی میں انتہا درجہ کی سادگی سے کام لیا گیا ہے۔ اور مبالغہ نام کو بھی نہیں۔ واقعات ایسے پیرایہ میں ادا ہوئے ہیں جو بالکل قدرتی اور فطرتی ہیں۔ ذرا مصرع "جوں صبحدم جلال سوں چڑھتا ہے آفتاب" پر غور کرو۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جن سے مصنف کے پنجابی ہونے کا سُراغ چلتا ہے۔ مثلاً جھٹکا بجائے جھونکا۔ چیڑ بمعنے ریزہ و کوچ ؛

تاریخ کے برخلاف نامدار خاں کا بیان ہے کہ یہ خود چڑت سنگھ کی

بندوق بھی بو پھٹی۔ اور خود جرأت سنگھ کے ہاتھ میں پھٹی یعنی کوئی چنگاری بھاگی سے اگر بندوق کی پیالی میں ڈبل کے استعمال سے پہلے اس کی بجائے بندوق کی نال میں ایک سوراخ ہوا کرتا تھا جس سے بارود کا تعلق باہر سے کوٹھی کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ یہ سوراخ جو باہر کی طرف سے پیالی کی شکل کا ہوتا تھا۔ پیالی کہلاتا تھا۔ جاگی یعنی بتی کے ذریعہ سے پیالی کی بارود آگ لیتی تھی۔ اور کوٹھی کے بارود کو مشتعل کر دیتی تھی۔ جس سے بندوق چلتی تھی) اتفاقیہ گر گئی۔ جرأت سنگھ نے بندوق پھینک دی۔ اور اس کی بعض کنیں اچھل کر اس کے سر میں لگیں۔ جس سے اس کا سر پاش پاش ہو گیا۔ ہمیں اس بیان کو جرأت سنگھ کے وفات کے سلسلہ میں زیادہ صحیح تسلیم کرنا چاہئے:۔

محمد غوث بٹالوی

سکھوں کی کنہیا مثل کا بانی جے سنگھ ہے۔ یہ موضع کاہنہ کا جو لاہور سے پندرہ میل
جنوب میں واقع ہے۔ باشندہ تھا۔ ۱۷۶۲ء میں احمد شاہ ابدالی کی پنجاب سے واپسی
کے بعد جے سنگھ نے قصور پر حملہ کیا۔ اور ایک ماہ کے محاصرہ کے بعد اس پر
قابض ہو گیا۔ جے سنگھ سرہند کی اس جنگ میں بھی شامل تھا جس میں زین خاں
مارا جاتا ہے۔ اس کے بعد جے سنگھ ایزد بخش رئیس گھروٹہ کو ایک سخت جنگ کے بعد
اپنا مطیع کر لیتا ہے۔ نورپور، دتارپور اور سیبہ کے رؤسا اس کے باجگزار بن جاتے
ہیں۔ بلکہ یہ کو بہت جلد تسخیر کر لیتا ہے۔ بعد میں سنسار چند والی کٹوچ کی امداد کیلئے
جو کانگڑہ کا دعویدار تھا۔ روانہ ہوتا ہے اور فتح کر کے خود قابض ہو جاتا ہے۔ قصور
پر سخت جنگ کے بعد دوبارہ قابض ہوتا ہے۔ مگر نظام الدین خاں پھر اس پر
قبضہ کر لیتا ہے۔ بٹالہ لو کہا تو یہ رام گڑھیا مثل والوں کا قبضہ تھا۔ جے سنگھ نے
جسا سنگھ رام گڑھیہ کو ستلج پار نکال کر ان مقامات پر بھی قبضہ کر لیا۔ لیکن جے سنگھ
نے مسلمانان بٹالہ کو سخت اذیتیں پہنچائیں۔ شہر کو لوٹ لیا۔ اور ان کے مکانات
جلا دئے۔ حضرت شیخ غلام غوث بٹالوی (متوفی ۱۱۹۵ھ) کو جو حضرت شیخ
غلام قادر کے فرزند اور جانشین تھے قید کر دیا اور ان کا اثاث البیت تک لوٹ

لیا۔ اسی سلسلہ میں ان کا بے نظیر کتب خانہ لوٹ لیا گیا۔ مصنف تذکرۃ الابرار اس کے متعلق کہتا ہے :-

"تا آنکہ قدم درمیان وقاحت گذاشتہ دست تعدی بر ماکن و مساکن آنحضرت دراز کردہ متاع و اشیا و مواد و اسباب نقودی و جمیع اثاث البیت بغارت بردند خصوصاً جواہر نایاب کتب کہ از نوادر روزگار عجائب عالم بر روئے ہور چندیں مساعی جمیلہ و انواع نقودات جمع آمدہ شب و روز در مدرسہ شریفہ مستعمل طلاب بود بدست آنچناں جہال افتاد کہ کتاب را از کباب و اسباب را از اسباب فرق نمی کردند۔"

۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۴ء میں سنسار چند والی کٹوچ، جیسا سنگھ رام گڑھیہ اور مہا سنگھ پسر چڑت سنگھ نے باتفاق ہمدیگر جے سنگھ پر چڑھائی کی اور موضع اچل کے پاس بٹالہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر فریقین میں جنگ ہوئی۔ جے سنگھ کی فوجیں اس کے فرزند گوربخش کے زیر کمان تھیں۔ گوربخش بڑی بہادری سے لڑا۔ لیکن موت کا کیا علاج قضاء کار ایک تیر اس کے سینہ پر آ کر لگا جس نے عین میدان جنگ میں اس کا کام تمام کر دیا۔ سپہ سالار کی موت نے جنگ کا فیصلہ کر دیا اور جے سنگھ کو شکست مل گئی۔ بوڑھا جے سنگھ اپنے نوجوان اکلوتے بیٹے کی وفات دیکھ کر بالکل بددل ہو گیا۔ اس نے تیر و ترکش پھینک دئے۔ گھوڑے سے اترا اور زار و قطار روتا ہوا دشمن کی گولیوں کی زد میں جا کھڑا ہوا۔ غنیم اس بوڑھے جنگ آزما کی

نوحہ و شیون سے بے حد متاثر ہوا اور کسی نے اس پر حملہ نہیں کیا۔

گوربخش سنگھ کی وفات کے موقعہ پر بٹالہ کا ایک شاعر محمد غوث جو بٹالہ کی کچہری میں گوربخش سنگھ کی فوجداری میں ملازم تھا۔ اس کا مرثیہ لکھتا ہے۔ مرثیہ چونکہ درازہ ہے۔ اس لئے یہاں صرف چند اشعار پر قناعت کی جاتی ہے ؎

بہار اندر آیا باغ جہاں　　قضا سوں پڑی چھول باد خزاں
گرا آہ پاؤں سے سرو رواں　　پڑا ہر طرف میں یہ شور و فغاں
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں　　کدھر موتیانوالہ ہے نوجواں
ہوا ہے یہ ماتم سوں غم بے شمار　　جگت اس مصیبت سوں ہے بیقرار
سر اپنے پہ غم سوں اٹھا خاک ڈار　　تاسف سوں کہتے ہیں سب شہر دار
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلوان　　کدھر موتیاں والا ہے نوجوان
بری ساعت اندر کیا اس نے جنگ　　ہوا قافیہ زندگانی کا تنگ
چھوٹی غیب سے گولئے از تفنگ　　لگی پہلو پر آ جو تیر خدنگ
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں　　کدھر موتیاں والا ہے نوجوان
کیا اس قدر رن میں جا کارزار　　کہ دشمن ہوا بھاگنے کوں تیار
بحکم قضا کار پروردگار　　یہ حکمت ہوا پڑ گئی یہ پکار
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلوان　　کدھر موتیاں والا ہے نوجوان
ہوا گل ہے جے سنگھ جی کا چراغ　　خزاں اندر آیا جو انیکا باغ

منایا گورو نے خوشی کا چراغ — جگر موں لگیا غم کا ہر یک کوں داغ
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلوان — کدھر موتیاں والا ہے نوجوان
پڑا شور ماتم کا ہر سو بسو — زمانہ موں ہوتی ہے یہ گفتگو
نہ جیتا رکھا سنگھ کو ست گرو — نہ پوری ہوئی اس کی کچھ آرزو
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلوان — کدھر موتیاں والا ہے نوجوان
ہوا درد سوں چاند سورج سیاہ — سیاہ پوش بیٹھے ہیں فوج و سپاہ
رضائے خداوند کی واہ واہ — پڑے لوگ روتے ہیں سب خیرخواہ
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلوان — کدھر موتیاں والا ہے نوجوان
لکھا ہے نوشتہ موں یہ ابتدا — کہاں رہ سکے ہے قضائے خدا
سب افسوس اندر ہے شاہ و گدا — ستم یہ ہوا ہے نہایت بڑا
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلوان — کدھر موتیاں والا ہے نوجوان
رہا یوں ہی سب ملک کا بندوبست — اجل نے وہی ہار آئی شکست
لکھا تھا خدا نے یہ روز الست — کر افسوس ہے سنگھو ملتا ہے دست
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلوان — کدھر موتیاں والا ہے نوجوان
دلاور جوانمرد وہ شیر تن — جو لڑھا کوں اٹھا جا بنایا وطن
جوانی کے جوبن کا تھا وہ رتن — بچھوڑا اجل نے کیے سو جتن
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلوان — کدھر موتیاں والا ہے نوجوان

خزینے دفینے پڑے ہی رہے | دوشالا اور لاچے دھرے ہی رہے
طویلہ میں گھوڑے کھڑے ہی رہے | شتر بار زر کے گڑت ہی رہے
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں | کدھر موتیاں والا ہے نوجواں
یہ کیسا ہویا ہے ستم سخت آہ | پٹیالہ کے سر سوں گیا پادشاہ
اسی درد سوں رات دن ہے سیاہ | ترنکار ست گور کیئے اپنی چاہ

کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

(از بیاض پروفیسر آذر)

اس نظم کو بھی گوربخش سنگھ کے واقعۂ وفات کے متعلق موجودہ تاریخ سے اختلاف ہے۔ یعنی بقول محمد غوث وہ گولی سے مارا جاتا ہے جو اس کے پہلو میں لگتی ہے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ اس کے سینہ پر تیر لگا تھا۔ میں غوث کے بیان کو ترجیح دوں گا۔ کیونکہ یہ مرثیہ گوربخش سنگھ کی وفات کے عین بعد لکھا گیا ہے:۔

غزل آیندہ بھی محمد غوث کی ملک ہے ؎

گر میرے یار کوں خدا لیاوے | ناتواں شکر حق بجا لیاوے
دل نزار ہے میرا اس کے سوا | قاصد اس کوں شتاب جا لیاوے
اپنے آنے سوں گر کرے کچھ عذر | دستخط اس کا پھر لکھا لیاوے

گردہ آزردہ ہوے مجھ سینی — کر کے منت اوسے منا لیاوے

ایسا ہووے جو کوئی مجکوں بھی — پاس دلبر کے جا ملا لیاوے

یا سجن میرے کوں بہر عنوان — جس طرح ہانئے وہ رجھا لیاوے

ہو رہاں ہیں غلام غوث لو سکا

جو کوئی یار کوں بلا لیاوے

دل محمد دلشاد پسروری

اُردو کے علاوہ فارسی کے زبردست شاعر ہیں۔ پورا منقصف دوم قرانِ دوازدہم اُن کا زمانہ ہے۔ نام دل محمد ہے۔ چنانچہ دیوان سے

دل محمد بدیہہ نامم کنی گر از لطف نشاد کامم — بنام دلشاد سر برآرم دل محمد خوش از تو بادا

دیگر ے

شاد آں کہ دل محمد اسمش — دل شاد ازاں تخلص ماست

پرسرور دیہ سرام پور، جس کو آجکل پسرور کہا جاتا ہے وطن ہے۔ اور دیوان اس عقیدہ کی کافی تائید کرتا ہے چنانچہ سے

خوش آں وطن بجا دوت ملاحت آبادان است — جہاں غیب شہادت نظیر ہر دو جہاں است

اگر تو الفہ آب پر سرور جستی ۔۔۔ ما ہمتش بدروں حلاوتش پنہان ست

ولایتے مکیں اندروں بروں شیریں ۔۔۔ عجب مدار کہ شہر عجائب البلدان ست

یکے در دست عجب نال آب شش پہلو ۔۔۔ بشش جہات بہ پنجاب گو کہ ثانی آں ست

دلیل شاہدی دلشاد نام ایں شہر است ۔۔۔ کہ پر سرود حزب بخش عالم دل و جان ست

تعلیم کے لحاظ سے جن کمالات کے وہ مدعی ہیں۔ اس شعر میں درج ہیں ؎

از علم و شعر و تاریخ فقہ و سلوک و اخلاق
دارد تمام لیکن دلشاد زر ندارد

یعنے فقہ تصوف، اخلاق، تاریخ اور شعر میں ماہر تھے۔

دلشاد ایک ایسے دور انقلاب میں گذرے ہیں۔ جو پنجاب کی تاریخ کا تاریک ترین ورق ہے۔ مغلیہ سلطنت اپنے تنزل کے آخری مراحل طے کر رہی ہے۔ نادر کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اپنے مشہور حملے شروع کر دیئے ہیں۔ اور سکھ جماعت غارتگری و رہزنی میں مصروف ہے۔ قتل و خونریزی کا بازار چاروں سو گرم ہے۔ علم و فضل کا چرچا چھوٹ گیا ہے۔ جہالت اور تاریکی ملک پر چھائی ہوئی ہے۔ پنجاب کے اس دور ظلمت کے ساتھ ساتھ دلشاد کی شاعری کا زمانہ بھی متوازی گامزن ہے۔ دوسرے الفاظ میں بارہویں صدی کے نصف دوم کے تمام واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئے ہیں۔ اور ان واقعات عصری کی جھلک ان کے کلام میں موجود ہے۔ کبھی وہ افغانوں کے ہاتھ سے نالاں

ہیں۔ اور کبھی سکھوں کے مظالم پر لعنت بھیج رہے ہیں مصیبت و بدحالی میں قاعدہ ہے۔ کہ انسان کو خدا بہت یاد آتا ہے۔ مذہب سے فوراً ہی لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اولیاؤں اور مشائخ سے لو لگائی جاتی ہے۔ یہی کیفیت دلشاد کے قلب کی ہے کبھی رسول عربی کی خدمت میں اپنی فریاد لے جاتے ہیں حضرت علیؓ سے استغاثہ کرتے ہیں۔ کبھی مہدی آخرالزمان کو بلاتے ہیں۔ کبھی حضرت عیسیٰ کو پکارتے ہیں۔ اور کبھی غوث الاعظم سے ملتجی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں ؎

غم ہجوم آورد ما را یا رسول اللہ اغث
در چنیں وقتے خدا را یا رسول اللہ اغث

دیگر ؎

غلوی کردہ سکان شیر حق کجا رفتی | بہ پنجہ از سر پر شور شاں دمار برآر
ز ہندیاں سحر ملک ما بشام رسید | تو از نیام بہ پنجاب ذوالفقار برآر

دیگر ؎

امام مہدی آخر زماں بیا وقت ست | ندانم از تو شود کے ظہور یا قسمت

دیگر ؎

لفرست مہدیے خویش تا کفر افشاند | زحد گذشت اکنوں میعاد یا محمد

دیگر ؎

دین را چو حی و نیست احیا کند بہ پنجاب | ہاں عیسیٰ زماں را ارشاد یا محمد

دیگر ؎

غم شد دو چار من دگر یا غوث اعظم الغیاث　　　خون میرود زین چشم تر یا غوث اعظم الغیاث

اس صدی میں غوث الاعظم کی ایک غیر معمولی مقبولیت کا راز پنجاب کے ان سیاسی اثرات کے پرتو میں مفہوم ہو سکتا ہے جن کے تاریک بادل اس ملک کی فضا کو گھیرے ہوئے تھے۔ اس سے پیشتر متعدد نظمیں ایسی نقل ہو چکی ہیں جو بالخصوص غوث الاعظم کی شان میں ہیں۔ جب ہم دلشاد کی آواز فریاد اس طرح بلند ہوتی دیکھتے ہیں۔ تو قیاس کر سکتے ہیں۔ کہ پنجاب پر ان ایام میں کیا قیامت گذرتی ہوگی۔ مذہبا اگرچہ سنت جماعت ہیں۔ لیکن حب علیؓ سے بھی غافل نہیں ہیں۔ محرم میں وہ ماتم حسین زندہ کرتے ہیں۔ انکی کئی نظمیں شاہد ہیں۔ پنجتن پاک سے بھی عقیدت ہے ؎

ذکر مدح پنجتن داریم در پنج وقت　　　در مخمس گوئی اے دلشاد ناچاریم ما

دیگر ؎

ہمچو دلشاد از ولائے پنج تن ما　　　واللہ اقلیم پنجابیم ما

پنجاب اور پنج تن کی رعایت میں کئی اشعار لکھے ہیں لیکن یہ شعر نہایت عجیب ہے ؎

پنجابیئے کہ نیست در حب پنج تن　　　پنجابیست غیر یدہ زلیست زین دیار

اپنے وطن سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ ذیل کے ابیات ملاحظہ ہوں۔

ان سے کس قدر محبت ٹپک رہی ہے۔ امام برخوردار کے بیحد معتقد ہیں ؎

اول از لاہور میگویند　　اہل اخبار ہند تاریخش　　کان علم و شعور میگویند　　شہر پر سرور میگویند

شہر حور و قصور میگویند　　حسن شہرہ اش ہمہ بینند　　مردم و مرغ و مور میگویند　　شاد فیاضی او بالابش

طرفہ بزم حضور میگویند　　از مزار امام برخوردار　　مژدہ آب شعور میگویند　　تیغ مردانش بیدریغ خوانا

شہر بیست دور میگویند　　زین ولایت کجا روم ثنا　　سرمہ کوہ طور میگویند　　خاک دروازہ اش ہمی بینند

تاریخی لحاظ سے دیکھتے ہوئے۔ ان کے ہاں سب سے پہلی تلمیح دہلی کے قتل عام کی طرف ہے جو ۱۱۵۱ھ ۱۷۳۸ء میں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

قتل عام ست در جہاں آباد　　آخر ایں غمزہ تو نادر نیست

دوسری تلمیح نواب یحییٰ خاں اور قتل رائے جسپت رائے دیوان لاہور کے متعلق ہے ؎

در جہاں گر ہمسر اسکندر و خاقان شود　　از شجاعت بایع نواب یحییٰ خاں شود

گر مخالف ہمچو عکس آئینہ از آب اوا　　میشود شخصے مقابل صورت بیجاں شود

انتقام قاتلان رائے جسپت رائے را　　آید از تیغ تو در پنجاب گریاں شود

زکریا خاں کی وفات پر کچھ عرصہ کے بعد یحییٰ خاں ان کا خلف اکبر صوبہ دار لاہور بنا دیا گیا۔ سکھوں کی ایک جماعت امن آباد کے مویشی پکڑ کر لے گئی۔ ان کی سرزادہی کے لئے رائی جسپت رائے دیوان لاہور بھیجے گئے۔ سکھوں نے شاہی فوج کا مقابلہ کیا۔ اور دیوان جسپت رائے معرکہ میں مارے گئے۔ صوبہ دار

یحییٰ خاں کو اس پر طیش آیا۔ اور اس نے اپنے وزیر لکھپت رائے کو ایک بڑی فوج کے ساتھ ان کی سرکوبی کے لئے تعین کیا۔ وزیر نے سکھوں کو بڑی تعداد میں قتل کیا۔ اور ایک ہزار کے قریب قیدی گرفتار کر کے لایا۔ جو ۱۱۵۹ھ ۱۷۴۶ء میں لاہور میں قتل کئے گئے ؛

۱۱۶۲ھ ۱۷۴۹ء میں میر منو صوبہ دار لاہور چار محال (پسرور۔ گجرات۔ سیالکوٹ اور اورنگ آباد) بروئے معاہدہ احمد شاہ ابدالی کے حوالہ کر دیتا ہے اور شاہ ان محال کا صوبہ دار بلند خاں سدوزئی کو مقرر کرتا ہے۔ دلشاد اس بلند خاں کے خیر مقدم میں لکھتے ہیں ۔

بلند خاں چو سہی سرو صوبہ دار رسید — تہنیت ز عالم بالاست قمریاں بچمن

بہار را دگر آبے بروئے کار رسید — زمین مقدم نواب منعم الدولہ

دگر زمین قلمروش بجہ بیارہ رسید — ہزار شکر خدا کاب رفتہ پنجاب

سحر بگوش بشارت ز یار یار رسید — نظام چار محال تو خوش کند دلشاد

اس عہد کے قبل راجہ رنجیت دیو والی جموں جو ۱۱۹۶ھ ۱۷۸۲ء میں ستاون سال راج کر کے فوت ہوتا ہے۔ پسرور پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اس سلسلہ میں دلشاد کی آمد و رفت جموں میں بھی ہو جاتی ہے۔ جموں میں ان ایام میں مسلمانوں پر سخت مظالم ہوتے جاتے ہیں حتیٰ کہ ان کو اذان دینے تک کی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ ۔

بسکہ منعست دریں شہر زداں تمعہ ‏ ‏ نکند گوش کسے نالۂ بیکاراں را

گریہ راتیست اثر در دل راجہ جموں ‏ ‏ سبزہ بر سنگ نروید چہ گنہ باراں را

موذیاں کردہ ہجوم اے شہ دولہ فریاد ‏ ‏ تیغ گجراتت نہ بستند دل آزاراں را

دیگر :-

مردمانش نہ بس کہ سنگ دل اند ‏ ‏ جموں امروز سخت کہسار است

جموں سے پسرور صرف بہالیس میل انگریزی کے قریب ہے۔ رنجیت دیو احمد شاہ ابدالی کا محکوم اور درانیوں کی فتح کشمیر کے وقت ۱۱۶۶ھ ان کا معاون رہا ہے۔ رنجیت دیو نے دیوان نرائن داس کو ظفروال وغیرہ علاقہ کا ناظم بنا کر بھیجا ہے۔ راجہ کے حکم سے زیادہ دست اندازی ہو رہی تھی۔ دلشاد کی معافی میں کچھ نہیں ہے۔ ان سے جہارم طلب کیا جاتا ہے۔ یہ عذر کرتے ہیں۔ اسی طرح رام داس نامی کسی شخص کی دھرم سالہ ضبط کر لی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں دلشاد نرائن داس کی خدمت میں ایک غزل بھیجتے ہیں :-

اے مبارک فال دیوان نرائن داس ما ‏ ‏ جز بلطف دریں دوراں کہ دارد پاس ما

ایں ظفروال از قدوم فیضت آباد گشت ‏ ‏ قلعہ داراں ماں شد منکہ دمہاس ما [?]

می نماید رنگ بہبود از حسن اقبالش بہ خود ‏ ‏ یا رب آباداں محل عیش و استیناس ما

چوں روا گردد کہ ساماں ناممون [illegible] ‏ ‏ بر زمیں باشند ندا از بیری مسماس ما [?]

نمابونت درپے نو بہ فقیراں تاختند ‏ ‏ ضبط کردہ دھرم سال دلگیر رام داس ما

در قفا خود است چہارم پائے این قصاب کار
وضع مجوا شد پائے چاریں از راس ما

آخر این بے رحمی شاں تا کجا خواہد رسید
کلک ابنہار شستہ و پا تیشہ دیا داس ما

بخشش آئمہ را در منزلت قحہ گفتہ اند
نے کہ تنہا شود کار سگ کناس ما

عاقبت دولت سرشتہ را بجز نحبت دید
خانہ آبادان ببگر و ویرانہ افلاس ما

چوں تو دانا کے پذیرد گفتۂ این ناکساں
اے رضا جویندۂ دل خاص و عوام الناس ما

معین الملک عرف میر منو نے ۱۱۶۵ھ ۱۷۵۱-۵۲ء میں احمد شاہ ابدالی سے شکست کھاتا ہے۔ اور اس کے دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ احمد شاہ نہایت تپاک سے اس سے ملتا ہے۔ اور اس کی بہادری کی تعریف کرتا ہے۔ اور رستم ہند کا اس کو خطاب دیتا ہے۔ دلشاد اس موقعہ پر غزل ذیل لکھتے ہیں ؎

معین دین پناہ دوراں امام ملت مدار گیہاں
چراغ شرع و فروغ ایماں نشاط امروز و عیش فردا

ازاں بود فتح در رکابش کہ رستم ہند شد خطابش
جبیں نہادن بخاک پایش مراد دنیا نجات عقبیٰ

فلک یکے کمترین غلامش کہ پشت خم کرد در سلامش
معین الدین خان خجستہ نامش ز عقل پیر و بہ بخت برنا

منم کہ در بزم سرو باشم ز دور گشتن چند دور باشم
ز حاضران حضور باشم اگر ز لطف تو ہو باشد ایما

معین الملک کی وفات کے بعد ادینہ بیگ خاں پنجاب میں طاقتور ہو جاتا ہے۔ وہ خواجہ میرزا خاں کو حاکم لاہور بنا دیتا ہے۔ بہ سر وہ میں جب میرزا خاں

آتا ہے۔ شاعر یہ غزل پیش کرتا ہے ؎

زبزم عیش تو نواب خواجہ مرزا خاں　　بکام کینہ در ایام غیر زہر خند مباد
بجام مے غم آدینہ را مبدل کن　　بسینۂ تو غم زاہداں بلند مباد

معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کی آمد کو ابتداءً میں پنجاب نے بنظر استحسان دیکھا ہے۔ اسی لئے شاعر مختلف مقامات پر نعرہ ہائے مسرت بلند کرتا ہے۔ اور اس کے جانے پر تاسف ؎

باد نوروزی سحر گلشن بستاں رسید　　مژدہ آمد کہ اقبال شہ دوراں رسید
ابر نیساں می رسد یا موسم باد بہار　　یا بہ پنجاب اردوئے شاہ درّاں رسید

دیگر ؎

ہائے پیراں و فقیراں شہ درّاں　　گر نہ پنجاب رود آمدہ رفتن چہ رسید

دیگر ؎

خیال سمرقندش گر زدل رہ خواب برگردد　　خدا هم تا کلہ افغان و تن از نیلاب بہ گردد
ہواسم رفت چوں ضیق النفس شد در گلو آہم　　شہ افغاں نمیداں نتم از پنجاب بہ گردد

دیگر ؎

خبر آمد کہ شہ بہ پشاور آمد　　سر آمد سرور آمد افسر آمد
گہے بشکست سر گہ سینۂ کفر　　شہ آمد معوذنہ کرد فر آمد

لیکن دل شاد کا یہ اظہار مسرت زیادہ دیرپا نہیں ہے تجربہ اور افغانیوں کے

سلوک نے انہیں سبق دیا کہ قصاب اور شبان میں بڑا فرق ہے چنانچہ آخر میں
دلشاد کا نقطۂ نظر بدل جاتا ہے۔ اور وہ افغانوں کے ہاتھ سے بھی دست بفغاں
ہیں۔ ان کی غزلوں میں متعدد مقامات پر یہ جذبات موجود ہیں ؎

بخواب خوش چہ روی کس بملک ہندستاں — بگوش آمد افغاں رسد فغانے چند

ز لالہ ہیچ نماندہ است بجز داغ سیاہ — بباغ ہند ز اعماض باغبانے چند

دیگر ؎

مدتے شد کہ شنگ افغاں نیست — شاہ در دوراں نمی آید

دیگر ؎

افغان کہ بہند آید و گیرد سر خود را — دلشاد زآید شد و جائے فغان ست

لیکن دلشاد سب سے زیادہ سکھوں کے خلاف فریاد خواں ہیں یہ قوم رہزنی
اور لوٹ مار سے بنی۔ مدتوں قزاقی اور قطاع الطریقی ان کا پیشہ رہا۔ زوال مغل
اور احمد شاہ کے حملوں نے ان کو خروج کا موقعہ دے دیا۔ آخر سکھوں نے
لاہور پر قبضہ کر لیا۔ دلشاد ؎

فغاں ز آمد و رفت فتنون ابدالی — بلاہور سگ بے شعور یا قسمت

سکھوں کے قبضۂ لاہور کی تاریخ "جہانے خراب شدہ" ۱۱۸۱ھ ہے۔ اور
شعر بالا میں شاعر اسی واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

ایک اور غزل میں سکھوں کے لئے کہتا ہے ؎

الٰہی قلع بیخ کن سگان گرگ تازان را — زلا مقراض میگردان سرین موذیان را
خو سم آب شد از آتش دو و سیہ کاران — بکن بیرون ز پنجاب این شرار فتنہ سازان را
بہان در جنگل مردار خوران سب ہمہ آمد — خداوندا برین زاغان رہا کن شاہبازان را

سفید چون فلک چلتی تیشہ پنجاب — ز مو و راز سیاہان فساد مواد را

پنجاب کی آنکھیں اس وقت بھی دہلی کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ عالمگیر ثانی کے بعد جب شاہ عالم ثانی جو بنگالہ میں ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء میں تخت نشین ہوتا ہے۔ دہلی پہنچتا ہے دلشاد پنجاب میں اس واقعہ کو یوں شہرت دیتے ہیں ؎

دلشاد زیر دل خبر تازہ شنیدہ ام — شاہنشہ والا گہر آمد خبر این است

زین خان سرہند کی جنگ میں ۱۱۷۷ھ میں سکھوں کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے جب پیسرور میں آیا تو دلشاد کہتا ہے ؎

بزم دگاں شعلہ ز سر بر گرفتہ اند — ہنگام نو بہار بوقت خزان رسید
بے بر پر سر درنہ زخندہ گی بخت — بازیب زین زینت و شان زین رسید

احمد شاہ ابدالی ۱۱۷۵ھ میں رنجیت دیو کی امداد سے کشمیر فتح کرتا ہے۔ نور الدین خان فاتح کشمیر اس کا پہلا صوبہ دار بنایا جاتا ہے۔ پھر بلند خان۔ پھر نور الدین خان ۱۱۷۶ھ میں خرم خان والی مقرر ہوتا ہے۔ اور اواخر ۱۱۸۰ھ میں نور الدین خان تیسری بار صوبہ دار بنا جاتا ہے ۱۱۹۳ھ میں خرم خان دوبارہ

صوبہ دار بنایا جاتا ہے ۔ خرم خاں کی آمد پر دلشاد بعض دوستوں کی فرمائش پر ذیل کی غزل خان کے خیر مقدم میں لکھتا ہے ؎

مژدہ آمد کہ اقبال شہ دوراں رسید خرم ۔ ابر نو روزی سحر در گلشن بستاں رسید

ابر نیساں میرسد یا موسم باد بہار یا بہ پنجاب اردوی شاہ دوراں رسید

چوں گل از باد صبا کشمیریاں خرم شوند با نشاں سبز و رنگیں فوج خرم خاں رسید

دلشاد کی شاعری کی بعض ممتاز خصوصیتیں ہیں ۔ وہ شعر گوئی اس لئے نہیں کرتا کہ اس کو ایک دیوان یادگار چھوڑنا ہے ۔ جیسا کہ اور شعرا نے کیا ہے ۔ بلکہ ضرورتاً اقتضائی احوال ، دوستوں کی فرمائش وغیرہ ایسے محرکات ہیں ۔ جن کے اثر میں وہ شعر لکھتا ہے ۔ اس لئے اس کا دیوان اس عہد کے واقعات کا آئینہ بن گیا ہے ۔ مجھ کو اس انداز کا شاعر سوائے اکبر الہ آبادی کے اور کوئی معلوم نہیں ۔

دلشاد کے کلام پر سادگی غالب ہے ۔ ساتھ ہی صنعت تجنیس و مراعات النظیر کی رعایت دیکھی جاتی ہے ۔ وہ اکثر اپنی تشبیہ و استعارے ملکی واقعات و دیگر امور سے لیتا ہے ۔ اس صنف میں وہ سب سے منفرد ہے ۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس صنف خاص نے اس کے کلام کو ایک زیور دیدیا ہے ۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

گفتار تو بگرفت جہاں از لب میگوں با فوج فرنگی شہ والا گہر آمد

دیگر ؎

خیال سرو قدش گر بدل درخواب بر گردد　　نعائم از گلو افغان وش از نیلاب بر گردد

دیگر ؎

در زمین بیوسته تخم اشک می کاریم ما　　گر توئی نواب ما، آخر نه بیداریم ما تو

اشک چشم خود بدست خود همی سازیم پاک　　صوبۂ پنجاب زیر آستین داریم ما

دیگر ؎

عالم از شیرین کلامیها مسخر کرده ام　　در دو رانیم از قند معاری آئیم ما

دیگر ؎

ملتے شد کہ اشک و افغان نیست　　شاہ درد ران نمے آید تو

دیگر ؎

قتل عام ست در جهان آباد　　آخر این غمزۂ تو نادر نیست

دیگر ؎

رسید فوج بفوج اشک چشم ملہہ جا　　جهان گرفت قشون درد درانی ما

ان میں ظرافت اور ہجو گوئی کے بھی اوصاف موجود ہیں۔ لیکن ہجو بہت کم لکھی ہے۔ کسی لالا جی کو لکھا ہے ؎

اے بندہ میان وہ عدم زندگی تست

ہشدار کہ گویند از ان نام تو لا لا

ان اشعار کو پڑھ کر ؎

ہر خان کہ بہ پنجاب دریں دور زمان است　　جانسست بگفتن نہ رود گردہ نان است

ز اولاد علی گو بہ رہ اللہ اسلم　　ہر کھوکھر بند کہ در قرآن عوان است

از دردفروشاں کہ بہر پیشہ مہارند　　شیخے کہ بود گلے زئی پیرِ مغان است

بر پشت ہر شہر دو صد غول بیابان　　از نو شہیاں پشت زمیں پر زشہان است

در مذہب عدلی ہمہ نانک مشرب　　ہر خانہ از مزوکلیاں صاحب خان است

سید کہ بہند آل نبی وند خود را　　سب از پئے اصحاب جد خود بزبان است

ہر لادلہ پیرا کہ ازو نام و نشان نیست　　ریحونت از ان گم شدہ در ہندستان است

دلشاد کا قلم ان ہجریات کے باوجود لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک جذبات کے ادا کرنے کے قابل ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار ؎

پادشہ پر سیاہ یک شب عندوان خویش را　　نان پس شود بر جبہ سوزد روان خویش را

در حضورِ شمع چوں پروانہا کردند عرض　　آن عشق این است و سامانِ عشق آن خویش را

گر زما چوں شمع این پروانگی منظور نیست　　شعر وانہ سوزدل افروزد روانِ خویش را

خسروا لدعشقبازی کم زپندار نسان مباش　　کز برائے مردہ سوزد زندہ جانِ خویش را

بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دلشاد تیرہویں صدی کے آغاز کے بعد بھی زندہ تھے لیکن ہم ان کی تاریخ وفات سے بے خبر ہیں۔ اردو میں انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اور اسی کو اپنی یادگار کا ذریعہ مانتے ہیں۔ چنانچہ ؎

گذاشتیم بہر گوشہ شعر ہندی خویش　　بیادگاری ما ماندہ درکانی ما

لیکن آج یہ ذخیرہ مفقود ہے۔ ممکن ہے۔ کہ تلاش سے دستیاب ہوسکے میں یہاں

اُن کے اردو کلام کا نمونہ درج کرتا ہوں ؎

دلبر ہے نوجوان نسجافوں کرے گا کیا	بانکی ہے اُس کی اُن نسجافوں کرے گا کیا
حافظ خدا ہے جوہریوں کی دکان کا ر	یہ موتی اس کی کان نسجافوں کرے گا کیا
اس لعل لب پہ آگئے کئی دل بیچے تھے خون	اب کھاکے آیا پان نسجانوں کرے گا کیا
شیشہ شراب کا نہ لگے ہاتھ مست کے	یہ دل میرا نادان نسجافوں کرے گا کیا
غمزہ سوں تیر نرگس مژگاں کو سار کر	ابرو کی لے کمان نسجانوں کرے گا کیا
خنجر نگاہ چشم سیہ سوں کٹار مار	یہ ذات کا پٹھان نسجانوں کرے گا کیا
دلشاد کی بھی لینے خبر اپنے واسطے	اب شورش و فغان نسجانوں کرے گا کیا

سید محمد ولی اورنگ آبادی کی غزل کا مطلع ہے ؎

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا	شاید کہ میرا حال اسے یاد نہ آیا

دلشاد لکھتا ہے ؎

گذرے ہیں کئی دن وہ پریزاد نہ آیا	شاید کہ میرا وعدہ اسے یاد نہ آیا
نے خط نہ کتابت نہ خبر کچھ نہ سندیسا	پیغام ہمارا گیا برباد نہ آیا ر
اس دام میں افسوس پھڑکتے ہیں کئی جان	جب ہم کوں پھنسا کر گیا صیاد نہ آیا
اک زخم کا محتاج تڑفتا رہا بسمل	پر مار کے شمشیر وہ جلاد نہ آیا
اس منظری میں ہے شیریں نقش بدیوار	جب تیشہ گیا مار کے فرہاد نہ آیا

کہتے ہیں سبھی ہم کوں کے آپس میں یہ بر در ر
کیا وجہ میاں ساتھ جو دلشاد نہ آیا

وارث شاہ

حضرت وارث شاہ[1] پنجابی کے بہترین شاعر مانے جاتے ہیں۔ میں مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار کی ایک بیاض سے ان کی ذیل کی غزل حوالۂ قرطاس کرتا ہوں۔

جس دن کے ساجن بچھڑے ہیں تس دن کا دل بیمار ہویا
اب کٹھن بنا کیا فکر کروں گھر بار سبھی بیزار ہویا

دن رات تمام آرام نہیں اب شام پڑی وہ شام نہیں
وہ ساقی صاحب جام نہیں اب پینا شہد و شوار ہویا

بن جانی جان خراب بھی با آتش شوق کباب بھی
جن ماتی بجر بے آب بھی نت دن ساتھ بیمار ہویا

مجھے پی اپنے کو لیاؤ رے یا مجھ سوں پی پہنچاؤ رے
یہ اگن فراق بجھاؤ رے سب تن من جل انگار ہویا

جب پی پاؤں تب سہاگن ہوں ... براگن ہوں
اس پی اپنے کی لاگن ہوں یہ لاگ مجھے اوچار ہویا

اب پی کے درشن جاؤنگی تب ہار سنگھار بناؤنگی
... نام سداؤنگی پی کے ساتھ اقرار ہویا

نت راگ پیا کے گاتی ہوں تت دیہہ یا [illegible] بناتی ہوں
تجھ رے شاہ کے جاتی ہوں میرا تن من ... تار ہویا

تب مجنوں گل ہویا تھا جب لیلیٰ کہہ کر رویا تھا
وہ یک دم سیج نہ سویا تھا اب لگ نیک شمار ہویا

سو ہیں اب مجنوں وار بھی ہیں دیس بدیس خوار بھی
اوس پی اپنے کی یار بھی اب میرا جی اعتبار ہویا

جب وارث شاہ کہلایا نے تب روح سوں روح ملایا نے

تب سیج سہاگ سولایا نے جیو جن مخزن اسرار ہویا

(از بیاض مملوکہ مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار)

---

[1] کاتب نے نام کے ساتھ علیہ الرحمۃ اضافہ کر دیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس کی مراد مصنف ہیر و رانجھا سے ہے۔

نام محمد ابراہیم ہے۔ اور لاہور کے مشہور اہل علم خاندان چشتی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد قاضی ضیاء الحق مع اپنے عم بزرگوار مولانا نظام الدین و برادر خورد بہاء الحق ایران سے ہندوستان آئے۔ اور لاہور میں متصل گڑھی شاہو سکونت اختیار کی۔ اور نواب خان بہادر نے اپنے فرزند یحییٰ خان کا اتالیق مقرر کر دیا۔ مولانا ابراہیم علم و فضل میں یگانۂ زمانہ تھے۔ لیکن لاہور میں سکھوں کے دخل کے وقت تمام جائداد سے بے دخل کر دیئے گئے۔ اور گھر لوٹ لیا گیا۔ ناچار ایک مسجد میں جو مطبع کوہ نور کے بالمقابل تھی۔ امامت کرنے لگے۔ اور معلمی اختیار کر لی۔ گوجر سنگھ نے دو آنہ یومیہ دروازۂ لاہوری و دہلی پر ان کا مقرر کر دیا۔ مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقات چشتی و یادگار چشتی و تحفۂ چشتی و عجائبات چشتی مولوی محمد ابراہیم کے پر پوتے ہیں۔ چشتی خاندان تقریباً دو صدی سے اپنے علم و فضل کے لئے مشہور چلا آ رہا ہے۔ رنجیت سنگھ کے عہد کا سب سے ضخیم روزنامچہ جو بیس بائیس جلدوں میں ہے اسی خاندان کا کارنامہ ہے۔ اس خاندان میں دستور تھا۔ کہ تخلص اکثر اوقات ہم قافیہ اختیار کئے ہیں۔ جو دل پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً۔ پردل۔ خوشدل۔ بیدل۔ یکدل۔ مولانا خوشدل ۱۲۰۱ھ میں انتقال

کرتے ہیں۔ اور "رضی اللہ عنہ" مادۂ تاریخ ہے[1]۔ اگرچہ تحقیقات چشتی میں ۱۱۹۵ھ اور حیات رشید میں ۱۲۱۹ھ یا ۱۲۲۰ھ دیا ہے؛

مولانا خوشدل کا نمونۂ کلام ذیل میں پیش کیا جاتا ہے جس میں دنیا کو بڑھیا اور جسم انسانی کو چرخہ تصور کیا گیا ہے۔ چرخہ کی یہ نظم پنجاب میں بہت مقبول رہی ہے۔ دہونیا سے

عشق کے غم سوں ہو محزوں ۔۔۔ اَہ دنیا سب مکرو فسوں
جو توں چاہے قادر کوں ۔۔۔ اس عالم سیں ہو بیروں
کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں
چل رے چرخے چرخ چوں

اے رنگین دیوانہ ہو رہ ۔۔۔ عالم سوں بیگانا ہو
دل پہ پروانہ ہو (کلنا) ۔۔۔ وہ ہیگا بے شبہ و نموں
کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں
چل رے چرخے چرخ چوں

نابود ہستی اَہ ہستی ہے ۔۔۔ بنیاد فرازش پستی ہے
کیا دولت خواب کی مستی ہے ۔۔۔ مت کر اتنا شور وجنوں

---

[1] میں اس اطلاع کے لئے مسٹر مسعود علی چشتی کا جو خوشدل کی اولاد میں ہیں ممنون ہوں؛

کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں

چل رے چرخے چرخ چوں

تن چرکھا بودھیا سنسار　　بیل کیا اس کا کرتار

بھورنیا وے ایسی یار　　بیرے دہ ارکانے نون

کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں

چل رے چرخے چرخ چوں

آہ جیو میرا ہیپا دیوانا　　دنیا سا تنہ بھوت بہانا

بھول گیا اوسے اونا جانا　　اب کیا اس کا فکر کروں

کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں

چل رے چرخے چرخ چوں

کدھر گئے گور ار بہرام　　کدھر گئے صیاد ار دام

کدھر گئے جمشید ار جام　　کدھر گئے گنج ار قارون

کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں

چل رے چرخے چرخ چوں

بلبل گلزار خدا کا ہو　　قمری شمشاد فنا کا ہو

اب تارک حرص و ہوا کا ہو　　او خوب نصیحت ہے تجکوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں

چل رے چرخے چرخ چوں

چلنا ناکرنا بچپنت وا ....

جیوں گڈرے نیوں گذار رے جا   مت کر اتنا فکر فزوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں

چل رے چرخے چرخ چوں

کدھر گئے مہتر یعقوب   کدھر گئے یوسف محبوب

کدھر گئے سلیمان مطلوب   کدھر گئے لیلےٰ مجنوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں

چل رے چرخے چرخ چوں

اہ پنجر ارض و سما کا ہے   جاں مرغ اسیر فنا کا ہے

تو کی ابہ تہ نام خدا کا ہے   آخر عدم ہے دنیا دوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں

چل رے چرخے چرخ چوں

کہاں سکندر سے سلطان   دارا کہاں رفیع الشان

سب جگ کوں فانی جان   چھوڑ دے کر مکر و فسوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں

چل رے چرخے چرخ چوں

خودی تکبر سب کو چھوڑ   مت کر اتنا غونا شور

جیسے پورا ہے کا رود مانی ہوا ہونا کرہوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں

چل رے چرخے چرخ چوں

جو غفلت کے مدہ ماتے ہیں عصیاں سوں بانہ تنے ہیں

پھر روز جزا پچھتاتے ہیں ۲ یہ محکم رکھ دل میں مضموں

کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں

چل رے چرخے چرخ چوں

یہ دنیا ہے سفر سرائے غافل ہو مت آنکھ لگائے

پونجی کھوئی چلے پچھتائے پھر نہیں آوے ہاتھ کہوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں

چل رے چرخے چرخ چوں ۲

جو زاہد زہد نما ہوں گے دل پتھر اہل ریا ہونگے

شرمندہ روز جزا ہونگے روواسن رہاسے ہو پیرں

کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں

چل رے چرخے چرخ چوں

کدہوں بیٹھے بیچ عماری کدہوں پھرتے نال سواری

فکر معیشت گھر کی خواری تس پر بدکھید غوار فوں ۲

کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں ۲

چل رے چرخے چرخ چوں ۲

خوشدل قسمت پر قانع ہو ہنکار سوں واں کوں مانع ہو

بہ بندۂ قدرت صانع ہو ۲ کس سوں کیا مطلب مجکوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا نوں

چل رے چرخے چرخ چوں

(از بیاض پروفیسر آفرین)

چوک چوں یوں

فدوی لاہوری

میرزا سودا ان کے حریف غالباً ان کو بقال بچہ کہتے ہیں۔ فارسی و ریختہ میں کامل تھے۔ ایران میں ایک عرصہ تک رہے ہیں۔ تجارت ذریعۂ معاش تھا۔ اخیر عمر فرخ آباد میں ایک عطار کی دکان پر مکان کرایہ لے رکھا تھا۔ عطار کی دکان پر اکثر آ بیٹھتے تھے اور وہیں شعر کے چرچے رہتے تھے۔ فدوی نے سودا کے بعض اشعار پر اعتراض کئے تھے۔ مثلاً ایک مقام پر سودا نے شیخ و برہمن دونوں کے لئے دین کا لفظ استعمال کیا تھا۔ فدوی نے اعتراض کیا کہ دین شیخ کے لئے اور دھرم برہمن کے لئے مخصوص ہے۔ سودا نے جواب میں آیۂ کریمہ "لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ" نقل کی۔ اسی طرح سودا کا ایک شعر کسی اور بحر میں حسب ذیل تھا ؎

تم نے جہاں وا کئے بند قبا اپنے جان   جا کے صبا نے باغ کھول دئیے گل کے کان

فدوی نے اصلاح دے کر اس طرح لکھا ؎

کھول دئے ناز سے تم نے دو چشم اپنے جان   کھولے صبا نے پئے غنچۂ نرگس کے کان

اسی طرح شاگردوں کے بارہ میں جنگ ہوئی جن میں شیدا قابل ذکر ہیں۔ نوبت ہجووں تک پہنچی۔ میرزا نے جس طرح میر ضاحک۔ فاخر مکین۔ میاں فغاں۔ شیخ صنعت اللہ۔ ندرت کشمیری۔ مرزا علی وغیرہم کی ہجویں لکھی تھیں۔ فدوی کی بھی

ہجویں لکھیں چنانچہ پانچ اب تک میرزا کے کلیات میں موجود ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہجو گوئی کا سلسلہ ایک عرصہ تک قائم رہا ہے۔ ان میں سے ایک ہجو میرزا نے پنجابی زبان میں لکھی ہے جس کا مطلع ہے ؎

ٹنی ہو سودا دے کن یہ گل کہ فدوی جس کول جاندا ہے
پھلے برے نواں تے یارا کیہ ہجو تیندی سناندا ہے

یہ معرکہ ۱۱۹۶ھ میں پیش آیا۔

میر حسن فدوی کے متعلق لکھتے ہیں ؎

"فدوی مردے بود بر خود غلط، برائے مباحثہ و جدال بہ فرخ آباد پیش میرزا رفیع سلمہ اللہ آمدہ ہنگامہ برپا نمود بعد از رفتن بسیار بہ وطن خود برگشت یوسف زلیخا بزبان ریختہ گفتہ بود و بہمہ عالم می نمود ہر کسیکہ ازو لطف برمی داشت ازو محظوظ می شد۔ حال معلوم نیست کہ زندہ است یا مرد از دست ؎

مژہ کی نوک بیلنے ہیں نگاہ یار نے ڈوبی — کہ جیسے بھال توبے میں سری یک بلور نے ڈوبی
نہ پوچھو رنگ مہندی کا کفِ قاتل پہ اے یارو — کسی کے خون میں اس کے ہاتھ کو تلوار نے ڈوبی

یہ محسوس کرتا ہوں کہ میر حسن کا فیصلہ فدوی کے حق میں چنداں منصفانہ نہیں ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ خود فدوی کے ہموطن اس کے حالات و کمالات سے قطعاً بے خبر ہیں۔ ورنہ اس کی تصنیف یوسف زلیخا کا سراغ چلتا ہے تاہم اس کی بلند پایگی ہیں

شک نہ کرنا چاہیئے۔ ذیل میں اس کے کلام کا نمونہ درج ہوتا ہے، جو بعد تلاش حاصل ہوا ہے ؎

آنسو نہیں ہیں دیدۂ تر میں بھرے ہوئے — موتی ہیں آبدار صدف میں دھرے ہوئے

ابرو تری کی تیغ سے سورج ڈرے ہوئے — پھرتا ہے اپنے منہ پہ سپر کوں دھرے ہوئے

خالی کران کو دل کے نشانیں پہ ایک بار — ترکش تری مژہ کے ہیں چاروں سرے ہوئے

کہنے لگا کہ میری گلی کی طرف نہ آئے — جاتے دوانے یا نسلے ودھر کوں پڑے ہوئے

یہ سن کے میں نے عرض کی خدمت میں اسطرح — لیکن وو دست بستہ لو بہ جبیں ڈرے ہوئے

جرأت کہاں کہ آسکوں قرآن کی قسم ہے — لاتا ہے دل مرا مجھے آگے دھرے ہوئے

ندی بہانے دیدۂ گریاں کے فیض سے
اشجار کوہ دشت کے یکسر ہرے ہوئے

حضرت مراد شاہؒ

والد کا نام پیر کرم شاہ عرف مستنا شاہ ہے۔ چار سال لکھنؤ و دیگر مقامات میں گزارنے کے بعد سنہ ۱۲۰۰ھ میں اپنے پدر بزرگوار کی معیت میں واپس اپنے وطن لاہور آ رہے تھے کہ شاہجہان آباد کے قریب قزاقوں سے مقابلہ ہوا، اور پیر کرم شاہ مارے گئے۔ اس افتاد سے تین سال اور وطن آنا نصیب نہیں ہوا۔

حضرت مراد شاہ کئی تصنیفات کے مالک ہیں۔ دیوان کے علاوہ متعدد چھوٹی چھوٹی مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں اپنے شاگرد حکیم علیم اللہ کی فرمائش پر قصہ چہار درویش نظم کرنا شروع کیا۔ اور کچھ حصہ نظم کر چکے تھے کہ پیام اجل آ پہنچا اور عین عالم شباب میں تیس سال کی عمر میں دنیا سے سنہ ۱۲۱۵ھ میں کوچ کیا۔ مزار موضع مردانہ تحصیل شاہدرہ میں ہے۔

ان کی طبیعت غزل سے بہتر مثنوی پر جمتی ہے۔ اس میدان میں وہ کسی سے کم نہیں اور اہل ہندوستان کے دوش بدوش ہیں۔ متواتر سات سال ہندوستان میں رہنے کی بنا پر زبان بالکل صاف ہو گئی ہے۔ سلاست اور روانی کے علاوہ کلام میں پختگی موجود ہے۔ سنہ ۱۲۰۲ھ میں ایک منظوم خط عزیزانِ وطن کو لکھتے ہیں۔ جو نامۂ مراد کے نام سے موسوم ہے۔ اور ہمارے مخدوم جناب غلام دستگیر

صاحب نامی کی سعی سے چھپ چکا ہے۔ اس خط میں اردو کی قبولیت کے ذکر میں فرماتے ہیں سہ

وہ اردو کہلاتی ہے جو ہندی زبان ہے ۔ کہ جس کا قائل اب سارا جہان ہے

کلام اب کچھ لکھے ہیں ہندی زباں میں ۔ کروں شہرت ہو تا سارے جہاں میں

کہ اب وسعت میں اس کی سب سخنداں ۔ سمندِ طبع کو کرتے ہیں جولاں ۲۲

لطافت یہ نکالی ہے اسی میں ۲ ۔ کہ فرماتے نہیں کچھ فارسی میں

اسی کا شہرہ اب ہو جاتے سب تک ۔ یہاں سے تا بایران اہل عرب تک

خصوصاً شعرا اب شاعر یہاں کے ۔ نہیں کہتے بجز ہندی زبان کے

غرض ہندی کا یہ چرچا یہاں ہے ۔ کہ شعر فرس مطعون زماں ہے

یہ شہرت ہے اب اس مضمون پڑھ کی ۔ نہ کوئی فارسی پوچھے نہ ترکی

نہیں ہندی سخن میں نقص ممکن ۔ لطافت ہے بہت سی اس میں لیکن

نہ شاعر ہند کے یوں فی الحقیقت ۔ گئے لے فرس کے مضموں پہ سبقت

جھنجوڑا فارسی کی استخواں کو ۔ کیا پہ مغز تب ہندی زباں کو

فصاحت فارسی سے جب نکالی

لطافت شعر میں ہندی کے ڈالی

لفظ اردو کا استعمال ان کے ہاں تحسین کی طرح قدیم ہے۔ گویا تحسین نثر میں اور یہ نظم میں سب سے پہلے لاتے ہیں۔ ایک اور مثال ان کی مثنوی چار درویش سے دیتا ہوں سہ

یہ قصہ جو ہے چار درویش کا — اگر نظم ہو تو بہت ہے بجا

ولیکن جو اردو زباں میں بیاں — کہ بھاتی ہے ہر ایک کو یہ زبان

نامی صاحب ان کی مثنوی مراد العاشقین در فارسی ترجیع بند ماہ مریداں چھپ چکے ہیں۔ ذیل میں ان کا عکس نامہ بطور نمونہ کلام ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

شہر لاہور ہے قبہ اسلام — روشن آفاق میں ہے جس کا نام

تھی اس کی تھی شہرۂ آفاق — حسن کا اس کے تھا جہاں مشتاق

اصفہاں ہے جو ایک نصف جہاں — خوبیوں میں نہ تھا کچھ اس سے کلاں

دور دور تک یہ تھا یہی مشہور — اپنے نزدیک تھا بہت سا دور

تھا عمارت سے یہ قوی بنیاد — ربع مسکوں میں افتخار بلاد

تھا بہشت بریں بروئے زمیں — عجب انساں تھے اس مکاں کے مکیں

ایک سے ایک تھے وہ صد چنداں — سب ملائک صفت وہ انساں

اولیا و مشائخ و سادات — علما اک سے اک ستودہ صفات

شہر تھا یہ کہ کان علم و ادب — کان کیا بلکہ جان علم و ادب

کیا بہار اس کی میں کروں تحریر — شہر تھا یا مرقع تصویر

گلعذاروں پہ حسن کی تھی بہار — گل تھے ہر ایک کے گلے کے ہار

کھینچتے تھے دکھا کے رخ دل کو — خانہ خانہ میں تھے کماں ابرو

عقل قبضہ میں کس کے رہتی تھی — جاں ہو قرباں دل سے کہتی تھی

ف یہ منظوم ڈاکٹر محمد باقر کے دیباچہ سے مزین ہو کر انجمن ترقی اردو کے رسالہ اردو مورخہ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں شائع ہو چکا ہے ادارہ دو دیوان مراد کا جیکی نقوش نامی صاحب نے لکھ کر اسی رسالہ کے جولائی ۱۹۱۹ء نمبر میں شائع کرایا (ناشر)

تیر زو بر کو ترکش آساں نیست — گوشہ گر دا کہ مرد میداں نیست

خوبرو تھے حیا سے سب موصوف — اور عاشق وفا میں تھے معروف

راہبر تھے سبھی طریقت پہ — تھا قدم منظر الحقیقت پہ

اور جس کو کہیں مجازی تھا — شیوہ اس کا بھی پاکبازی تھا

جو کہ عالم تمام دیکھ آتا — سو نہ دیکھ اس کو پھر کہیں جاتا

رشک آبادیٔ جہاں تھا یہ — الغرض خوب ہی مکاں تھا یہ

سو زمانے نے ایسی زشتی کی — خوبی اس قطعۂ بہشتی کی

لے کے دوزخ میں ڈال دی یکبار — وقنا ربنا عذاب النار

کوئی اس میں پڑا جو بوم قدم — ہے پتا اس کا وجود رشک عدم

ہے مکاں گو شرف مکینوں سے — نہ کہ دل ہمتیں کمینوں سے

نہ وہ رونق نہ وہ صفائی ہے — مکھیوں کی غرض دہائی ہے

زر تو شاہ زماں سے مارے لے — مکھیوں کو گئے اجارہ دے

اسی صورت سے ہو گئے احمد شاہ — تھا گیا چھوڑ جیو نٹیوں کی سپاہ

گر زمیں لی تھی سب انہوں نے گھیر — مثل درانیوں کے ہو سکے دلیر

راہ خالی نہ تھا جو کوئی چلے — لگ رہتی تھیں جوتیوں کے تلے

اب ہیں پر مکھیوں سے سب لاچار — ہیں یہ گردن پہ آہ سب کی پکار

نہیں آرام ان سے رات اور دن — کھا گئیں کان سب کے کر بھن بھن

دن کو کیا کہیے بات کھانے کی   اٹھ گئی رسم ہی پکانے کی

آتشِ جوع نے جگر کو کباب   جس کے دل کوں کیا سو ہو بیتاب

خشک روٹی کہیں پکانا ہے   کس مصیبت سے وہ بھی پکتا ہے

اور قلیہ پلاؤ کھائے کون   ہو سکے کس سے اور پکائے کون

پک گئی شب کہیں جو دال   اس کے کھانے کا کیا لکھوں احوال

ماش کا دیکھ بیچ ہیں چھلکا   کھا کے وسواس وہ جو تھا دل کا

منہ سے لقمہ وہیں اگل ڈالا   دیکھیو دال میں ہے کچھ کالا

بایہ کہنے تجھے کیا ہوا ہے ہے   لائیو طشت مجھ کو آئی قے

اس میں پہنچی حکیم جی کو خبر   کوئی یاقوتی آئے وہ لے کر

لے اُدھر وہ زبان پہ رکھتی   پڑ گئی ناک میں اِدھر مکھی

ناچتی ہیں کہیں جو کنچنیاں   دیکھیے جا کے ٹک وہاں کا سماں

ہے دھیان ان کو بھی یہ تا تو نہیں   مکھیاں پڑ نہ جائیں کانوں میں

اور پاؤں کی گت سے ہے منظور   مکھیاں ہوں کسی طرح سے دور

ناچنے کا غرض بہانہ ہے   مدعا مکھیاں اڑانا ہے

مکھیوں سے نہیں کسی کو نجات   کچھ نہ پوچھو نمازیوں کی بات

جب کوٹیں بیچ ڈنڈل ڈالے ہیں   مکھیوں کا ہی بھر لگائے ہیں

کرنے جس وقت بیٹھتے ہیں وضو   پانی لے منہ میں کرتے ہیں تھو تھو

آہ بھرنا بھی ہو گیا ہے محال — اور لکھنے کا کیا لکھوں احوال

لیکے کاغذ پہ کلک جب رکھی — لکھتے لکھتے ہی یک قلم مکھی

سطر کی سطر ساری چاٹ گئی — اڑ کے پھر آنکھ پر بھی کاٹ گئی

جتنے گھوڑے تھے ہو رہا مرخنگ — مگسی ہو گیا ہے سب کا رنگ

شہر میں دیکھ ہیں یہ ہنگامہ — گاؤں میں آ لکھا مگس نامہ

متصل شہر کے اٹاری نام — ہے مریدوں کا اپنے جس میں مقام

لیک خالی ہے ان سے شہر نہ گاؤں — کہ برابر ہے ان کو دھوپ اور چھاؤں

دن کو کرتی ہیں یوں کہ صید یہ باز — رات کو یہ اڑیں ہما پرواز

سب پرندے خطر سے بھول گئے — اور درندوں کے پاؤں بھول گئے

کوئی حالت نہیں ہے انساں کی — اور نہ صورت کوئی ہے حیواں کی

آہ قطع نظر ز ہر حیواں — نتواں دید صورت انساں

بس کر آگے نہ کہہ کچھ ان کی بات — کر دعا اب یہ ہے دعا دن رات

مکھیوں سے نجات پاویں سب — رغبت دل سے کھاویں پیویں سب

شہر پہ پھر رہی سماں ہووے — شکل بسنے کی پھر وہاں ہووے

نہ رہے کوئی فتنہ اور فساد — بے خلل شہر میں رہیں آباد

اختر نحس کا عمل جاوے — سعد اختر کا دور پھر آوے

شہر میں ہو سراسر آبادی — پھر وہی رونق اور وہی شادی

اور رہے اس کو تا قیام جہاں   فتنۂ آخر الزمان سے اماں

تا بر آوے سبھوں کے دل کی مراد

قید سے رنج و غم کے ہوں آزاد

پیر سکندر شاہ امداد متوفی ۱۲۱۴ھ

حضرت مراد شاہ کے چھوٹے بھائی ہیں بیس سال کی عمر میں وفات پاتے ہیں مزار خانقاہ حضرت عبد الجلیلؒ واقع لاہور میں ہے۔ نمونہ کلام سے

بادہ و جام و ساقی و گل و مل   ہے نہیں ملتے اک وہ غیرت گل

شب میں احوال اس کا کہہ نہ سکا   شیشہ ہر چند کہہ رہا قل قل

زلفِ مشکیں کو دیکھ کر اس کی   کٹ گیا آج طرۂ سنبل

جس گل اندام کے لئے میں نے   کھائے اپنے بدن پہ لاکھوں گل

سو اشارہ میں اس کے خوں میرا   لے گیا اُس کا زنگیے کاکل

دیکھ کر اس پری کو ہوش و حواس   اُڑ پرواز کر گئے بالکل

فیض شاہ مراد سے امداد

ہم نے باندھے ہیں پنجتن کے پل

میں رام کشن کے ایک ترجیع بند سے جو لمبا ہے. صرف چند اشعار پر قناعت کرتا ہوں ؎

تو بے وفا ہے مجھ تیرے اقرار کی قسم
بے اعتبار ہیں ترے اعتبار کی قسم

ناگن کی بھانت ڈس گئے میرا دل الٹ گئی
مرتا ہوں مجھ کو زلف سیہ مار کی قسم

خفت میں ہو گئی ہیں تری چال دیکھ کر
سیہ کبک کوہسار کی رفتار کی قسم

نازک بدن ہے تیرا کروں صفت کیا بیاں
شرمندہ گل ہوئے گل گلزار کی قسم

زیباں بزیب وخوبی اوبنہ نگر کے بیچ
کھاتی ہے تیرے سخن شکر بار کی قسم

ہم سیس نہ اپنے رکھوں چھپا شوخ نازنیں
تجھ کوں ہے رام کشن طلب گار کی قسم

(از بیاض پروفیسر آذر)

فقیر اللہ

فقیر اللہ خانوادۂ نوشاہیہ سے بیعت ہیں، اور شاہ امانت کے مرید ہیں حاجی نوشہ متوفی سنہ ۱۱۰۳ھ اس سلسلہ کے بانی ہیں۔ شاہ امانت کا حاجی نوشہ سے یہ واسطہ ہے کہ شاہ امانت حضرت عبدالغفور کے مرید ہیں۔ جو محمد حافظ سے بیعت رکھتے ہیں، اور محمد حافظ محمد ہادی سے ارادت رکھتے ہیں۔ جو بانی سلسلہ حاجی نوشہ کے مرید ہیں!!

فقیر اللہ مثنوی در مکنون کے مصنف ہیں۔ جو رموز العشق کی طرز میں تصوف پر لکھی گئی ہے۔ اس میں ایک ہزار سے زیادہ ابیات ہیں، اور بحر بھی تقریباً وہی ہے۔ سرخیوں کے طور پر اس میں دوہرے لائے گئے ہیں۔ اس کی تاریخ تصنیف ۱۲۰۲ھ "چراغ" کے اعداد سے برآمد ہوتی ہے۔ افتتاحیہ

انند سُنا تیرے گن گاواں	ہر دم تیرا نام دھیاواں
انند بھی ست گور میں پایا	اچھا جاپ جس مجھے بتایا
کُنتُ کنزاً نے کیا پسارا	سوہنگ اہنگ آئے پکارا
اچھا جاپ جپاوے کو سوئے	جس کا ہردا نرمل ہوئے
سوہنگ ہوانا کو جان	سری شغل کا بھید پچھان
ہو اللہ ہے اچھا جاپ	جپ سیں کٹیں کوناں پاپ

باہر سو بھیتر اور آہنگ — اچھا جاپ ہے سو ہنگ آہنگ
ہوا نا جب جس نے کہا — سو جن ہو اللہ ہو رہا
ہوا نا جب سالک کہے — دوئیت دوار اہنگ ہو رہے
آپی ہر جی آپی تون ۲ — اَنَا اَنَا ہو بولیں تون ۲
ہر ہر نگی ہے بے بچون — جس بیچونی ہیں سمجھ بچیل
ہو جاپ سیں یاد سے سکھ — بن ہو اور سبھی ہے دکھ
ہو جاپ ہی چو تجھے پد کا — ساہد و یاد سے بھید اس جد کا
شاہ امانت بھید بتایا ۲ — تو ہیں ان حد ناد بجایا

معنے اسم صفت کے جانوں — بوجھ بھید اور سر پچھانوں
اسم مسمّٰی جانو مینت — سمجھ بوجھ کر دھر یو چیت
ہر یک اسم کی شان پچھان — لازم حفظ مراتب جان
جس نے حق کوں سن سمجھ پچھانا — حفظ مراتب لازم جانا
ہیں کیا کہتا ہوں دیوانا ۲ — سن کر طالب کر خوشیانا
اوس کے سات مراتب جان — ہر واحد کے حکم پچھان ۲
فرق ار جمع مو جان یہ نیک — بہتر دونوں کوں جانو ایک
گور ایسے بوجھ منزہ ذات — نا ہو کا فرمانا کمزات دکھا ۲

ست گور ہیں بے بھید پچھان　　پھر دونوں کو ایک ہی جان
ایک ہی ایک ہے ایک ہی ایک　　سمجھ لیو اور بوجھو نیک
آپے عابد ہے معبود　　آپے ساجد ہے مسجود
وحدت میں کثرت ہے یارو　　ظاہر میں تم سمجھ بچیارو
اور باطن میں تمیز جان　　کثرت کوں وحدت پچھان
کل اسماء کی واجب جان　　فاعل بیچ اشیا کے مان
سب اسماء کیا فانی　　جانو حادث اور نقصانی

خاتمہ

سرمکنوں کا جس نے جانا　　اپنے آپ کوں آپ پچھانا
فقیر اللہ کیا کہی بات　　سرمکنوں ہے شاہ کی ذات
شاہ ہمارا شاہ ہمارا　　کل عالم کا سرجن ہارا
سرمکنوں کے سن کوں جان　　یعنے عدد "چراغ" پچھان
سرمکنوں کو کیا تمام　　شاہ جیلانی کا لے کر نام
ہے وہ سید عبدالقادر　　ظاہر باطن اوّل آخر
عبدالقادر پیر ہمارا محی الدین نام رکھا ہے　　ظاہر باطن قادر ہو کر نہ کو بھر چھپا بو رہے

رحمت شاہ

رحمت شاہ مثنوی شیریں فرہاد کا مالک ہے جس میں ہر نو دس اشعار کے بعد بند کے طور پر دو ہرے آجاتے ہیں، اس مثنوی کی زبان بھاشہ اور پنجابی آمیز ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ کبھی پنجابی غالب ہے اور کبھی برج ۔ رحمت شاہ نے اپنے متعلق کچھ نہیں لکھا حتیٰ کہ ہم کتاب کے نام و تاریخ نیز مصنف کے زمانہ سے بے خبر ہیں، پوری وہ اپنا وطن بتاتا ہے جہاں جگدیو کا استھان ہے۔ یہاں اس کے والدین آگرہ آباد ہو جاتے ہیں۔ اس کے والد نے سات مرتبہ حج کیا ہے؛

ابتدا:۔

اول نام صاحب کا لیجے ۔ پاچھے تے سب کارج کیجے
جیو جنت جا دس اپائے ۔ ہر ہر کرت سنگ لائے
وہ داتا سبھی کا سائیں ۔ پالے سبھن کو ہر جائیں
ادس ان کیا کہوں بکھانو (مہما) ۔ اوسی جوت کی کلا بجانو
نا کہہ جیو جو جل میں رہیں ۔ تا نہ رزق ہمیشہ لہیں
پنچھی اور پرندے ہاتھی ۔ کیٹے جون کی شکل سنجاتی
خبر لہند اوہ کرتارا ۔ اوسی لوار پر کریں پکارا
دھرمی کو نہیں پاپ لہیے ۔ پاپی کو نہیں مار ہٹاوے
ہر ہر میں ہرپے ہر جاتا ۔ کون کرے ہر ہر یہ ناتا
پتھر موں جو رزق پہنچاوے ۔ جو رجیو کیٹی لطرنہ کوے

رحمت شاہ اپنے وطن کے متعلق یہ بیان دیتا ہے ؎

اک نگر اُت بسے سوہاوا ۔ نگر بیچ ناں لوک ملاوا

دوار دوار پر کھڑے تو رنگا　　دیکھ ڈھولک باجے مردنگا

ہر او ہیں گھر پہ او پکارے　　کرتے پرش گئے اوتارے

نس دن تے مدہ مانتے رہیں　　تنتر وسوں سمرسنگ کہیں

پوری نام جگہ یوا استھاناں　　نگرہ لوک انت چتر سوجاناں

ہم بستے ہیں اوس نگر ہیں　　دیا دھرم کا روپ سکل ہیں

مات پتا ہمرہ جب آ ہو　　ایس نگر استھاں بنا ہیو

پیچم اودے بیر جگ کینا　　ایتھاں آئے سکھ سنپت لینا

ست بار حاجی اوہ بھئے　　پھر جاء مدینے رہے

انت کال اس نگر ہیں آئے کیا اسلام

سب کا سچ پوتے مجے نال رب دے نام

خاتمہ ۵

دیو جنگل سب اکٹھے ہوئے　　جلسہ دیکھ فرہاد جو موئے

کیا ہویا فرہاد دی نانہیں　　کتنے جو مار دیا اس نانہیں

کرو سادی اوس کیا کچھ کینا　　عاشق مار لیا جب کینا

لائق ہے بدلہ جو کردے　　کتنے کوں سولی پہ دھرد

ل دیوان ایہ بات بنانی　　کتنے کے گل پاوے پھانسی

مار مار کر بو بہت بیحالا　　اوہ کتنے منہ سے اجالا

اور کی کیتا سب کو پاوے　　بدلہ اوہ صاحب وکھلاوے

ویکھے میر پر صاحب سائیں　　بدلہ اوہ چھوڑیندا ناہیں

اوہ بدکار جبر مار کر کینے بوہت بے حال ۲

رحمت شاہ دے چیل دارہ سی مول نہ ڈال

عبدالرحمٰن خلدی

خلدی کا زمانہ تیرہویں صدی کا پہلا منتصف تصور کرنا چاہیئے۔ اگرچہ کلام میں قدامت کی جھلک ہے ؎

گھونگٹ وٹ کر مکھ دکھارے سجن | دل عاشقاں ناستارے سجن
دیا جن نے جوبن کرم سے تجھے | خدا کا کرم نا چھپارے سجن
جدائی تیری سے جلا جان و دل | جلے کا جیانا جلارے سجن
کرم کر نزدکار کے واسطے | ترے عشق میں مرمکیاہے سجن
مرے خون کا کیا کروگے جواب | جو پوچھیگا تم کو خدا رے سجن
جدائی تری سے تو میں مرربا | مرے حال پہ کر دیا رے سجن
وفا ابتدا میں بھلا چھوڑنا | تجھے کس کہا سو بتارے سجن
سنبھالو محبت کا قول و اقرار | کرو یاد اپنا خدا رے سجن

کوئی دن تو رل بیٹھو خلدی کے ساتھ
نہیں جگ موں رہنا سدا رے سجن

(از بیاض مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار)

غلام قادر جلال پوریہ غلام تخلص

اس کا زمانہ معلوم نہیں۔ لیکن تیرہویں صدی کے نصف اول میں اسکو جگہ دی جاتی ہے۔ کلام میں فارسی ترکیبیں زیادہ غالب ہیں۔ غزل ذیل سراج دکنی کی مشہور غزل کے جواب میں لکھی ہے ؎

ترے رخ کی تاب جمال سے نہ قمر کی وہ قمری رہی
نہ چمن کی سیم بری رہی نہ چمن کی جلوہ گری رہی

کرے خوش خرامی کی طرز میں ترے سرو قد کی برابری
یہ ہوس اسی سے ہوا ہیں بھی بخیال کبک دری رہی

بجناب حضرت عشق جب لیا درس نسخہ صلح کل
نہ کسی سے جنگ و جدل رہا نہ کسی سے کینہ وری رہی

بخیال صافی جسم تو شدہ خواب مخمل و عبقری
گئی بادلے کی جھلک اطلس نہ ذرا بھی تاب زری رہی

بدے موج خیز فنا میں ہم بکمال شوق جب آشنا
اسی سیل جوش بلا میں بھی سبھی امن و فراغ دھری رہی

دل و دیں کیا ہے فدا میں سب ترے عشق میں یہ ضمنا بجاں
نہ رہا ہے کچھ بھی حق ادب جگری سو جاں سپری رہی

بحلاوت لب لعل تو کرے سبزہ دعوی ہمسری
بمراد دل تو سدا گرہ بمذاق نے شکری رہی

دیکھو معجزہ نہیں کیا ہے یہ ترے حسن و شان کے نمود
نہ کمال شان ملک رہا نہ مجال حسن پری رہی

کیا منزلوں سے جدا زیارہ وہ در کعبۂ عاشقی
یہ مراد خاطر عاشقاں اسی راہ میں سفری رہی

نگہ عنایت یار کی کروں کس زباں سے صفت بیاں
کہ کرم سے حال غلام پہ دو ہی عین خوش نظری رہی

(از بیاض مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار)

نثر نظم سے نسبتاً کمتر لکھی گئی ہے ۔ اور اس کے نمونے کمیاب ہیں ۔ میں یہاں ایک ایسے رسالہ کا ذکر کرتا ہوں جو غالباً بارہویں صدی کے اواخر میں لکھا گیا ہے ۔ یہ ایک فرس نامہ ہے جو دس فصلوں اور نبرہ ورق پر شامل ہے ۔ اس کا آخری ورق مفقود ہے ۔ کاتب کوئی غیر مسلم ہے جس نے بسم اللہ کے بجائے "ست گور پرشاد" لکھا ہے ۔ اس رسالہ میں فارسی و عربی کا استعمال کم دیکھا جاتا ہے مصنف حروف ظرف و اضافت کی صورت میں کبھی پنجابی اور کبھی اردو حروف لاتا ہے ۔ اسماء و افعال بھی بعض اوقات پنجابی ہیں ۔ اور اگرچہ رسالہ اردو میں لکھا گیا ہے ۔ لیکن ٹھیٹ پنجابی لہجہ میں ہے ۔ نمونہ :-

"پوتھی سلوتری کی بچھان ناں گھوڑیاں کا عیب صواب امر کا ذات کا روگ کا ۔ سو دس بھانت کا ہے :-

بھانت پہلی پیدا ہونے گھورے کے ۔ دوسری گھوئے کے سوا دنے کی

بھانت تیسری پچھان ناں سوکن اوگن کا۔ بھانت چوتھی پچھان ناں نحس کا بھانت پنجم پچھان ناں برساں کا۔ بھانت ششم گل (مول) لینیں گھورے کے۔ بھانت ستمی پچھان ناں ذات گھورے کی کا۔ بھانت آٹھمی پچھان ناں کھصیت (خاصیت) کا۔ بھانت نویں پچھان ناں روگ کا۔ بھانت دسمی کرنا علاج کا۔

بھانت پہلی پیدا ہونے گھورے کے:۔ اک برہمن تھا نام اس کا اسیت تھا۔ اکن پوتری تھا۔ اکن پوترسیں دھواگنس کے جوانکھیں میں پیدا تھا۔ تس تے آنسو جو چلتے تھے۔ داہنی جو انکھ تے آنسو چلتے تھے۔ تس تے گھورا ہوت بھیا۔ باویں انکھ تے جو آنسو چلتے تھے۔ تس تے گھوری ہوت بھئی۔ پوتر جو اس برہمن کا تھا۔ اس کا نام سالوتر تھا۔ تن پوتر بینے تو کھیا اک پوتھی گھوریاں کی گود جس تے گون اوگن اور روگ اور علاج جانیا جاے۔ تس نیں اہ پوتھی کری" اپنا ہیں نام رکھیا۔"
یہ عبارت بے ربط اور اکھڑی اکھڑی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف زبان پر عبور نہیں رکھتا۔

ہزار مسائل

رسالۂ ہزار مسائل فارسی کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ اور حفظ الرحمٰن صاحب
(حفظ العلیم) کی ملک ہے۔ اس کے مؤلف اور زمانۂ تالیف سے ہم بالکل بے
خبر ہیں۔ لیکن اس کی املا اور افعال و اضافت کی جمع مؤنث کو دیکھ کر جو
قدیم طرز میں ہے۔ ہمیں تیرہویں صدی ہجری کی ابتدائی ربع میں اس کا تعین
کرنا ہوگا۔ گمیاں بجائے گی۔ ہونگیاں بجائے ہونگی۔ چھپتیاں بجائے
چھپتیں۔ ہوتیاں بجائے ہوتیں۔ وغیرہ قدیم شکلیں ہیں جو ہیر امن کے بہت
جلد بعد متروک ہو چکی ہیں۔ نسخۂ ہذا ۱۲۸۸ھ مطابق سمت ۱۹۳۰ بکرمی مطابق
۱۸۷۲ء کا نوشتہ ہے۔ نمونہ:۔

جب کے نامۂ مبارک نزدیک عبداللہ ابن سلام کے پہونچا شرطیں تعظیم
کیاں بجا لیا کہ نامہ معظمہ کوں پڑا اور اپنی اور اپنی قوم کوں اکٹھی کر کے
مضمون نامہ مبارک کا سنایا کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
جو آخری زمانہ کے پیغمبر تھے۔ ایک نامہ پاس دکنام بھیجا۔ اور
دعوت اپنے دین کی گئی ہے۔ لازم ہے کہ ہم سب لوک ایمان

بناویں اور ان کی شریعت اور دین کی پیروی کریں۔ کوئی متفق ہو کر جواب
سناؤ۔ ان سب نے کہا کہ اے عبداللہ ابن سلام تم سب لوک علما ہمارے
سیں دانا تر ہیں۔ اور نبیوں کی حقیقت اور ماہیت پر بڑے واقف ہیں۔
تمہاری مرضی کے خلاف ہم نہیں کر سکتے جو تم فرماویں سب راضی ہیں۔ لیکن
یہ خیال ہم کوں آتا ہے کہ کیونکر اپنے دین کوں چھوڑیں اور ان کے دین کی
پیروی کریں۔ تب عبداللہ ابن سلام نے کہا کہ اے لوکو تم سب جانتے
ہو۔ کہ تم کو بھیں معلوم ہوگا کہ موسیٰ پیغمبر علیہ السلام نے خبر دیتی ہے
اور دوسرے پیغمبروں نے بھیں خبر دیئی ہے۔ اپنی اپنی قوم سیں کہتے
آئے ہیں۔ کہ ایک نبی آخر زمانہ میں نام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوگا
اور جب اس کا زمانہ آوے گا۔ ہم سب کا دین چھپ جاوے گا
اور اسی کا دین مشرف ہوگا۔ اور مشرق تا مغرب تک پھیل جاویگا
اور ہم سب کی کتاب اور شریعت منسوخ ہو جاوے گی۔ اور دوسرا
یہ ہے کہ جو چیزیں ہمارے دین میں حلال ہیں۔ اس کے دین میں
حرام ہونگیاں۔ اور جو چیزیں ہمارے دین میں حرام ہیں۔ اس کے دین
میں حلال ہونگیاں۔ توریت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور انجیل
میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام
اور دوسرے صحیفوں میں اور نبیوں نے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ ان

کتابوں کی پیروی کرنے والیوں کوں چاہے کہ اس پیغمبر کی شریعت میں داخل ہو کر ایمان لیاویں ۔ اور اپنے دل کوں شمع دین اس کی سیں روشن کریں ۔"